پتھر کا شیشہ
محی الدین نواب
Scanned by Khusroo, oneurdu.com
www.urdubooks4download.blogspot.com

محی الدین نواب

الرفاعی پبلشرز اینڈ بک سیلرز
چوک میو ہسپتال، نسبت روڈ، لاہور۔

پتھر کا شیشہ

ایسے انسان کی کہانی جو فطرت کا گداز کھو کر پتھر ہو چکا تھا۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ اس پتھر کے قلب سے آبِ شیریں کا ایک چشمہ پھوٹا، دھوپ سے تپتے صحرا پر ابر کا ٹکڑا سا سایہ فگن ہو گیا۔

جب لوگ کسی کی عزت و آبرو کا پیرہن چاک کر دیتے ہیں تو ان کا ضمیر ایک سسکی بھی نہیں لیتا لیکن جب کسی دوسرے کا ہاتھ ان کے گریبان تک پہنچتا ہے تو وہ اسے اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ صدیوں سے انسانی معاشرے میں یہی رسم جاری ہے۔

کھڑکی کھلی رہتی تھی مگر چلمن پڑی رہتی تھی۔ وہ چلمن پلاسٹک کی پتریوں سے بنی ہوئی تھی۔ ان پتریوں میں بڑی لچک تھی۔ اگر کوئی جھانکنے والی کسی ایک پتری پر ہلکا سا دباؤ ڈالتی تو اس کے ساتھ نیچے کی کئی پتریاں دبتی چلی جاتیں۔ پھر چلمن کے پیچھے سے آفتاب یا ماہتاب کا استعارہ طلوع ہو جاتا۔ "صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں" کے مصداق پردہ تو رہتا' پردے کا بھرم نہ رہتا۔

حاصل مراد چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔ چلمن کی طرف نظر گئی تو وہ دوسری طرف دیکھنا بھول گیا۔ اس پردہ نشین نے چند سیکنڈ کے لئے چلمن میں انتشار پیدا کیا تھا۔ دیدار کی راہ نکالی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس نے شاید دانستہ ایسا نہیں کیا ہو گا۔ ضرور کوئی بات ہو گی۔ شاید اپنے ماحول کی گھٹن سے پریشان ہو گئی ہو گی۔ تازہ ہوا کے لئے اس نے چلمن کو ذرا اِدھر اُدھر کیا ہو گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاصل مراد اِدھر کا رہا' نہ اُدھر کا۔ یہ بھول گیا کہ کہاں جانے والا تھا' کہاں سے آ رہا تھا' یہ بھی یاد نہ رہا۔

وہ نظر آ رہی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کدھر دیکھ رہی ہے۔ پردے کے پیچھے بھی پردہ تھا۔ یعنی اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ اس کی نگاہوں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھ رہا ہے۔ ایسے وقت سبھی دل والے خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حاصل مراد کا دل بھی دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔ میری طرف دیکھ رہی ہے اور میری ہی طرح کوئی اور نظارہ دیکھنا بھول گئی ہے۔

کسی نے اچانک حاصل مراد کی پیٹھ پر ایک دھپ جمائی۔ وہ جھنجلا کر پلٹ گیا۔ پیچھے ایک بزرگ کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ غصہ اور جھنجلاہٹ بھول گیا۔ فوراً ہی یاد آ گیا کہ ایک شریف زادی سے نظریں لڑاتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ بزرگ نے پوچھا۔

"میاں صاحبزادے! یہ کیا ہو رہا ہے۔ شرم نہیں آتی؟"

بڑے میاں کی آواز سنتے ہی چلمن میں ہلچل پیدا ہوئی۔ حاصل مراد نے ذرا گھوم کر

دیکھا تو پتریاں برابر ہو گئی تھیں' وہ چہرہ اس کے پیچھے گم ہو گیا تھا۔ آں' کیا نظارہ تھا۔ چاند نکلتے ہی بوڑھے بادل نے اسے چھپا دیا تھا۔

اس نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بڑے میاں کو دیکھا پھر کہا۔ "کوئی نگاہوں کے سامنے خود آ جائے تو ہم اپنی آنکھیں نہیں پھوڑ سکتے۔"

بڑے میاں نے کہا۔ "برخودار! ہمارے معاشرے میں عورت پردہ کرتی ہے' مرد پردے کو قائم رکھتا ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر کوئی سامنے آ جائے تو کم از کم نظریں تو جھکا سکتے ہو؟"

وہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ حاصل مراد تذبذب میں رہا۔ آگے بڑھ جائے یا وہیں ٹھہر جائے۔ اس نے چلمن کی طرف دیکھا۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ بڑے میاں کی بات دماغ میں چبھ رہی تھی۔ حجاب صرف عورت کے لئے لازمی نہیں ہے۔ لازم ہے کہ مرد بھی ایسے وقت نظریں جھکا لے یا منہ پھیر لے۔ بات اتنی معقول تھی کہ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔ جب بڑے میاں دور ایک گلی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ پھر چلمن کی طرف دیکھنے کے لئے کوئی جواز ڈھونڈنے لگا۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ اسے جس کام سے روکا جاتا ہے اسے کر گزرنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لیتا ہے۔

حاصل مراد نے اپنی سہولت کے لئے جواز پیش کرتے ہوئے سوچا۔ "یہ درست ہے۔ غیر عورتوں کو دیکھ کر منہ پھیر لینا چاہئے لیکن ان میں سے کوئی ایک ایسی ہوتی ہے جسے دیکھ کر نظریں جھکائی نہیں جا سکتیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایک عورت اپنے لئے ہوتی ہے۔ اگر بیوی کا رشتہ قائم ہونے سے پہلے اسے بھی دیکھنا ممنوع ہے تو بعض حالات میں اخلاقی تقاضے پورے نہیں کئے جا سکتے۔ اگر کئے جاتے تو سب سے پہلے شاعری مر جاتی۔ ہمارے ہاں میر اور غالب پیدا نہ ہوتے۔ عبدالرحمٰن چغتائی کی مصوری کا سرمایہ نہ ہوتا۔ ان عظیم ہستیوں کا کمال فن ثابت کرتا ہے کہ فنون لطیفہ سے اخلاقیات کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ یہاں حجاب کے سلسلے میں یہ بات بنتی ہے کہ بے شک پردے کا بھرم رکھا جائے۔ دیدار کا تقاضا نہ کیا جائے۔ اگر کیا جائے تو دید کا حوصلہ رکھا جائے۔ پردہ صرف نقاب سے یا چلمن سے نہیں ہوتا۔ حقیقتاً نیت کی ثابت قدمی سے ہوتا ہے۔"

وہ چلمن سے دور کھڑا انتظار کرتا رہا۔ اسے امید تھی کہ وہ حسین چہرہ ایک بار پھر نظر

آئے گا۔ وہ گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل رہا تھا۔ کوئی شبہ کرتا اور اس سے سوال کرتا تو وہ یہی جواب دیتا کہ کسی صاحب کا مکان تلاش کر رہا ہوں۔ ویسے وہ گلی ویران تھی' کوئی اِکا دُکا گزرنے والا اس پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔

دس منٹ کے بعد ہی اس کی آرزو پوری ہو گئی۔ چلمن میں پھر انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ وہ توجہ سے دیکھنے لگا۔ کبھی چلمن کی ایک پتری دب رہی تھی اور کبھی دوسری۔ اس کی ہلکی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ شاید وہ کمرے کی صفائی کرتے کرتے پھر کھڑکی تک آ گئی تھی۔ ہاتھ میں ایک جھاڑن لئے کبھی چلمن کی ایک پتری کو' کبھی دوسری پتری کو صاف کر رہی تھی۔

وہ اس کھڑکی کے سامنے تھا مگر کافی دور تھا۔ اِدھر اُدھر چور نظروں سے دیکھتا ہوا کسی مجرم کی طرح ڈرتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے کھڑکی کے قریب جانے لگا تاکہ جھلک صاف طور پر دکھائی دے لیکن قریب پہنچ کر بھی تشنگی باقی رہی۔ صورت پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ صفائی کے دوران کبھی ایک پتری' کبھی دوسری پتری دبتی تھی تو چلمن میں ذرا سا خلاء پیدا ہوتا تھا۔ چہرے کا کچھ حصہ نظر آتا تھا پھر جب تک اس حصے کو نظر بھر کر دیکھا جاتا' پتری ادھر سے برابر ہو جاتی تھی اور دوسری طرف سے ہلکا سا خلاء پیدا ہو جاتا تھا۔ کسی کوٹھی کے بام پر جلنے بجھنے والے اشتہاری حروف کی طرح' پہلے ایک ایک حرف روشن ہوتا ہے۔ ایک طرف سے وہ حروف روشن ہوتے جاتے ہیں' دوسری طرف سے بجھتے جاتے ہیں لیکن وہ اشتہار نہیں تھی۔ جلتے بجھتے حروف ایک لفظ مکمل کر کے ذہن میں نقش ہو جاتے تھے لیکن وہ ذرا ذرا سی نظر آنے والی' مکمل حروف نہیں بن پا رہی تھی۔ پھر اس کی مکمل تصویر ذہن میں کیسے نقش ہو سکتی تھی۔

اس نے مضطرب ہو کر گلا صاف کرنے کے بہانے ذرا سا کھنکارا۔ آواز سنتے ہی وہ چونک گئی۔ اس کا ہاتھ پتری پر تھا۔ دباؤ بڑھا تو کئی پتریاں دب گئیں۔ چہرہ پوری طرح واضح ہو گیا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف دیکھتے ہوئے شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ کوئی کھنکارنے والا ایک راہگیر کی طرح گزر گیا' یا وہاں موجود ہے۔ عجیب لڑکی تھی۔ آنکھیں رکھتے ہوئے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ دوسری طرف دیکھتے ہوئے کانوں سے سن کر کسی کی موجودگی کا احساس کرنا چاہتی تھی۔

ایسا تو اندھے کرتے ہیں۔ دیکھتے ایک طرف ہیں اور آہٹ کے ذریعے دوسری

طرف کسی کی موجودگی کو محسوس کرتے ہیں لیکن یہ سوچ کر ہی دل دکھتا ہے کہ اتنی حسین لڑکی اندھی ہو سکتی ہے۔ اس نے شاید کھنکارنے کی آواز سن کر نظریں پھیر لی تھیں۔
حاصل مراد نے ایک سرد آہ بھر کر کہا

خود فریبی ہی سہی' کیا کیجئے دل کا علاج
تُو نظر پھیرے تو ہم سمجھیں کہ پہچانا نہیں
جی میں جو آتی ہے کر گزرو' کہیں ایسا نہ ہو
کل پشیماں ہوں کہ کیوں دل کا کہا مانا نہیں

اس دوران ہی چلمن برابر ہو گئی تھی۔ وہ رُوپوش ہو گئی تھی لیکن حاصل مراد کا دل کہتا تھا کہ پردہ نشین' پردہ تو کرتے ہیں مگر پردے کے پیچھے موجود رہتے ہیں۔ لہٰذا اس نے دل کی بات اشعار میں کہہ دی تھی کہنے کے بعد جواب کا انتظار رہتا ہے۔ اُدھر سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ بڑی دیر تک گہری خاموشی رہی تھی۔ پھر کمرے کے اندر کچھ آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیز اُدھر سے اِدھر ہٹائی گئی ہو یا صفائی کے دوران کچھ گر پڑا ہو۔ اب پتا نہیں' اس گھر میں کون لوگ رہتے تھے اور وہ کس قسم کے لوگ تھے۔ اگر وہ ایک آدھ شعر اور پڑھتا اور کسی کو خبر ہو جاتی یا لڑکی اعتراض کرتی' اس کی مخالفت میں کچھ کہتی تو محلے والے اسے وہاں سے صحیح سلامت جانے کا موقع نہ دیتے۔

وہ بڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ پھر یہ سوچ کر وہاں سے چلا آیا کہ ابھی ابتداء ہے۔ وہ دوبارہ سامنے آ چکی ہے۔ بار بار آتے ہوئے ہچکچائے گی۔ لڑکیاں یوں بھی دو گھڑی کی ملاقات میں نہیں کھلتیں۔ ایک گتھی کی طرح آہستہ آہستہ سلجھتی جاتی ہیں بلکہ کبھی کبھی عمر گزر جاتی ہے اور گتھی نہیں سلجھتی۔

وہ اسی محلے کے ایک ریستوران میں آیا۔ دراصل اس نے اپنے ایک جگری دوست کو وہاں ملاقات کا وقت دیا تھا۔ دوست نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں چار بجے سے انتظار کر رہا ہوں اور اب پانچ بج چکے ہیں۔ اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

وہ بیٹھتے ہوئے' ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "بس کچھ نہ پوچھو۔ دیر کیا لگائی ہے' دل کہیں لگا دیا ہے۔"

"بات کیا ہے؟ کچھ عاشق مزاج نظر آ رہے ہو۔"

"ہاں' ایک صورت نظر آ گئی ہے۔ وہاں سے آ رہا ہوں تو مجھے راستے میں کچھ نظر

نہیں آیا۔ بس وہی صورت دیکھتا یہاں تک چلا آیا ہوں۔"

"یار! جانے بھی دو۔ تم جسے دیکھتے ہو اسے ہی حور پری کہنے لگتے ہو اور شعر پڑھنے لگتے ہو۔"

"قسم ہے وہ اے ون ہے۔ ایسا حسن ہر کسی کو نظر نہیں آتا۔ مقدر کا ستارہ چمکتا ہے تو ایسے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔"

اس نے چائے کا آرڈر دیا۔ پھر بیرے کے جانے کے بعد کہا۔ "مگر بڑی دیر سے دال گلے گی۔"

"کیوں؟"

"وہ پردہ نشین ہے۔ میں کھڑکی کے سامنے گھنٹہ بھر تک ٹہلتا رہا۔ صرف دو بار دکھائی دی۔"

"کہاں رہتی ہے؟"

"یہیں دو گلی پیچھے ایک سبز رنگ کا مکان ہے۔ اس کی کھڑکی پر پلاسٹک کی چلمن پڑی رہتی ہے۔ وہی چلمن میری دشمن ہے۔ اسے چھپائے رکھتی ہے۔"

حاصل مراد جس کرسی پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے والی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص بیٹھا اپنی میز پر چائے پی رہا تھا اور ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی۔ پھر وہاں سے اٹھ کر ان کی میز پر آ گیا۔ ایک خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میاں صاحبزادے! کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟"

حاصل مراد نے پوچھا۔ "آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہیں کس حیثیت سے کر رہے ہیں مقصد کیا ہے؟"

"میں اور بھی سوالات کروں گا۔ پہلے تمہارے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ پھر تمہارے گھر والوں کے بارے میں پوچھوں گا۔ یقیناً تمہارے گھر میں مائیں بہنیں ضرور ہوں گی۔ اگر کوئی اسی طرح ہوٹل میں بیٹھ کر تمہاری بہن کے متعلق گفتگو کرے تو تم پر کیا گزرے گی؟"

حاصل مراد نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے غصے سے کہا۔ "کس کی مجال ہے کہ میری بہن کا نام بھی اپنی زبان پر لائے' اس سے پہلے میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔"

اس ادھیڑ عمر کے شخص نے کہا۔ "میں تمہارے مقابلے میں بوڑھا ہوں' کمزور ہوں'

میں تمہاری زبان نہیں کھینچ سکتا۔ بتاؤ' میں کیا کروں؟ کیا بے غیرت بن کر اس ہوٹل میں تمہاری زبان سے اپنی بیٹی کا ذکر سنتا رہوں؟"

یہ بات سنتے ہی وہ دونوں چونک گئے۔ حاصل مراد اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ سر جھکا لیا۔ بڑے میاں نے کہا۔ "دیکھو' دنیا کا ہر شخص تمہاری طرح شہ زور نہیں ہوتا مگر وہ بہن بیٹی والا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے گھر والوں کو پردے میں رکھ سکتا ہے لیکن پردے کے آر پار دیکھنے والوں کی آنکھیں نہیں پھوڑ سکتا۔ کوئی ایسا وقت آ جائے تو وہ عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے کہ شرافت کا تقاضا پورا کرو۔ چادر اور چاردیواری کے تقدس کو پامال کرنے کے بجائے سیدھی طرح رشتہ مانگنے آؤ۔ اگر مناسب سمجھا گیا تو رشتہ ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا۔ وہ وہاں سے جانا چاہتا تھا مگر کوئی بات اسے روک رہی تھی۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ تذبذب میں مبتلا تھا۔ پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "تم سوچ رہے ہو گے کہ میں اپنی بیٹی کا رشتہ مانگنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ یہ بھی ایک طرح کی بے غیرتی ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے' ایک اچھی بیٹی بھی ہے لیکن وہ آنکھوں سے محروم ہے۔ اگر ایک اندھی کو اپنا سکتے ہو تو کھڑکی کے راستے نہیں' دروازے کے راستے آؤ ورنہ کسی کی عزت پر یوں سرعام کیچڑ نہ اچھالو۔"

یہ کہتے ہی وہ فوراً پلٹ کر چلا گیا۔ وہ دونوں میز پر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ بیرا چائے لے کر آ گیا۔ ان کے سامنے دو پیالیاں رکھ دیں پھر چلا گیا۔ حاصل مراد کے دماغ میں ایک بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ اندھی ہے۔

اس کے دوست نے پوچھا۔ "کیا خیال ہے' تم تو کہہ رہے تھے اے ون ہے اور ایسا حسن ہر کسی کو نظر نہیں آتا۔ تمہارے بیان کے مطابق مقدر کا ستارہ چمک رہا ہے۔ اب تو لڑکی کے باپ نے آفر دے دی ہے۔"

اس نے ناگواری سے کہا "نان سنس' کسی اندھی کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔"

"لیکن ایک عیب سے کیا ہوتا ہے جبکہ وہ نظر نہیں آتا۔ تم نے اسے دیکھا' تم بھی اندھی نہ سمجھ سکے۔"

"اب تو سمجھ گیا ہوں۔ کوئی آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگلتا۔ فرض کر لو کہ میں اس

کے حسن سے متاثر ہو کر شادی کر لوں تو میری زندگی کیسے گزرے گی۔ وہ میری کیا خدمت کرے گی؟ کیا میرے لئے کھانا پکا سکے گی؟ میرے کپڑے استری کر سکے گی؟ میرا گھر سنبھال سکے گی؟ شادی اور عشق میں بڑا فرق ہے۔ شادی گھر گرہستی کے لئے کی جاتی ہے اور عشق محض تفریح طبع کے لئے۔"

"یعنی تم اس اندھی سے عشق کرتے رہو گے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "کیا خاک عشق کروں گا۔ میں اسے دیکھوں گا' وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گی۔ میں اسے آواز دوں گا' وہ کان میری طرف کرے گی۔ آنکھیں دوسری طرف رہیں گی اور نہ ہی میرے خطوط کے جواب دے سکے گی۔"

"تو پھر اسے اپنی فہرست سے خارج کر دو۔"

"یہی تو ہو نہیں سکتا۔ میں سوچ رہا ہوں' یہ ایک نیا تجربہ ہو گا کہ ایک اندھی کو کس طرح محبت میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ میں کوشش کروں گا۔"

"چھوڑو یار! اپنے کاروبار کے متعلق بتاؤ۔ کیسا چل رہا ہے؟"

"فرسٹ کلاس۔ تم تو جانتے ہو میں نے صرف ایک وی۔ سی آر سے کاروبار شروع کیا تھا۔ آج میرے پاس پانچ ہیں اور وہ کبھی خالی نہیں رہتے۔ ہر وقت ان کی بکنگ ایڈوانس رہتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ بنک بیلنس بڑھتا جا رہا ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ "ہاں یار! مجھے اپنی بہن کی فکر ہے۔ جب میں اس کی بھولی بھالی صورت دیکھتا ہوں اور اس کی بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں بہن کا پیار امڈتا ہوا نظر آتا ہے تو دل چاہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کماؤں۔ اپنی بہن کو اتنا جہیز دوں' اتنی دھوم دھام سے شادی کروں کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر سسرال میں راج کرتی رہے۔"

اس کا دوست خاموش بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ یہ اپنی بہن کے لئے کیسے سہانے خواب دیکھ رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک باپ نے بھی اپنی بیٹی کے سلسلے میں ایک خواب بیان کیا تھا۔

حاصل مراد اس خواب کی تعبیر ایک باپ سے نہیں' اس کی بیٹی سے چاہتا تھا۔ لہٰذا دوسرے دن پھر اس چلمن کے قریب پہنچ گیا۔ اس بار وہ صبح سویرے وہاں پہنچا۔ گلی میں

بالکل سناٹا تھا۔ ابھی صبح کا اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا وہ بڑے اچھے موقع پر وہاں پہنچا تھا کیونکہ وہ اندھی حسینہ صبح سویرے بیدار ہونے کی عادی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کھڑکی پر ہولے سے دستک دے۔ ایسے وقت کھڑکی کے پٹ خود بخود کھلنے لگے۔ اندھی پوری طرح نظر آئی۔ وہ کھڑکی کھولنے کے بعد اوپر کی طرف اٹھی ہوئی چلمن کو نیچے گرانا چاہتی تھی۔ اتنی دیر میں حاصل مراد نے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین تھی۔ اس میں کوئی کمی نہ تھی۔ صرف اس کی آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ سفیدی نظر آرہی تھی جس کی وجہ سے حسن میں ذرا عیب ہو گیا تھا چونکہ وہ منہ اندھیرے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی تھی' اس لئے سوچا ہو گا کہ کوئی اسے دیکھنے والا نہیں ہے ورنہ وہ سیاہ چشمہ لگا کر آتی۔ جب وہ چلمن درست کرنے لگی تو حاصل مراد نے ہولے سے کہا۔ "میں تمام رات یہاں تمہارا انتظار کرتا رہا۔"

آواز سنتے ہی وہ چونک گئی۔ آنکھیں پھاڑ کر پہلے تو خلا میں دیکھا پھر جلدی سے دونوں ہاتھوں کو آنکھوں پر رکھ کر دوسری طرف گھوم گئی۔ عورت اندھی ہو یا آنکھوں والی' وہ اپنا عیب دیکھنے والوں کی نظروں سے فوراً چھپانا چاہتی ہے۔ اب وہ کشمکش میں تھی کہ پلٹ کر چلمن کو نیچے تک لائے یا سیاہ چشمہ لگائے۔ چلمن درست کرتے وقت پھر آنکھیں نظر آتیں' اس لئے وہ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ایک الماری کے پاس پہنچ گئی۔ اس کی اوپری دراز کو کھولا۔ پھر اس میں سے سیاہ چشمہ نکال کر اپنی آنکھوں پر لگا لیا۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ سر پر یوں پھیرنے لگی جیسے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھوں سے کنگھی کر رہی ہو۔ وہ آئینہ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن دوسروں کی نظر میں آئینے کی طرح صاف اور بے داغ نظر آنا چاہتی تھی۔

پھر اس نے وہاں سے پلٹ کر اندازے سے کھڑکی کی جانب دیکھا۔ الماری کے پاس سے ہٹ کر دیوار کا سہارا لیتے ہوئے چلمن کی طرف آتے ہوئے کہنے لگی۔ "آپ کون ہیں؟ کل بھی میں نے آپ کی آواز سنی تھی' آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟ ابو جاگ جائیں یا محلے والوں نے دیکھ لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"

حاصل مراد نے کہا۔ "تمہاری عزت' میری عزت ہے۔ میں کوئی چھچھورا لڑکا نہیں ہوں۔ ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں............ صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک کیسٹ رکھا ہوا ہے۔ میں نے اپنے دل کی کچھ باتیں بیان کی ہیں' سننا پسند کرو تو سن

لینا اور جواب ضرور دینا۔ ابھی کیسٹ میں نے جہاں رکھا ہے' کل صبح اسی وقت آکر تمہارا جوابی کیسٹ یہاں سے اٹھا لوں گا۔ اگر میری بات ناگوار گزرے تو اسے کھڑکی سے باہر پھینک دینا۔ اب میں جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ زمین پر دو چار بھاری قدم رکھتے ہوئے ذرا دور ہو گیا تاکہ اندھی سمجھ لے' وہ چلا گیا ہے لیکن وہ رک گیا تھا۔ پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگی ہوئی تھی۔ کان لگا کر باہر کی آوازیں سننا چاہتی تھی یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ جا چکا ہے۔ پھر اس کے چہرے سے ہچکچاہٹ ظاہر ہونے لگی جیسے وہ کیسٹ کو اٹھاتے ہوئے جھجک رہی ہو لیکن یہ بھی سوچ رہی ہو کہ اسے وہاں سے نہ اٹھایا گیا تو وہ کسی دوسرے کے ہاتھ لگ جائے گا۔

ذرا دیر بعد ہی وہ کھڑکی کی نچلی چوکھٹ کو ایک ہاتھ سے ٹٹولنے لگی۔ کیسٹ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس نے فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچ کر چلمن گرا دی۔ کیسٹ اس کے ہاتھ کے ساتھ چلمن کے پیچھے جا چکا تھا۔ حاصل مراد نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے چلمن کو دیکھا پھر وہاں سے چلا گیا۔

وہ چلمن کے پیچھے ہاتھ میں کیسٹ لئے دیر تک کھڑی رہی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آج تک اس نے کبھی کسی غیر مرد سے کوئی چیز قبول نہیں کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کسی کا پیغام وصول کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ آنکھ کی بینائی جانے کے بعد وہ مایوس ہو گئی تھی۔ یہ سمجھنے لگی تھی کہ اس کا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔ کوئی اسے پسند نہیں کرے گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اچانک کوئی اس کھڑکی کے سامنے آکر محبت بھرے اشعار سنائے گا اور پھر دوسرے ہی دن کیسٹ کے ذریعے حالِ دل بیان کرے گا۔

اس نے کھڑکی سے ہٹ کر آگے بڑھتے ہوئے دروازے کو ٹٹول کر دیکھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ وہ سونے سے پہلے خود ہی اندر سے بند کر دیا کرتی تھی۔ پھر بھی احتیاطاً دیکھ لیا۔ جب اطمینان ہو گیا تو وہ کیسٹ ریکارڈر کے پاس آئی۔ اسے معلوم تھا' کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ وہ صرف اپنے کمرے میں نہیں بلکہ پورے مکان میں کسی سہارے کے بغیر آتی جاتی تھی۔ اسے یاد رہتا تھا' کتنے قدم چلنے کے بعد کون سا کمرہ آتا ہے۔ اس نے کیسٹ کو ریکارڈر میں لگایا۔ اسے آن کرنے سے پہلے ایئر فون کو اس ریکارڈر سے منسلک کیا۔ پھر اپنے کان سے لگایا تاکہ ریکارڈر کی آواز باہر نہ جائے صرف وہ سنتی رہے پھر اس

نے اس کے بٹن کو دبایا۔ ذرا دیر خاموشی رہی۔ دل دھڑکتا رہا۔ پھر دل میں شہنائی بجانے والی مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا نام حاصل مراد ہے لیکن میری مراد کا حاصل تم ہو۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ نام جو بھی ہو گا' وہ تمہارے سراپا حسن پر کھلے گا کیونکہ چاند کو اگر چاند نہ کہا جاتا تب بھی وہ روشن اور خوبصورت ہوتا۔ لفظ 'چاند' تو محض چند حرفوں کا مجموعہ ہے جو حسن ماہتابی کے باعث خوبصورتی کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

کل میں نے یہاں سے گزرتے ہوئے تمہیں دیکھا اور آج میں تمہیں حال دل سنانے پر مجبور ہو گیا۔ میری اس جرأت سے اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں کتنے خلوص سے تمہاری چاہت کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں' تم بینائی سے محروم ہو لیکن یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ سنا ہے آئی بنک سے رابطہ رکھا جائے اور وہاں نام درج کرایا جائے تو سال دو سال میں کہیں نہ کہیں سے آنکھوں کا عطیہ مل جاتا ہے۔ تمہاری آنکھوں کی روشنی واپس آ سکتی ہے۔

میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں بڑے بڑے ماہر چشم کے پاس لے جاتا لیکن کس رشتے سے لے جا سکتا ہوں؟ یہ کام تو تمہارے والدین ہی کر سکتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں آج ہی تمہارے لئے پیغام دوں لیکن اپنی بہن کی وجہ سے مجبور ہوں' پہلے اسے سہاگن بنا کر گھر سے رخصت کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے میں اپنی شادی کی بات کروں گا تو دنیا والے باتیں بنائیں گے۔

ویسے میں جلدی تمہارے والد سے ملنے والا ہوں۔ ابھی شادی نہ کروں' یہ الگ بات ہے لیکن رشتے کی بات تو کر سکتا ہوں تاکہ تمہارے دل میں بھی میری طرف سے اطمینان ہو اور تم مجھ پر اعتماد کرنے لگو۔

لیکن میں صرف اپنی ہی باتیں کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ باتیں تمہارے مزاج پر گراں گزریں۔ کیونکہ میں محبت کو کھیل نہیں سمجھتا۔ لہٰذا دو ٹوک باتیں کر رہا ہوں اور تم سے بھی یہی توقع کرتا ہوں۔ تم اسی کیسٹ کے دوسری طرف جواب ریکارڈ کر سکتی ہو۔ اگر مجھے اپنے قابل نہ سمجھو تو کیسٹ کو یونہی خالی چھوڑ دینا۔ میں کل صبح سویرے اسی کھڑکی سے وہ کیسٹ اٹھا کر لے جاؤں گا۔

آواز کے ذریعے یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ جواب

میں تمہاری صدا سنائی دے گی تو دل میں مچلنے والی بہت سی باتیں سناؤں گا۔ اس وقت تک کے لئے اجازت دو۔ خدا حافظ۔ تمہارا "حاصل مراد۔"

ریکارڈر خاموش ہو گیا۔ وہ اپنے ایک کان میں ایئر فون لگائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس کے دماغ میں حاصل مراد کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ریکارڈر تھوڑی دیر تک خاموشی سے چلتا رہا۔ پھر اس نے اسے آف کیا۔ دوسرا بٹن دبا کر ریوائنڈ کرنے لگی۔ اپنی بے نور آنکھوں کے سامنے تصور میں اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ وہ کیسا ہو گا؟ وہ ایسا ہو گا' وہ ویسا ہو گا۔ اس کا نام سنتے ہی وہ پہلے تو چونک گئی تھی اسے یاد آ گیا تھا کہ اس کی سہیلی عطیہ کے بھائی کا نام حاصل مراد ہے۔ شاید یہ وہی ہو گا۔ بہت عرصہ پہلے اس نے حاصل مراد کو اپنی بہن عطیہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اب اس کا چہرہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے اس کے تصور میں وہ چہرہ بن بن کر بگڑ رہا تھا۔

اس نے دوسری بار ریکارڈر کو آن کر کے اس کی باتیں سنیں پھر تیسری بار سنیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ تمام دن ریکارڈر کے سامنے بیٹھی رہے اور وہ باتیں سنتی رہے' لیکن باورچی خانے سے اس کی امی نے آواز دی تھی۔ "بیٹی! اب اٹھ بھی جاؤ آج اتنی دیر تک کیوں سو رہی ہو؟"

اس نے کیسٹ کو چھپا دیا۔ ریکارڈر کو اس کی جگہ رکھ دیا۔ اس کے بعد دروازہ کھول کر راستہ ٹٹولتی ہوئی اپنی امی کے پاس چلی گئی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ تمام دن سوچتی رہی۔ جواب میں کیا کہنا چاہئے اور جب کچھ کہنے کی باتیں یاد آتی تھیں تو جی چاہتا تھا کہ فوراً وہ باتیں ریکارڈ کرنے بیٹھ جائے لیکن یہ آسان نہیں تھا۔ اس نے حاصل مراد کی آواز ایئر فون کے ذریعے چپ چاپ سن لی تھی لیکن اپنی آواز ریکارڈ کرتے وقت اسے بولنا پڑتا اور وہ اپنے کمرے میں بولتی تو اس کے والدین کو تجسس ہوتا کہ لڑکی تنہائی میں کیا بڑبڑا رہی ہے؟

وہ دن بڑی مشکل سے گزرا۔ رات آئی تو والدین کے سونے کا انتظار کرتی رہی۔ اندازے سے آدھی رات کے بعد اٹھ بیٹھی۔ دوسرے کمرے سے باپ کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ پھر لیٹ گئی۔ کروٹ پر کروٹ بدلنے لگی۔ گھڑی نے رات کے دو بجائے۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔ باہر گلی میں کتے بھی نہیں بھونک رہے تھے۔ اس کے والد بھی گہری نیند سو گئے تھے۔ کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ

گئی۔ دیوار میں جہاں سوئچ بورڈ لگا ہوا تھا وہیں فرش پر اس نے پہلے ہی ریکارڈر کو رکھ دیا تھا۔ وہ بستر پر سے لحاف اٹھا کر ریکارڈر کے پاس آ گئی۔ فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے لحاف کو اپنے اور ریکارڈر کے اوپر ڈال لیا۔ چاروں طرف سے خود کو ساؤنڈ پروف بنا لیا تھا۔ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" شاید اسی کو کہتے ہیں۔

اس نے ریکارڈر کو آن کیا۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی۔ "شروع کرتی ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو عزت دار گھرانوں کی عزت رکھنے والا ہے۔ میں اپنے گھرانے کی عزت ہوں۔ میں نے کبھی کسی غیر مرد سے بات نہیں کی۔ اگر غیر مردوں سے بات کرنا جرم ہے تو زندگی میں پہلی بار مجھ سے یہ جرم سرزد ہو رہا اور اگر بات سے بات بنتی ہے، بگڑتی نہیں تو میں یہ بات بنانے کا حوصلہ کر رہی ہوں۔ میرے حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میرے والدین مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں لیکن وہ میرے مستقبل سے مایوس ہیں۔ انہوں نے آئی بنک سے رابطہ قائم کر رکھا ہے، میرا نام وہاں درج کرایا گیا ہے۔ اس کے باوجود میں امی اور ابو کی باتوں سے یوں محسوس کرتی ہوں کہ وہ مایوس ہیں جیسے میری آنکھوں کی روشنی واپس نہیں آئے گی اور نہیں آئے گی تو کہیں سے میرا رشتہ بھی نہیں آئے گا۔

میں کیا کروں؟ میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے میں کسی کی شریکِ حیات بن کر گھر گرہستی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل نہیں ہوں۔ پھر میں کس کام کی ہوں؟

سچ پوچھئے تو اپنے والدین کی طرح میں بھی اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکی تھی۔ اچانک آپ کی آواز سن کر یوں لگا جیسے آسمان سے میری دعاؤں کا جواب آ گیا ہے۔ میں نے اس کیسٹ کو بار بار ریوائنڈ کیا، بار بار آپ کی باتیں سنتی رہی اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی کہ آپ کی باتوں میں کہیں کوئی کھوٹ چھپا ہوا تو نہیں ہے۔ اگر آدمی فریب دینا چاہے تو اس کی باتوں کے دوران اس کے منہ سے نکلے ہوئے کسی بھی لفظ سے چھپی ہوئی بدنیتی کا اشارہ مل جاتا ہے۔

آپ میری باتوں کا برا نہ مانیں۔ میں دیکھ نہیں سکتی۔ دیکھ کر کسی کو پرکھ نہیں سکتی۔ صرف باتیں سن کر کسی کی شخصیت کے متعلق اندازہ کر سکتی ہوں اور میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ کی باتوں میں کھوٹ نہیں ہے۔ آپ نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے۔ پھر آپ پر اعتماد کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ میری سہیلی عطیہ کے بھائی کا نام بھی حاصل مراد ہے۔ میں سمجھتی ہوں شاید آپ وہی ہیں۔ آپ ہی کی بہن کا نام عطیہ ہو گا۔ ہم دونوں آٹھویں

جماعت تک ساتھ پڑھتی رہیں۔ پھر میری آنکھیں خراب ہونے لگیں۔ یوں تو بچپن ہی سے میری آنکھیں کمزور تھیں۔ پھر اور کمزور ہو گئیں۔ حتیٰ کہ میں نویں جماعت تک نہ جا سکی۔ رفتہ رفتہ میری آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی۔

بہر حال عطیہ بہت ہی محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ جب سے میں اندھی ہو کر گھر بیٹھی ہوں وہ کئی بار میرے پاس آ چکی ہے۔ مجھے حوصلہ دیتی ہے اور کہتی ہے۔ اگر کبھی کسی وقت اس کی ضرورت پڑے تو وہ ہر طرح میرے کام آنے کے لئے تیار ہے۔ میں سوچتی ہوں جب بہن اس قدر محبت کرنے والی ہے تو اس کا بھائی بھی کس طرح خلوص دل سے محبت کرنے والا ہو گا۔ میں آپ پر اعتماد کرتی ہوں اور التجا کرتی ہوں کہ آپ ابو سے بات کر لیں۔ بات طے ہو جائے گی تو مجھے بدنامی کا خوف نہیں رہے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری کسی نادانی سے میرے والدین کی عزت پر حرف آئے۔

مراد صاحب! اپنی اس اندھی دنیا میں مجھے خدا کے بعد آپ پر بھروسہ ہے۔ ہو سکتا ہے میری آنکھوں کو کبھی روشنی نہ ملے۔ میری زندگی کے آخری سرے تک پھیلی ہوئی تاریکی میں آپ مجھے جہاں لے جائیں گے، میں وہاں چلوں گی۔ اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ اب اجازت دیجئے۔ فقط "عطیہ کی سہیلی شبانہ۔"

ریکارڈ کرتے ہی اس نے بٹن کو آف کیا۔ پھر جلدی سے لحاف کو اپنے اوپر سے ہٹا دیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ وہ پسینے میں نہا گئی تھی۔ کھڑکی دروازے بند تھے۔ گرمی کی شدت سے دم گھٹا جا رہا تھا۔ بے چاری اندھی تھی۔ مجبور تھی۔ اتنی دیر تک دوزخ میں بیٹھ کر جنت کے خواب ریکارڈ کرتی رہی تھی۔

☆======☆======☆
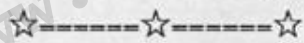
حاصل مراد پردہ نشینوں کی دنیا میں رہتا تھا۔ پردے کا تقاضا ہے کہ کوئی مرد کسی دوسرے کے گھر میں قدم نہ رکھے۔ کسی ضرورت سے جانا بھی ہو تو پہلے عورتوں کو پردہ کرایا جائے۔ یہ ایک عام سی بات ہے لیکن جس گھر میں وی سی آر کی بکنگ ہوا کرتی تھی وہاں حاصل مراد کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کبھی کوئی کیسٹ خراب ہو جاتا تھا۔ کبھی وی سی آر میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا تھا، یہ خرابیاں وہی دور کر سکتا تھا۔ جس طرح عورتیں دھوبی سے اور سبزی، دودھ والے سے پردہ نہیں کرتی ہیں اسی طرح فلمیں دیکھنے والیاں، حاصل مراد سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔

بھارتی فلموں میں ایسے مناظر بھی ہوتے ہیں جنہیں ماں بیٹی ایک ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتیں۔ کجا یہ کہ وی سی آر کی خرابی دور کرنے کے دوران حاصل مراد ایسے ہی کسی منظر کو بار بار اسکرین پر چلا کر دیکھتا تھا۔ لڑکیاں منہ چھپا کر ذرا مسکراتی تھیں' ذرا شرماتی تھیں۔ کن انکھیوں سے اپنی سہیلیوں اور رشتے داروں کو دیکھتی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں حاصل مراد سے بھی نظریں ٹکراتی رہتی تھیں۔ کسی سے صرف نظریں ملتی تھیں' کسی سے دل بھی مل جاتے تھے۔

وہ دوستوں میں بیٹھ کر فخریہ یہ باتیں بیان کرتا۔ پردے دار گھرانوں کو بے پردہ کرتا۔

وہ رات کو بستر پر لیٹ کر سوچ رہا تھا۔ اگر وہ اندھی اس کے فریب میں آجائے تو نیا ریکارڈ قائم ہو گا۔ وہ دوستوں میں بیٹھ کر اور زیادہ فخر سے کہہ سکے گا۔ "ارے آنکھ والوں کی کیا باتیں کرتے ہو' اندھی لڑکیاں بھی میری آواز سن کر مرمٹتی ہیں۔"

اس رات وہ تین بجے بیدار ہو گیا۔ اندھی کا مکان دوسرے علاقے میں تھا۔ وہاں تک جانے میں وقت لگتا۔ پولیس والوں کا ڈر نہیں تھا۔ آس پاس کے علاقے کے تمام پولیس والے اسے اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ وی سی آر کے سلسلے میں راتوں کو ایک گھر سے دوسرے گھر جایا کرتا ہے۔

وہ بیدار ہوتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اندھی نے ضرور جواب ریکارڈ کیا ہو گا۔ وہاں جاتے ہی کھڑکی کی چوکھٹ پر وہ کیسٹ مل جائے گا۔

وہ وہاں سے اٹھ کر دروازے کو آہستگی سے کھولتے ہوئے باہر آنگن میں آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر والوں کی آنکھ کھلے۔ وہاں اس کی ایک بہن اور ماموں' ممانی رہتے تھے۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماموں نکمے تھے اس لئے بھانجے کی کمائی پر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے بھی ماموں ممانی کو اس لئے گھر میں رکھ چھوڑا تھا کہ گھر میں جوان بہن تھی۔ بزرگوں کی موجودگی سے اطمینان رہتا تھا۔

اس کے کمرے کے ساتھ والا کمرہ بہن کا تھا۔ اس کے روشن دان سے روشنی جھلک رہی تھی۔ حاصل مراد نے حیران ہو کر اپنی گھڑی دیکھی۔ تین بجکر دس منٹ ہوئے تھے۔ عطیہ سونے سے پہلے بتی بجھا دیا کرتی تھی' اندھیرے میں سونے کی عادی تھی لیکن اس وقت کمرے میں روشنی کیوں تھی؟

وہ کچھ حیران ہو کر' کچھ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ پھر دبے قدموں چلتا ہوا اس کمرے

کے سامنے پہنچا۔ کھڑکی اور دروازے بند تھے۔ اتنی گرمی میں بھلا کھڑکی کیوں بند تھی۔ جبکہ وہ باہر کی طرف نہیں کھلتی تھی۔ آنگن کی طرف کھڑکی کو کھولا جا سکتا تھا۔

یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ عطیہ سونے سے پہلے لائٹ آف کرنا بھول گئی ہو گی لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آنگن کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند کیوں ہے؟

بہن کے کمرے میں جھانکنا معیوب سی بات ہوتی ہے لیکن دل میں شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ کرسی پر کھڑے ہو کر روشندان کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اندر کمرہ روشن تھا۔ سامنے والی دیوار سے ایک بڑی سی میز لگی ہوئی تھی جس پر درسی کتابیں اور کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ عطیہ کرسی پر بیٹھی ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ شاید لکھنے کا کام ختم ہو چکا تھا کیونکہ وہ اس کاغذ کو اٹھا کر پڑھ رہی تھی۔ پڑھنے کے دوران کبھی کبھی مسکرانے بھی لگتی تھی۔ پھر اس نے اس کاغذ کو تہہ کرنے کے بعد پلاسٹک کے نیچے چھپا دیا۔

ایک چور دوسرے چور کو فوراً ہی تاڑ لیتا ہے۔ حاصل مراد سمجھ گیا۔ اگر وہ اسکول کا کوئی سبق لکھتی تو اسے یوں تہہ کر کے پلاسٹک کے نیچے نہ چھپاتی۔ وہ کرسی سے اتر گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ یقیناً عطیہ چونک گئی ہو گی۔ چوری محبت کے زیرِ اثر ہو تب بھی چور چونک پڑتا ہے گھبرا جاتا ہے۔ حاصل مراد نے ہولے سے آواز دی۔ "عطیہ تمہارے کمرے میں روشنی کیوں ہے؟"

ایک ذرا دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "بھائی جان! میں لائٹ آف کرنا بھول گئی تھی۔"

"دروازہ کھولو۔ میں کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

دروازہ کھلنے میں ذرا دیر ہوئی مگر وہ کھل گیا۔ عطیہ کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپا رہی ہے۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "تم نے کھڑکی کیوں بند رکھی ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "بس یونہی' پنکھے کی ہوا کافی ہے۔"

وہ میز کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے پلاسٹک کو اٹھا کر نیچے ہاتھ ڈالا۔ اسی وقت عطیہ دوڑتی ہوئی آ گئی۔ بھائی جان کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ پھر عاجزی سے التجا کرنے لگی۔ "نہیں بھائی جان' نہیں۔"

اس نے اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ پھر اس تہہ کئے ہوئے کاغذ کو کھول کر پڑھنے لگا۔ عطیہ نے پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ "پلیز بھائی جان! یہ بالکل نامناسب ہے ہم تعلیم یافتہ ہیں ہمیں یہ زیب نہیں دیتا............"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی حاصل مراد نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ تھپڑ کھا کر کرسی پر اس طرح گری کہ دھپ سے بیٹھ گئی۔ بھائی نے اس کی تھوڑی کے نیچے ہاتھ لے جا کر گلا دباتے ہوئے تیز سرگوشی میں کہا۔ "ایک ذرا آواز نہ نکالنا۔ میں جو سوال کروں، دبی زبان میں جواب دینا۔ میں بڑا بھائی ہوں، باپ کی طرح، سونے کا نوالہ کھلاتا ہوں۔ اگر میری غیرت کو للکارنے والی کوئی بات ہوئی تو ابھی تمہارا گلا دبا کر مار ڈالوں گا۔"

یہ دھمکی دے کر وہ خط کو آخر تک پڑھنے لگا۔ عطیہ نے کسی زبیر کو لکھا تھا۔ "زبیر صاحب! آپ دیکھنے میں بہت اچھے ہیں اگر آپ لڑکیوں کی طرف سے دھیان ہٹا کر اپنی ساری توجہ تعلیم پر صرف کریں تو اپنے ملک کے ہونہار فرزند کہلا سکتے ہیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ہم پر آوازیں کستے ہیں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ کیا آپ لوگ ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں سوچتے کہ آپ کی بہنوں سے کوئی ایسی شرارت کرے تو آپ کا رد عمل کیا ہو گیا؟

پہلے میں نے سوچا کہ آپ لوگوں کی شکایت پرنسپل سے کروں۔ پھر خیال آیا کہ کالج میں ہم سب کا یہ پہلا سال ہے۔ اگر میری شکایت پر ایکشن لیا گیا تو آپ لوگوں کا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔

دو روز پہلے میں اپنی کلاس میں بیٹھی لیکچر سن رہی تھی کہ آپ نے کھڑکی کے راستے کاغذ کی چھوٹی سی گولی میری طرف پھینکی۔ میں نے اسے کھول کر پڑھا۔ آپ نے لکھا تھا کہ میں مندرجہ ذیل فون نمبر پر آپ سے گفتگو کر سکتی ہوں۔

میں مانتی ہوں کہ کالج کی بعض لڑکیاں کسی نہ کسی کو بوائے فرینڈ بناتی ہیں اور بڑی ڈھٹائی اور بے غیرتی سے ایک دوسرے کو اپنے کارنامے سناتی رہتی ہیں۔ اگر آپ نے ان لڑکیوں سے یہ تاثر لیا ہے کہ ہمارے معاشرے کی سبھی لڑکیاں ایسے گھٹیا خیالات کی حامل ہوتی ہیں تو یہ محض آپ کی خوش فہمی ہے۔

میں نے آپ کے فون نمبر پر آپ کے گھر والوں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ریسیور آپ

کی والدہ نے اٹھایا۔ میں نے بڑے مؤدبانہ انداز میں انہیں بتایا کہ آپ بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں اور کالج کے باہر ہمیں چھیڑتے رہتے ہیں۔

پہلے تو آپ کی والدہ نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کا بیٹا آوارہ ہے۔ ان کے خیال میں، میں آپ پر خواہ مخواہ الزام عائد کر رہی تھی۔ میں نے یہ جواب سنا تو جواباً کہا۔ آنٹی! اگر یہ جھوٹا الزام ہے تو میں کالج کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر کالج کے پرنسپل کے سامنے جاؤں گی اور آپ کے صاحبزادے کا کچا چٹھا سناؤں گی۔ تب کیا ہو گا؟ میری اس دھمکی کا ان پر کچھ اثر ہوا۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔ نہیں بیٹی بات آگے نہ بڑھاؤ۔ آخر تم لڑکی ہو، بات آگے بڑھے گی تو تمہاری اور دوسری لڑکیوں کی بدنامی ہو گی۔ لڑکوں کا بھلا کیا جاتا ہے اور پھر میرا بیٹا نادان ہے۔ بچپن ہی سے بہت شریر ہے۔ میں اس کو سخت سزا دوں گی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مائیں اپنے جوان بیٹوں کی بے حیائی کو ان کا لڑکپن کہہ کر نظر انداز کر دیتی ہیں اور کتنی حیرانی کی بات ہے، آپ کی والدہ ایک عورت ہو کر لڑکیوں کو فریاد کرنے سے روک رہی تھیں اور ہم سب کو پیش آنے والی بدنامیوں سے ڈرا رہی تھی۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میری طرف سے اپنی والدہ سے یہ سوال ضرور کریں۔ امی۔ آپ بھی کبھی لڑکی تھیں؟ کیا آپ کا سابقہ بھی ایسے حالات سے پڑا تھا؟

لیکن آپ اپنی ماں اور بہن سے ایسے سوالات نہیں کریں گے۔ ایسے وقت ہر مرد کو شرم آتی ہے۔ اصل بات شرم کی ہے۔ اگر مرد کو پہلے ہی شرم آ جائے تو اسے بعد کی ندامت سے نجات مل جائے۔

میرا خیال ہے آپ میری باتوں پر غور کریں گے اور ایک شریف انسان کی طرح ان پر عمل کریں گے۔ فقط۔"

خط کی تحریر ختم ہو گئی۔ حاصل مراد نے اس خط کو مٹھی میں بھینچ کر اپنی بہن کو دیکھا پھر غصے سے پوچھا۔ "تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ بدمعاش تمہیں چھیڑتا ہے؟"

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے سختی سے کہا۔ "جواب دو؟"

وہ آہستگی سے بولی۔ "جب بات سیدھی طرح بنتی ہو تو اسے کیوں بگاڑا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس خط کو پڑھنے کے بعد وہ نادم ہو جائے گا۔"

"پہلے تمہیں نادم ہونا چاہئے۔ کیا ایک شریف زادی کسی غیر مرد کو خط لکھتی ہے؟"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھی جس پر مجھے نادم ہونا پڑے یا کوئی مجھ پر انگلی اٹھا سکے۔"

"مگر تم نے لکھا کیوں؟ پردے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پردہ نشین کو کوئی نہ دیکھے۔ کوئی اس کی آواز نہ سنے' کوئی اس کی تحریر نہ پڑھے۔"

"بھائی جان! یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں۔ اب پردہ نشین خاتون رسالوں میں چھپتی ہیں ریڈیو کے پروگرام میں شریک ہوتی ہیں' سب ان کی آوازیں سنتے ہیں۔ تحریریں پڑھتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا پردہ قائم رہتا ہے۔ پردے کا مطلب اپنے آپ کو بالکل ہی چھپانا اور گمنام کر دینا نہیں ہے۔ دراصل اخلاقی حدبندیوں کا نام پردہ ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ ایسی تقریریں لوگ سنتے ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں سمجھتے۔ آئندہ تم نے کسی کو خط لکھا تو میں تمہارے ہاتھ کاٹ کر پھینک دوں گا اور اس زبیر کو تو اچھی طرح سمجھ لوں گا۔"

وہ غصے سے جھنجلاتا ہوا' پاؤں پٹختا ہوا دروازے تک گیا پھر وہاں سے پلٹ کر بولا۔ "میں دیکھنا چاہتا ہوں' وہ کون ہے۔ آج تم ناغہ نہیں کرو گی۔ ہر حال میں کالج جاؤ گی۔"

وہ کمرے سے باہر آیا۔ ماموں' ممانی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر نکل رہے تھے۔ ماموں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے! اتنی رات کو کہاں جا رہے ہو؟"

اس نے غصے سے کہا۔ "ماموں جان! آپ کو بیٹھے بیٹھے کھاتے رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ کبھی گھر کی ذمے داریوں کا احساس بھی کر لیا کریں۔"

"بیٹے! میں تو گھر کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ آخر بات کیا ہے؟"

"کیا آپ سے اتنا نہیں ہوتا کہ روز عطیہ کو کالج جا کر چھوڑیں اور وہاں سے واپس لے آیا کریں؟"

"میں نے تو عطیہ بیٹی سے کہا تھا۔ وہ کہتی ہے' میں کوئی بچی نہیں ہوں کہ بزرگوں کی انگلی پکڑ کر کالج جایا کروں۔"

"اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ آئندہ آپ اس کے ساتھ جایا اور آیا کریں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں آج ہی سے اپنی بیٹی کے ساتھ جایا کروں گا۔"

"آج نہیں' کل سے۔ آج میں جاؤں گا۔"

وہ غصے سے فنفناتا ہوا مکان سے باہر آ گیا۔ اس وقت چار بجنے والے تھے۔ دور دور تک سڑکوں کی روشنیاں رات کی تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھیں۔ وہ جھنجلائے ہوئے ذہن کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کے اندر آندھی سی چل رہی تھی۔ وہ اس آندھی میں ایک تنکے کی طرح اڑتا ہوا زبیر تک پہنچ جانا چاہتا تھا' اسے بتانا چاہتا تھا کہ حاصل مراد کی بہن سے عشق کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔

وہ مختلف راستوں سے یوں گزرتا رہا جیسے انگاروں پر چل رہا ہو۔ زبیر نے اس کی غیرت کو للکارا تھا اب وہ اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا' نہ کھا سکتا تھا' نہ آرام کر سکتا تھا جب تک اس کی ہڈی پسلیاں توڑ کر اسے اپنی بہن کی عزت کرنا سکھا نہ دیتا۔

وہ چلتے چلتے ایک دم سے رک گیا۔ سر اٹھا کر پلاسٹک کی چلمن کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ادھر نہیں آ رہا تھا۔ اپنے مسئلے میں الجھا ہوا تھا لیکن ہزار جھنجلاہٹوں کے باوجود اس کے مزاج نے اسے عشق کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے پانچ بجے وہاں پہنچنے کے لئے کہا تھا۔ ابھی پانچ بجنے میں دیر تھی۔ اس کے باوجود وہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب صاف ظاہر تھا۔ دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی بے قراری سے انتظار کر رہی ہو گی۔ پتا نہیں رات کو کب سے کھڑکی کھولے چلمن کے پیچھے کھڑی اس کی آہٹ سننے کی منتظر ہو گی۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں اس کی چوکھٹ صاف طور پر نظر آ رہی تھی۔ وعدہ کے مطابق اس چوکھٹ پر کیسٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے کھڑکی پر دستک دی۔ پھر کہا۔ "میں آ گیا ہوں"

چلمن میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔ پھر ایک ہاتھ باہر آیا۔ چاندنی سے دھلا ہوا لگتا تھا۔ اس ہاتھ نے کیسٹ کو چوکھٹ پر رکھ دیا پھر چلمن کے پیچھے گم ہو گیا۔

وہ خوشی سے کھل گیا۔ آگے بڑھ کر اس کیسٹ کو اٹھا لیا۔ اسے چومتے ہوئے کہا۔ "شکریہ' میں نہیں جانتا۔ اس کیسٹ میں تمہارے تیور کیا ہوں گے لیکن مجھے جواب مل رہا ہے۔ یہی میرے لئے بہت ہے۔"

چلمن کے پیچھے خاموشی رہی۔ اس نے کہا۔ "میں اس کیسٹ کے ذریعے تمہاری

آواز سن لوں گا مگر کیسٹ میں اور تم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یہ تمہاری آواز میں بولے گا۔ مگر تمہارے وجود کے بغیر بولے گا۔ میں اتنی دور سے چل کر آیا ہوں۔ میری یہ آرزو بھی پوری کر دو اپنی ہلکی سی آواز سنا دو۔"

دوسری طرف سے ذرا خاموشی رہی۔ پھر وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میری آواز امی اور ابو کے کمرے تک بھی پہنچ سکتی ہے۔"

"ہاں، میں اپنی خوشی میں بھول ہی گیا تھا کہ یہاں زیادہ دیر تک کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں تمہیں بدنام نہیں کرنا چاہتا۔ کل اسی وقت یہاں آؤں گا۔ خدا حافظ۔"

وہ وہاں سے چلا آیا۔ مارے خوشی کے زمین پر پاؤں نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے اتنی جلدی اپنی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ اب وہ جلد سے جلد اس کیسٹ کو سننا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے جگری دوست کے دروازے پر دستک دی۔ اس وقت پانچ بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ اس کے دوست کے والد نے کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔

"کیوں مراد! خیریت تو ہے، اتنی رات کو کیسے آئے؟"

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "انکل! رات نہیں، پانچ بجکر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ صبح ہونے والی ہے آپ ذرا قیصر کو بھیج دیجئے۔"

تھوڑی دیر بعد قیصر آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا اور بولا۔ "یار سونے تو دیا کرو۔ کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔"

اس نے ایک دم قریب ہو کر کان میں کہا۔ "قیامت ہی ٹوٹ پڑی ہے۔ جب تک کیسٹ نہیں سنوں گا اس وقت تک قرار نہیں آئے گا۔"

قیصر نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیسا کیسٹ؟"

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا کر بولا۔ "پہلے نامہ بر کبوتر ہوتے تھے۔ اب کیسٹ ہوتے ہیں، اس کا جواب آ گیا ہے۔"

قیصر کی نیند اڑ گئی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا سچ؟ وہ اندھی اتنی جلدی دام فریب میں آ گئی ہے؟"

"یہی تو ہمارا کمال ہے۔ کیسٹ ریکارڈر لے آؤ۔ کہیں تنہائی میں چل کر سنتے ہیں۔"

"میرا کیسٹ ریکارڈر خراب ہے۔"

"یار مشکل ہو گئی۔ اب کیا کریں؟"

وہ دونوں بشیر کے ہاں پہنچے۔ اس وقت تک فجر کی اذان ہو چکی تھی۔ روشنی پھیل رہی تھی۔ بشیر نے بھی حیرانی سے پوچھا۔ "یار، کل ہی کی بات ہے۔ تم اس اندھی کا ذکر کر رہے تھے۔ اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟"

حاصل مراد فخر سے سینہ تان کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیسٹ ریکارڈر لے آؤ۔ ہم کہیں چل کر اطمینان سے سنیں گے۔"

بشیر نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم سن ہی رہے ہو، تلاوت کی آواز آ رہی ہے۔ میرے ابو فجر کی نماز کے بعد کیسٹ کے ذریعے قرآن پاک سنتے ہیں۔ ایک گھنٹے سے پہلے ریکارڈر نہیں ملے گا۔ اس پر بھی طرح طرح کے سوالات کئے جائیں گے کہ گھر سے باہر ریکارڈر کیوں لے جایا جا رہا ہے۔"

حاصل مراد نے کیسٹ کو حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بھی مراد فوراً پوری نہیں ہو جاتی۔ چلو جمال حسن کے ہاں چلتے ہیں۔"

وہ تینوں جمال حسن کے ہاں پہنچے۔ آواز دی تو وہ گھر سے نکلا، اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دوستوں نے پوچھا۔ "یہ چوٹ کیسے آئی؟"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "بس کچھ نہ پوچھو۔ اپنی سناؤ۔ باجماعت آئے ہو تو ضرور کوئی خاص بات ہو گی۔"

حاصل مراد نے کیسٹ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ہاں بڑی چٹ پٹی باتیں سنانے آئے ہیں۔ کل میں نے کہا تھا کہ ڈور پھینک رہا ہوں، آج مچھلی کانٹے پر آ گئی ہے۔"

جمال حسن نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا وہ اندھی ہے؟"

"ہاں، اس نے اپنا جواب اس میں ریکارڈ کیا ہے۔ اپنا کیسٹ ریکارڈر لے آؤ ہم کہیں چل کر سنیں گے۔"

اس نے اپنے گھر کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس کیسٹ ریکارڈر تو تھا مگر اب کسی کام کا نہیں رہا۔"

"یار کیوں بہانہ کر رہے ہو۔"

"قسم سے بہانہ نہیں کر رہا ہوں۔ میرے سر کو دیکھ رہے ہو۔"

"ہاں پٹی بندھی ہوئی ہے آخر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ ابھی منہ اندھیرے بیگم سے جھگڑا ہو گیا۔ مجھے غصہ آیا تو میں نے

گلدان اٹھا کر مارنا چاہا۔ اس سے پہلے ہی بیگم نے کیسٹ ریکارڈر اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔ وہ تو اب بجنے کے قابل نہیں رہا۔ میرا سر بج رہا ہے۔"

قیصر نے کہا۔ "تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ شادی کرنے میں جلدی نہ کرو لیکن تم نے ہماری ایک نہ سنی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ چلو وکی کے پاس چلتے ہیں۔"

وہ سب وقار احمد عرف وکی کی کوٹھی میں پہنچے۔ وکی کے ہاں کئی کیسٹ ریکارڈر تھے۔ اس نے اپنے کمرے میں بلایا۔ کھڑکیوں اور دروازے کو اندر سے بند کیا۔ ایک بڑے سے کیسٹ ریکارڈر کو صوفوں کی درمیانی میز پر رکھا۔ پھر کیسٹ کو اس میں لگا کر اسے آن کر دیا۔ تمام دوست آرام سے صوفے پر بیٹھ کر سننے لگے۔

ان کے درمیان ایک پردہ نشین بول رہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے آس پاس اندھیرا دور کرنے کے لئے اپنے منہ سے آواز نکالی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ سر محفل سنی جا رہی ہے۔ نئی نسل کے نوجوان سن رہے تھے اور تبصرے کر رہے تھے۔

حاصل مراد کی تعریفیں کر رہے تھے۔ "واہ کیا رس بھری آواز ہے۔"

"بھئی' ایسے نایاب موتی کیسے ڈھونڈ نکالتے ہو؟"

"لہجہ اچھا ہے مگر رومانس کم اور فلسفہ زیادہ بولتی ہے۔"

"بھئی مراد! ایک گڑ بڑ ہے۔ یہ تمہاری بہن کو جانتی ہے۔ اگر یہ بات تمہارے گھر تک پہنچی اور تمہارا یہ کھیل سنجیدہ ہو گیا تو جمال حسن کی طرح تمہاری بھی شادی ہو جائے گی۔ پھر ایک دن ہم تمہارے سر پر پٹی بندھی ہوئی دیکھیں گے۔"

سب قہقہے لگانے لگے۔ اندھی کی تمام باتیں سننے کے بعد حاصل مراد نے ریکارڈر آف کر دیا۔ پھر کہا۔ "میں کوئی ایسا چکر چلاؤں گا کہ شبانہ میری بہن سے نہ مل سکے۔ اپنی بہن پر پابندی عائد کر دوں گا۔ وہ ادھر نہیں آسکے گی۔ اب ایک بات اور سنو! آج ہمیں ایک تھری لنگ سچویشن سے گزرنا ہے اپنے اپنے ہاکی اور بلے نکالو۔"

"بات کیا ہے؟"

وہ زبیر کے متعلق بتانے لگا تھا اس کی بات سنتے ہی بشیر نے غصے سے کہا۔ "ہماری ماں بہنوں کو چھیڑنا آسان نہیں ہے۔ ہم زبیر کو وہ سبق سکھائیں گے کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

قیصر نے کہا۔ "ہماری ٹیم بہت مضبوط ہے۔ کوئی ہمارے گھروں کی چار دیواری میں

بھاگنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

وکی نے کہا۔ "تم کہو تو میں اپنے پاپا کا ریوالور لے کر چلوں؟"

حاصل مراد نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہاکی اور کرکٹ کے بلے ہی کافی ہیں اور چاقو تو میرے پاس ہمیشہ رہتا ہے۔ بات بڑھے گی تو دیکھا جائے گا۔"

پھر اس نے کیسٹ کو ریوائنڈ کیا اور ایک بار پھر شبانہ کی باتیں سننے لگا اور دوستوں کو پھر سے سنانے لگا۔

☆------☆------☆

کالج کے احاطے کے باہر ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ ریستوران کے بائیں طرف بس اسٹاپ اور دائیں طرف کالج کا بڑا سا گیٹ تھا۔ اس وقت ریستوران کے اندر حاصل مراد اپنے چھ گبھرو دوستوں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ان کے میز کے نیچے ہاکی اور بلے رکھے ہوئے تھے۔ ریستوران میں کافی چہل پہل تھی۔ کالج کے لڑکے آتے جاتے' کھاتے پیتے رہتے تھے۔ ان کی میز کے پاس ایک کھڑکی کے قریب دو نوجوان بیٹھے ہوئے کالج کی طرف دیکھ رہے تھے اور چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں کی آواز حاصل مراد کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ریستوران کا مالک بھی ان کی باتیں سن رہا تھا مگر نظر انداز کر رہا تھا.......... حاصل مراد ان نوجوانوں کی طرف توجہ نہ دیتا لیکن ان کی باتوں کے دوران عطیہ کا نام آیا تھا اور یہ نام سنتے ہی اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہی نوجوان' زبیر ہو سکتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اس نوجوان نے چونک کر اپنے ساتھی سے کہا۔ "وہ آرہی ہے۔ چلو اٹھو۔"

وہ اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "کمبخت کبھی تنہا نہیں رہتی۔ ہمیشہ دو چار سہیلیوں کے ساتھ ہوتی ہے جس طرح چاند ستاروں کے جھرمٹ میں ہوتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دونوں ریستوران سے باہر چلے گئے۔ حاصل مراد نے اٹھ کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ عطیہ اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ آرہی تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر جا کر مالک سے پوچھا۔ "جناب! آپ ان نوجوانوں کی باتیں سن رہے تھے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں یہاں روز ہی بھانت بھانت کی بولیاں سنتا ہوں۔ آج کل کے لڑکے تعلیم کیا حاصل کریں گے' یہ تو عشق کرتے ہیں یا پھر سیاست کرتے ہیں۔ یہ

وہ نسل ہے جو آئندہ چل کر اس ملک کا بوجھ سنبھالے گی پھر سوچو کیا ہوگا؟"

"آپ نے ان کی زبان سے عطیہ نامی لڑکی کا نام سنا ہے۔ وہ اس کے متعلق کیسی کیسی باتیں کر رہے تھے۔"

"ہاں بھئی! میں نے کہا نا' میں تو روز ہی سنتا رہتا ہوں۔"

"پھر آپ کسی موقعے پر گواہی دے سکتے ہیں کہ یہ میری بہن کو چھیڑتے رہے ہیں۔"

ریستوران کے مالک نے چونک کر پوچھا۔ "کیا وہ تمہاری بہن ہے؟"

"ہاں' اسی لئے تو آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو میاں صاحبزادے! یہ میرے دھندے کی جگہ ہے۔ یہاں سے چار پیسے کماتا ہوں۔ بس اسٹاپ کے مسافروں سے آمدنی کم ہوتی ہے۔ یہ کالج کے لڑکے ہی یہاں آکر زیادہ کھاتے پیتے ہیں۔ میں ان سے بگاڑ پیدا نہیں کر سکتا۔ غصہ آگیا تو میرے ہوٹل میں توڑ پھوڑ مچائیں گے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایک شریف زادی کو چھیڑا جا رہا ہے' آپ اس کے چشم دید گواہ ہیں اور آپ گواہی دینے سے انکار کریں گے۔"

"تم ابھی جوان ہو' زندگی کے ڈھنگ نہیں جانتے۔ آدمی پہلے اپنا پیٹ دیکھتا ہے۔"

"کیا باہر کوئی آپ کی بیٹی کو چھیڑتا رہے تو آپ یہاں کاؤنٹر پر پیسے گنتے رہیں گے؟"

"بھئی میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ اپنا دھندا خراب نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے تمہاری بہن' میری بیٹی جیسی ہے۔ میں ان لڑکوں کو سمجھا دوں گا۔"

"آپ ایک عرصے سے اس ریستوران کے مالک ہیں اور یہ تماشے دیکھتے آرہے ہیں۔ صرف میری بہن کی بات نہیں اور بھی دوسری لڑکیوں کو چھیڑا جاتا ہے۔ کیا اس سے پہلے آپ نے کسی کو سمجھایا؟"

"بھئی تم بحث زیادہ کرتے ہو۔ میں نے کہا نا' میں اس لڑکے کو سمجھا دوں گا۔ بس اب جاؤ۔"

اسی وقت وکی نے ریستوران کے باہر سے آواز دی۔ "مراد! جلدی آؤ۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا۔ عطیہ سر جھکائے اپنی سہیلیوں کے ساتھ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ دو نوجوان لڑکے ان کے پیچھے فٹ پاتھ پر کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے

کچھ نہ کچھ بولتے' گنگناتے جا رہے تھے۔ کبھی ہنس رہے تھے' کبھی تالیاں بجا رہے تھے۔ حاصل مراد وہاں سے دوڑتا ہوا آیا۔ عطیہ اپنے بھائی کو دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ مراد نے قریب پہنچتے ہی زبیر کو گالیاں دیتے ہوئے اس کے منہ پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ زبیر اس کے مقابلے میں کمزور تھا' مار کھا رہا تھا۔ صرف گالیاں دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ حاصل مراد کے تمام ساتھیوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ لگ گئی۔ کالج تک یہ خبر پہنچ گئی تھی۔ لڑکے دوڑے ہوئے چلے آرہے تھے۔ کچھ طلبا زبیر کی حمایت کر رہے تھے' کچھ خاموش تھے' کیونکہ عطیہ اور اس کی سہیلیاں بھی کالج کی طالبات تھیں اور ان کی عزت کرنا اور حمایت کرنا ان کا فرض تھا۔

لوگ بیچ بچاؤ کر رہے تھے۔ حاصل مراد کی یہ مراد پوری نہیں ہوئی تھی کہ زبیر کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے زندگی بھر کے لئے ایک سبق سکھایا جائے لیکن بیچ بچاؤ کے باوجود حاصل مراد اور اس کے ساتھی قابو میں نہیں آرہے تھے۔ ان کی گرفت سے نکل نکل کر للکار رہے تھے اور لوگوں کو غیرت دلا رہے تھے کہ کسی کی بہن اور بیٹی کو چھیڑنے والوں کے ساتھ ہمدردی کی جا رہی ہے' انہیں بچایا جا رہا ہے۔ اگر اس سلسلے میں لڑنا خلاف قانون ہے تو زبیر کو قانون کے حوالے کیا جائے۔

اس وقت تک کالج کے پرنسپل نے پولیس کو طلب کر لیا تھا۔ زبیر مار کھانے کے بعد غصے سے دھاڑ رہا تھا۔ اس نے پرنسپل اور پولیس والوں کو آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ حاصل مراد کو چیلنج کرنے لگا۔ "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اگر تم میرے قابو میں نہ آئے تو میں تمہاری بہن کو اٹھوا لوں گا۔"

پولیس انسپکٹر نے پیچھے سے اس کے گریبان کو پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بک رہے ہو؟"

پرنسپل نے کہا۔ "انسپکٹر! یہ لڑکے جوان ہیں' نادان ہیں' جوش میں آتے ہیں تو ہوش میں نہیں رہتے۔ میرا مشورہ ہے آپ انہیں تھانے نہ لے جائیں۔ میرے دفتر میں لے چلیں۔ وہاں فیصلہ ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد بھیڑ چھٹ گئی۔ زبیر' حاصل مراد' اس کے ساتھی اور عطیہ وغیرہ کو کالج کامن روم میں لے جا کر بٹھایا گیا۔ فرداً فرداً ان کے بیانات سنے گئے۔ پرنسپل اور

انسپکٹر اس نتیجے کو پہنچے کہ سراسر زبیر کی غلطی ہے۔ اس نے لڑکیوں کو چھیڑ کر غلط حرکت کی ہے لہٰذا وہ عطیہ اور اس کے بھائی سے معافی مانگے۔ پرنسپل کو ایک تحریری بیان دے کہ آئندہ وہ کسی لڑکی کو نہیں چھیڑے گا۔"

زبیر نے اٹھ کر غصے سے کہا۔ "ایک تو ان لوگوں نے منظم طریقے سے ہاکی اور بلوں سے مجھ پر حملہ کیا' مجھ پر جھوٹا الزام لگایا میں نے کسی کو نہیں چھیڑا ہے۔"

انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "اوئے! تم بڑے شریف ہو۔ میرے سامنے انہیں چیلنج کر رہے تھے کہ ان کی بہن کو اٹھوا لو گے۔ ابھی تمہیں حوالات میں بند کردوں گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ وہاں ہم کھٹملوں اور مچھروں کو تمہارے جیسے بدمعاشوں کا خون پینے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔"

حاصل مراد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جناب! انسان معافی مانگنے اور توبہ کرنے کے بعد بھی وہی غلطیاں کرتا ہے۔ آپ باقاعدہ اس کے خلاف رپورٹ درج کریں اور اس نے جن الفاظ میں چیلنج کیا ہے' اسے ہوبہو تحریر میں لائیں تاکہ اس کے دل پر دہشت طاری رہے اور یہ قانون سے ڈرتا رہے۔"

انسپکٹر نے حاصل مراد کی طرف چھڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اوئے! ہمیں قانون نہ سکھاؤ۔ ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ زیادہ بک بک کرو گے تو تم سب کی پٹائی کروں گا۔"

عطیہ نے اٹھ کر کہا۔ "انسپکٹر! اس وقت آپ طلبا اور طالبات کے درمیان ہیں۔ آپ کی چھڑی سے چور اور بدمعاش ڈرتے ہوں گے اگر آپ قانون کے محافظ ہیں تو زبیر کے خلاف باقاعدہ رپورٹ درج کریں' ورنہ میں یہاں سے طلبا و طالبات کا جلوس لے کر مارشل لاء کے دفتر جاؤں گی۔ تب معلوم ہوگا کہ قانون کیا ہے۔ ایک لڑکی کی بے عزتی کرنے کے جرم میں' اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔"

پرنسپل نے جلدی سے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "نہیں نہیں عطیہ! تم ایک ذہین طالبہ ہو جوش میں نہ آؤ۔ ایسے اقدامات سے ہمارا کالج بدنام ہو جائے گا۔ پلیز' بیٹھ جاؤ۔ میں زبیر کو سمجھا دوں گا اور اس کا تحریری بیان اپنے پاس محفوظ رکھوں گا۔ یہ آئندہ تمہیں چھیڑنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

وہ مجبوراً پرنسپل کا فیصلہ تسلیم کرکے آگئے۔ حاصل مراد اور اس کے ساتھی مطمئن نہیں تھے۔ وہ یہی کہہ رہے تھے کہ کچھ بھی نہ ہوا۔ جی بھر کے زبیر کی پٹائی نہ ہو سکی۔ وہ

تو بچ کر نکل گیا مگر وہ انتقام کی آگ میں سلگتے رہیں گے۔

چونکہ وہ مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے دوسرے دن بھی اسی ریستوران کے پاس آکر کھڑے رہے۔ جب عطیہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کالج سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف آنے لگی تو چار بدمعاش قسم کے لوگ پیچھے لگ گئے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ "بھئی! زبیر نے اپنے پرنسپل سے معافی مانگی ہے۔ اپنا تحریری بیان دیا ہے۔ ہم نے تو نہیں دیا ہے۔ ہائے' اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے۔ جس نے ڈالی' بری نظر ڈالی۔ اب تو ہم بری نظر ڈال رہے ہیں۔ کہاں ہے تمہارا وہ غیرت مند بھائی؟"

پیچھے سے حاصل مراد نے للکار کر کہا۔ "میں یہاں ہوں۔" جیسے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ قیصر نے اس پر ہاکی سے حملہ کیا۔ وہاں پھر بھگدڑ مچ گئی۔ اس بار وہ غنڈے بھی.......... ڈنڈے لے کر آئے تھے۔ اس لڑائی کے دوران حاصل مراد زبیر کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک طرف الگ تھلگ کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور مسکرا کر تماشا دیکھ رہا تھا۔ مراد نے اس کے قریب پہنچتے ہی اس کے منہ پر ایک گھونسا رسید کردیا۔ پھر اسے غصے اور جنون کی حالت میں مارتا چلا گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے بچانے کی کوشش کی تو اس نے چاقو نکال لیا۔ چاقو کا پھل کھلتے ہی سب منتشر ہوگئے۔ زبیر نے بھاگنا چاہا مگر بھاگ نہ سکا۔ موت اس کا مقدر بن گئی تھی۔ دور تماشا دیکھنے والے چیخنے لگے۔ "خون' خون ہوگیا۔ قتل ہوگیا۔ دوڑو' پکڑو۔"

مگر کوئی آگے بڑھ کر اسے پکڑنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا اور زمین پر زبیر کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

☆------☆------☆

چھ ماہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ دونوں طرف کے وکیل اپنی اپنی قانونی موشگافیوں کا زور لگاتے رہے۔ زبیر کے والد نے جو وکیل کیا تھا وہ بھرپور کوشش کر رہا تھا کہ حاصل مراد کو سزائے موت ہو جائے۔

دوسری طرف حاصل مراد کا وکیل بھی کچھ کم نہ تھا۔ وہ ثابت کر رہا تھا کہ حاصل مراد ایک تعلیم یافتہ' امن پسند شہری ہے۔ ایک غیرت مند بھائی ہے جس کی غیرت کو بارہا للکارا گیا۔ اس کے ثبوت میں عطیہ کی حمایت کرنے والے طلبا اور طالبات کے بیانات پیش کئے گئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ زبیر اکثر لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے بیان دیا کہ جب پہلی بار کالج کے سامنے زبیر اور حاصل مراد کی لڑائی ہوئی تو اس نے باقاعدہ رپورٹ درج نہیں کی۔ پرنسپل نے درخواست کی تھی کہ کالج کی عزت کا سوال ہے۔ لہٰذا وہ اپنے طلبا کو سمجھائے گا اور آئندہ زبیر جیسے طلبا لڑکیوں کو نہیں چھیڑیں گے‘ اس سلسلے میں زبیر نے اپنا معافی نامہ بھی پیش کیا تھا۔

پرنسپل نے عدالت کے سامنے اپنے بیان میں کہا۔ ”بیشک‘ زبیر نے معافی نامہ پیش کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ عطیہ کو نہیں چھیڑے گا لیکن وہ اپنے چیلنج پر قائم تھا۔ اس نے اپنے معافی نامے کے مطابق خود عطیہ کو نہیں چھیڑا بلکہ کرائے کے غنڈے اس کے پیچھے لگا دیئے۔“

حاصل مراد کے وکیل نے کہا۔ ”جناب والا! پولیس انسپکٹر اور کالج کے پرنسپل کے بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ مقتول زبیر نے سرعام عطیہ کو اغوا کرنے کی دھمکی دی تھی اور دوسرے دن وہ کرائے کے غنڈوں کے ذریعے یہی کر رہا تھا۔ اگر اس وقت ایک بھائی اپنی بہن کی حفاظت کے لئے نہ آتا تو بہن کی عزت کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے عین وقت پر غنڈوں کو روکا اسے اشتعال دلایا گیا‘ اسے قتل پر مجبور کیا گیا۔ میرا مؤکل کوئی عادی مجرم یا قاتل‘ بدمعاش نہیں ہے۔ ایک پُرامن شہری ہے۔ بیشک اس نے قتل کیا‘ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا لیکن اسے قانون کو ہاتھ میں لینے پر بار بار مجبور کیا گیا۔ بار بار اسے اشتعال دلایا گیا۔ آخری بار اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ بہن کو اغوا ہونے دیا جائے‘ اس کی عزت کو رسوا ہونے دیا جائے یا عزت کے دشمن کو ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اس نے مشتعل ہو کر جنونی حالت میں ایسا کیا۔ آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ فیصلہ سناتے وقت ان نکتوں کو پیشِ نظر رکھیں۔ شکریہ!“

عدالت نے فیصلہ سنایا۔ ”زبیر کے قتل کی واردات کے اسباب و تفصیلات اور گواہوں کے بیانات سننے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ زبیر ایک شریف گھرانے کا گمراہ نوجوان تھا۔ اس نے بار بار حاصل مراد کو اشتعال دلایا‘ اس کی بہن کو اٹھالے جانے کی دھمکی دی۔ پھر کرائے کے غنڈوں کے ذریعے اس پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ ان حالات میں حاصل مراد نے مشتعل ہو کر قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا‘ چونکہ قانون کو ہاتھ میں لینا جرم ہے۔ لہٰذا عدالت حاصل مراد کو سات سال قید بامشقت کی سزا سناتی ہے۔“

بھائی کی سزا سنتے ہی عطیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایک ہفتے بعد اسے سینٹرل

جیل میں بھائی سے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے ایک زبیر کو قتل کردیا‘ سات برس کے لئے سلاخوں کے پیچھے آگئے۔ اب میں تنہا ہوں۔ بے یارومددگار ہوں۔ مجھے ہر قدم پر ایک نیا زبیر ملتا رہے گا۔ اب کون میری حفاظت کرے گا؟ کیا زبیر کو قتل کرنے سے میرا مسئلہ حل ہوگیا؟“

وہ اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتا تھا۔ سر جھکا کر بولا۔ ”تم گھر سے نہ نکلا کرو۔ ماموں اور ممانی تمہارے سرپرست ہیں۔ میں ان سے کہوں گا‘ جہاں سے بھی اچھا رشتہ آئے‘ وہ تمہیں سہاگن بنا کر رخصت کردیں۔“

وہ چند لمحوں تک سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ ”مقدمے کے دوران ایک دن شبانہ نے اپنے ابو کے ذریعے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔“

اس نے چونک کر پوچھا۔ ”کون شبانہ؟“

”آپ انجان نہ بنیں۔ شبانہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ اسے بہت چاہتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو مجھے بھی وہ بہت پسند ہے۔ وہ کہہ رہی تھی‘ سات برس تک آپ کا انتظار کرلے گی۔“

وہ منہ پھیر کر بولا۔ ”کوئی دوسری بات کرو۔“

وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سات برس تک جیل کی چاردیواری میں شبانہ کے تصور سے زندگی نہیں گزرے گی بلکہ بے چینی اور اضطراب بڑھتا جائے گا۔ دانشمندی یہی تھی کہ ان باتوں کو اب نظرانداز کیا جائے اور اپنا دھیان دوسری طرف بٹایا جائے۔

عطیہ نے پھر شبانہ کی بات نہیں کی‘ آئندہ پیش آنے والے مسائل کے متعلق گفتگو کرتی رہی۔ پھر ملاقات کا وقت ختم ہونے پر چلی گئی۔

وہ تنہا رہ گیا۔ سزا کے ابتدائی دنوں میں جیل کی چاردیواری بہت تنگ محسوس ہوتی تھی۔ دم گھٹنے لگتا تھا۔ پھر وہ رفتہ رفتہ عادی ہونے لگا۔ صبر کرنے لگا۔ اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ سات برس کسی طرح گزارنے ہی ہوں گے۔ مہینے دو مہینے میں کبھی عطیہ اور کبھی ماموں اس سے ملاقات کے لئے آتے تھے۔ عطیہ ماموں کی شکایت کرتی تھی۔ وہ وی سی آر کا کاروبار کرنا نہیں جانتے ہیں۔ آمدنی کم ہوگئی ہے۔ وہ وی سی آر کو دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک خراب ہوگیا ہے۔ اس کی مرمت کے لئے ایک پرزہ نہیں مل رہا ہے۔ باقی چار وی سی آر کے ریٹ گر گئے۔ ماموں

کو جب پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ریٹ گرا کر دی سی آر بک کر دیتے ہیں۔"

ماموں ملاقات کرنے آتے تو اپنا دکھڑا سناتے تھے۔ "عطیہ ابھی بچی ہے۔ گھر میں رہنے والی لڑکی ہے۔ وہ باہر کے معاملات کو سمجھتی نہیں ہے۔ باہر آج کل پولیس والے بہت پریشان کرنے لگے ہیں۔ بھتہ بہت لیتے ہیں۔ پھر اپنے علاقے میں کریم بھائی اور جمشید بھائی نے بھی یہی دھندا شروع کر دیا ہے۔ تم ایک رات کے ایک سو بیس روپے لیتے تھے اور وہ لوگ سو روپے لیتے ہیں۔ مجبوراً میں نے اسی روپے میں بک کرنا شروع کر دیا ہے۔ جب مارکیٹ میں مقابلہ ہو تو ریٹ چڑھتے اترتے رہتے ہیں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "ماموں! کاروبار کی بات چھوڑیئے جہاں سے بھی رشتہ آئے' پہلی فرصت میں عطیہ کی شادی کر دیجئے۔ وہ بوجھ میرے سر سے اتر جائے گا تو میں اطمینان سے سزا کاٹ سکوں گا' زندگی کے دن گزار سکوں گا۔"

ایک برس بعد ماموں نے آکر کہا۔ "کسی تعلیم یافتہ لڑکے کا رشتہ نہیں مل رہا ہے۔ اچھے گھرانے والے یہی سن کر کترا جاتے ہیں کہ لڑکی کا بھائی قاتل ہے۔" انہوں نے جیب سے ایک خط نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ عطیہ بٹی نے تمہیں دیا ہے۔"

اس نے خط کھول کر پڑھا۔ عطیہ نے لکھا تھا۔ "بھائی جان! ماموں ایک جاہل لڑکے سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آخر یہ کیا ضروری ہے کہ مجھے جنت نہ ملے تو جہنم میں جھونک دیا جائے۔ کیا میں شادی کے بغیر نہیں رہ سکتی؟ کیا آپ مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتے؟ اگر کرتے ہیں تو مجھے اجازت دیجئے' میں ایک اسکول میں ملازمت کر لوں۔ میں بچوں کو تعلیم بھی دوں گی اور عزت کی روٹی بھی حاصل کروں گی۔"

عطیہ نے اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ اس نے خط واپس کرتے ہوئے کہا۔ "اس سے کہہ دو۔ میں اسے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دوں گا وہ ملازمت نہیں کر سکتی۔ آپ ہمارے ماموں ہیں۔ ہمارا برا نہیں چاہیں گے۔ مجھے سچ سچ بتایئے جس لڑکے سے آپ عطیہ کی شادی کرنا چاہتے ہیں وہ کیسا ہے؟"

"بیٹا! لاکھوں میں ایک ہے۔ بس ایک ہی کمی ہے کہ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتا اور ہماری بٹی کالج تک پڑھ چکی ہے۔ باقی خاندان بہت اچھا ہے۔ ایک بہت بڑا بھینسوں کا باڑا ہے۔ اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ دولت میں کھیلتے ہیں۔ ہماری بٹی وہاں راج کرے گی۔"

"بس ٹھیک ہے' آپ فوراً شادی کر دیں۔"

دو ماہ بعد ماموں پھر اس سے ملنے اور خوشخبری سنانے آئے کہ عطیہ کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ سن کر بہت خوش ہوا' مگر اداس بھی ہوا' ایسے وقت وہ بہن کے سر پر ہاتھ رکھنے کے لئے وہاں موجود نہیں تھا اس نے پوچھا۔ "عطیہ خوش تو ہے؟"

"ہاں' خوش ہے۔"

"اس سے کہنا' میں اسے دعائیں دے رہا تھا۔ وہ مجھے خط لکھے اور ہو سکے تو اپنے شوہر کے ساتھ کبھی مجھ سے ملنے آئے۔"

ماموں چند لمحوں تک خاموش رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "بیٹا! اصل بات یہ ہے کہ بٹی پرائی ہونے کے بعد دوسروں کے اختیار میں ہو جاتی ہے' اس کے سسرال والے اسے خط لکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

"لیکن میں تو بھائی ہوں۔ وہ مجھے خط لکھ سکتی ہے۔ مجھ سے ملنے آ سکتی ہے۔"

"ہاں' مگر اس کا خاوند کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو جیل خانے نہیں جانے دے گا اور نہ ہی کسی قاتل کو خط لکھنے کی اجازت دے گا چاہے وہ اس کی بیوی کا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ سلاخوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر غصے کو ضبط کرنے لگا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ جنگل کے شیر کو اور آبادی میں قتل کرنے والے انسان کو اسی لئے پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے کہ وہ انسانی زندگی سے نہ کھیلے' اگر وہ اس وقت باہر ہوتا تو شاید جوش اور جنون میں اپنے بہنوئی کا گریبان پکڑنے کے لئے پہنچ جاتا' بات بڑھتی۔ پھر ایک اور قتل ہوتا۔ اسی لئے قانون ایسے لوگوں کو لگام دیتا ہے' کٹہرے میں بند کرتا اور سزا دیتا ہے۔

وہ چند لمحوں تک ماموں کو گھورتا رہا اور دانت پیستا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "آپ نے تو کہا تھا کہ خاندان اچھا ہے۔ عطیہ اپنی شادی سے خوش ہے۔"

"ہاں' میں تو یہی سمجھ رہا تھا۔ مگر اکثر لوگ کچھوے کی طرح اپنے موٹے خول کے اندر چھپے رہتے ہیں۔ شادی کے بعد انہوں نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ اب ان کی اصلیت معلوم ہو رہی ہے۔"

"اب کیا معلوم ہو رہا ہے؟ مجھے صاف صاف بتایئے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "بیٹے! وہ جو لڑکا ہے' یہی اپنی عطیہ کا شوہر قلندر حسین'

پولیس کی بلیک لسٹ میں ہے۔ لانڈھی میں دو قتل ایسے ہوئے ہیں جن کے قاتل کا سراغ اب تک نہیں مل سکا ہے۔ دونوں قتل کے سلسلے میں قلندر کا نام آتا ہے لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"جب ثبوت نہیں ہے تو اس کا نام کیوں آتا ہے؟"

"اس کا بھینسوں کا بہت بڑا باڑا ہے۔ قانوناً بھری پری آبادی میں ایسے باڑے رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ لوگ قلندر سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس کے خلاف کارروائی نہیں کرتے۔ پولیس والے بھی کچھ نہیں کہتے۔ اسی سلسلے میں پہلے ایک شخص نے بھینسوں کے باڑے کے خلاف آواز اٹھائی تو وہ کچھ دنوں بعد مارا گیا۔ ایک برس کے بعد ایک اور سماجی کارکن نے اس کے خلاف کہنا شروع کیا کہ بھینسوں کے باڑے طرح طرح کی گندگی اور بیماریاں پھیلاتے ہیں' اسے یہاں نہیں ہونا چاہئے' آبادی سے باہر ہونا چاہئے۔ اس کے چند ماہ بعد ہی وہ آواز اٹھانے والا بھی قتل کردیا گیا۔ اب وہاں کوئی قلندر کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا ہے۔ سب اس سے ڈرتے ہیں مگر دبی زبان سے کہتے ہیں کہ قاتل وہی ہے۔ پولیس والے بھی سمجھتے ہیں لیکن اس کے خلاف کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے۔ ہوگا بھی تو اسے اپنی جان پیاری ہوگی۔"

حاصل مراد نے جھنجلا کر پوچھا۔ "آپ نے شادی سے پہلے اس کے متعلق تحقیقات کیوں نہیں کیں؟"

"کیسے کرتا؟ محلے پڑوس میں کوئی اس کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتا ہے۔ کچھ پوچھو تو سب اس کی تعریفیں کرتے ہیں۔ پھر بھلا مجھے حقیقت کیسے معلوم ہوتی؟"

"آپ ان سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں دھوکے میں رکھ کر میری بہن کو ایک قاتل کے پلے کیوں باندھ دیا؟"

"میں نے دبی زبان میں کہا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر طنز کرتے ہوئے بولا کبوتر اڑتا ہے کبوتر کے ساتھ۔ باز اڑتا ہے باز کے ساتھ' جیسے لوگ ہوتے ہیں ویسا ہی ساتھ ملتا ہے۔ ایک قاتل بھائی کی بہن کا رشتہ کسی شریف گھرانے میں تو کبھی نہ ہوگا۔ یہ تو میرا احسان ہے کہ میں نے اسے بیوی بنا کر گھر میں ڈال رکھا ہے۔"

وہ بے چین ہو کر سلاخوں کے پیچھے ٹہلنے لگا اگر سلاخوں کے باہر ہوتا تو جانے قلندر کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ زبیر نے بہن کو صرف چھیڑا تھا' اسے اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔

قلندر تو مذہب' قانون اور معاشرے کا سہارا لے کر اس کی بہن کو لے گیا تھا۔ اس کے خلاف وہ کیا کرسکتا تھا؟

دو ماہ بعد ماموں پھر ملنے آئے۔ حاصل مراد نے پوچھا۔ "عطیہ کیسی ہے؟"

انہوں نے سر جھکا لیا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "پہلے سے آدھی ہوگئی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی۔ اس کی حالت دیکھتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں مجبور ہوں۔ کمزور ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ آدمی کو کمزور ہی رہنا چاہئے۔ اگر تمہاری طرح شہ زور ہوتا تو لڑائی جھگڑے پر اتر آتا۔ خون خرابہ ہوتا۔ اس کا فائدہ کیا حاصل ہوتا جو نقصانات ہو رہے ہیں وہ میرے تمہارے سامنے ہیں۔"

"میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں لیکن یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ میری بہن تکلیف اور دکھ اٹھائے۔"

ماموں نے جیب سے ایک تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے بڑی مشکلوں سے اس کی یہ تصویر حاصل کی ہے۔ ذرا دیکھو۔"

اس نے بہن کی تصویر کو لے کر دیکھا تو ایک دم سے مرجھا گیا۔ واقعی وہ پہچانی نہیں جارہی تھی۔ گال پچک گئے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں پہلے کی طرح روشن تھیں۔ جیسے مرتے مرتے بھی انسان امید کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ اسی طرح عطیہ کی آنکھیں بھی زندہ تھیں۔

ماموں نے کہا۔ "عطیہ ماں بننے والی ہے اور اس کی صحت دیکھو' پتا نہیں زچگی کے وقت اس کا کیا ہوگا۔ سسرال میں کوئی اس سے ہمدردی کرنے والا نہیں ہے۔ وہاں باڑے میں دو سو بھینسیں ہیں۔ وہ دن رات بھینسوں کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ گوبر اٹھاتی ہے۔ انہیں چارہ ڈالتی ہے۔ ایک ایک بھینس کو نہلاتی ہے۔ صبح سے رات ہوجاتی ہے۔ اسے کمر سیدھی کرنے کی مہلت نہیں ملتی۔ ایک دن مجھ سے کہہ رہی تھی' میں اتنی بڑی دنیا میں اکیلی ہوں۔ کوئی مجھے اس جہنم سے نہیں نکال سکتا۔"

"بس ماموں بس۔ آگے کچھ نہ کہنا ورنہ میں سلاخیں توڑ کر نکل جاؤں گا۔"

"بیٹا! جوانی کا جوش اور جنون یہاں کوئی کام نہیں آئے گا۔ عطیہ ٹھیک کہتی ہے۔"

"کیا کہتی ہے؟"

"یہی کہ بہنوں کو بھائی ملیں تو ہوشمند ملیں۔ کیا بھائی جان کا رشتہ اب میرے کام

آرہا ہے۔ کیا وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھے سوچتے ہوں گے کہ جوش اور جنون میں کسی کو قتل کر دینے کے بعد قاتل کی مائیں اور بہنیں کس طرح بے یار و مددگار رہ جاتی ہیں' کس طرح دنیا والے انہیں ایک قاتل سے منسوب کرکے ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ کسی بھی دشمن سے نمٹنے کے لئے دانشمندی لازمی ہے۔ لوگ غصے کی حالت میں قتل کرتے ہیں اور اسے غیرت کا نام دیتے ہیں۔ بھائی جان نے جو کچھ کیا' اسے حماقت کہیں گے یا غیرت؟"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "عطیہ سے کہیئے وہ بیکار بکواس نہ کیا کرے۔ میں جیل سے رہا ہوتے ہی قلندر سے نمٹ لوں گا۔ بلا سے وہ بیوہ ہو جائے لیکن اس جہنم سے اسے رہائی مل جائے گی۔"

وہ رہائی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ابھی تو صرف ایک برس آٹھ ماہ گزرے تھے۔ پانچ برس چار ماہ تک اسے تقدیر اور قانون کا لکھا ہوا پورا کرنا تھا۔ ابھی تو یہی کہا جا سکتا تھا۔

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔

اور ایک ماہ بعد اسے سکھر جیل منتقل کر دیا گیا۔ ماموں کی آمد و رفت بھی بند ہو گئی۔ وہ نہیں آسکتے تھے مگر جیل کے پتے پر خط لکھ سکتے تھے۔ ان کا خط بھی نہیں آتا تھا۔ چار ماہ تک انتظار کرنے کے بعد اس نے جیلر کی منت و سماجت کی اور اپنا خط اپنے گھر کے پتے پر پہنچانے کا وعدہ لیا۔ اس کا خط گیا۔ پھر تین ہفتے بعد واپس آگیا۔ اس خط پر پوسٹ آفس والوں کی طرف سے ریمارک لکھا ہوا تھا کہ مذکورہ پتے پر کوئی نہیں ہے۔ یعنی ماموں اور ممانی بھی وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ وہاں خط وصول کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس نے ایک بار پھر خط لکھا۔ وہ پھر اسی ریمارک کے ساتھ واپس آیا کہ اس پتے پر خط وصول کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ جیل سے باہر والی دنیا سے اس کا رابطہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اب کسی بھی ذریعے سے اس کی بہن کی خبر نہیں مل سکتی تھی۔ وہ پریشان ہوتا رہا لیکن اس کی پریشانی کا کوئی حل نہیں تھا۔ آخر وہ تھک ہار کر صبر کرنے لگا۔ صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

وہ جیل کی جس کوٹھری میں تھا وہاں تین قیدی اور تھے جو ایک' ایک دو' دو ماہ کے وقفے سے اپنی سزا پوری کرنے کے بعد چلے گئے تھے۔ وہ دو دن تک اس کوٹھری میں تنہا رہا۔ تیسرے دن ایک نیا قیدی وہاں پہنچا دیا گیا۔ وہ حاصل مراد کی طرح قد آور تھا' صحت

مند تھا' اس کے چہرے پر ایسی سختی تھی جیسے پتھر سے تراشا گیا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو تکنے لگے' جیسے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرنا چاہتے ہوں لیکن کسی نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ خاموش ہی رہے۔

سفر بہت طویل ہو تو ایک کمپارٹمنٹ میں دو مسافر زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکتے۔ آخر حاصل مراد نے پوچھا۔ "تم بھی دوسرے قیدیوں کی طرح چلے جاؤ گے۔ یا لمبی چھٹی پر آئے ہو؟"

اس نے بھاری بھرکم آواز میں جواب دیا۔ "ہائیکورٹ میں میرا مقدمہ چل رہا ہے۔"

"قتل یا ڈکیتی؟"

وہ حقارت سے بولا۔ "ہونہہ ڈکیتی تو ننگے بھوکے کرتے ہیں۔ ہم تو غیرت مند لوگ ہیں۔ کوئی ہمیں للکارے تو پہلی فرصت میں اسے قتل کر دیتے ہیں۔"

"قصہ کیا ہے؟"

وہ ہاتھ ایک طرف جھٹکتے ہوئے بولا۔ "پولیس والوں اور وکیلوں کو اپنا قصہ سناتے سناتے بیزار ہو گیا ہوں۔ عدالت میں بھی یہی قصہ چلتا رہا۔ اب تم بھی پوچھ رہے ہو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ مجھے آرام کرنے دو۔"

وہ ایک گوشے میں فرش پر جا کر لیٹ گیا۔ اپنے بازو کا تکیہ بنا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ حاصل مراد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر پہلی بار جیل میں آئے ہو تو نیند نہیں آئے گی۔ تم خود ہی باتیں کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

یہی ہوا۔ وہ نیا قیدی اِدھر سے اُدھر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر جھنجلا کر اٹھ بیٹھا۔ حاصل مراد کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "سنو! میں نے اپنے بہنوئی کو قتل کیا ہے۔"

حاصل مراد کے دل سے ایک آہ نکلی۔ وہ فوراً ہی اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آہ دوست! تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں یہاں سلاخوں کے پیچھے اپنے بہنوئی کو قتل کرنے کے لئے تڑپ رہا ہوں اور تم یہ کام کرکے آئے ہو۔ کیا وہ تمہاری بہن پر ظلم کرتا تھا؟"

"ہاں' میں کراچی کا رہنے والا ہوں۔ اپنی بہن کو یہاں سکھر میں ایک گوالے سے بیاہ دیا تھا۔ سوچا تھا یہ لوگ اچھے کھاتے کماتے ہیں۔ میری بہن خوشحال رہے گی لیکن وہ بڑا

کمینہ نکلا۔ بہت بدمعاش تھا جانے کہاں کہاں جا کر منہ کالا کرتا تھا اور میری بہن کو ایسے قصے سناتا تھا جس سے وہ جلتی کڑھتی تھی۔ اسے فریاد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کچھ بولتی تو وہ اسے بری طرح مارتا تھا۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے یہاں آ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا' میں اپنی بہن کو لے کر کراچی چلا گیا۔ سوچا تھا' وہ صلح صفائی پر آمادہ ہو جائے گا لیکن اس نے پلٹ کر میری بہن کی خبر نہیں لی۔ تب ہم نے طلاق کا مطالبہ کیا۔ ہماری کوشش تھی کہ طلاق ہو جائے تو اب کی بار کسی اچھے لڑکے سے بیاہ دیں گے لیکن وہ کمبخت اسے طلاق دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ کہتا تھا میری بیوی کو واپس بھیج دو یا شوہر کے بغیر اپنے ہی گھر میں رہنے دو۔"

"تمہاری بہن عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کر سکتی تھی۔"

"ہاں' وہ تو ہو جاتی مگر اس سے پہلے ہی اس نے اپنے وکیل کے ذریعے نوٹس بھیجا تھا کہ اس کی بیوی مسمات نور بیگم پچیس ہزار کے زیورات لے کر اپنے میکے گئی ہے۔ چھ ماہ ہو گئے واپس نہیں آئی۔ اسے زیورات کے ساتھ واپس بھیجا جائے۔ بڑا چالاک تھا۔ ایک تو اس نے مہر کی رقم پچیس ہزار روپے ادا نہیں کئے۔ دوسرے پچیس ہزار روپے کے زیورات کا الزام لگا دیا۔ اب ہم قانون کے بکھیڑوں میں کہاں الجھنے جاتے۔ لہٰذا میں ایک رات چپکے سے سکھر پہنچ گیا۔ ارادہ تھا' چپ چاپ اسے قتل کر کے آ جاؤں گا۔ کسی کو خبر نہیں ہو گی لیکن مقدر خراب تھا۔ میں قتل کرنے اس کے کمرے میں پہنچ گیا لیکن وہ بڑا جی دار نکلا۔ مجھ سے مقابلہ کرنے لگا۔ میں بھی اس سے کم نہیں تھا۔ اسے چاقو مارنے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن ہنگامے کی وجہ سے تمام محلے والے آ گئے اور میں وہاں سے فرار نہ ہو سکا۔"

"بہرحال تم اسے قتل کرنے میں تو کامیاب ہو گئے؟"

"ہاں میری بہن کو اس ظالم سے نجات مل گئی ہے۔ پہلے وہ طلاق لیتی تو مطلقہ کہلاتی۔ اب بیوہ کہلا رہی ہے' کوئی فرق نہیں پڑتا' دوسری شادی کرنے کے لئے آزاد تو ہو گئی ہے۔"

حاصل مراد نے کہا۔ "ویسے یہ گوالے نرے جاہل اور گنوار ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں لڑکیوں کا رشتہ نہیں کرنا چاہئے۔"

نئے قیدی نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر غرا کر کہا۔ "اے! منہ سنبھال کر بات کرو۔

میں بھی گوالا ہوں۔ لانڈھی میں میرا سب سے بڑا باڑا ہے۔ میرے ہاں دو سو دس بھینسیں ہیں۔"

حاصل مراد کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اب تب میں پہچان لینے کے بعد جھپٹنا چاہتا ہو۔ اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے جیل کی قمیض پر لکھے ہوئے نمبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں نام نہیں' نمبر بلایا جاتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" حاصل مراد غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سیدھی طرح بتاؤ' تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ نیا قیدی بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پینترا بدلتے ہوئے بولا۔ "جو مجھ سے اکڑ کر باتیں کرتا ہے' میں اس کا منہ توڑ دیتا ہوں۔"

اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہارا نام قلندر ہے؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی حاصل مراد نے اس کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے دیوار سے جا کر لگ گیا۔ مراد نے فوراً ہی آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ "ذلیل انسان! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

قلندر نے اس کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے ذرا کمزور پڑ گیا۔ اس نے اپنے سر سے اس کے سر کو ٹکر مارتے ہوئے پوچھا۔ "پاگل کے بچے! یہ اچانک تجھے کیا ہو گیا ہے۔ آخر تُو کون ہے؟"

"میں ہوں تمہاری موت۔ حاصل مراد۔" یہ کہتے ہوئے اس نے قلندر کو اپنے داؤ میں لا کر پٹخ دیا۔ پھر اس کے اٹھنے سے پہلے پیچھے سے گرفت میں لے کر اس کا گلا دبانے لگا۔ قلندر ہاتھ پاؤں جھٹک رہا تھا۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ "میری دعا قبول ہو گئی۔ تقدیر نے تجھے مرنے کے لئے میرے پاس بھیج دیا ہے۔ تُو نے اپنی بہن کو ظالم بہنوئی سے نجات دلائی۔ میں آج اپنی بہن کو نجات دلا رہا ہوں۔"

جیل خانے کی وہ کوٹھریاں راستے کے دونوں طرف تھیں۔ ایک کوٹھری کے قیدی

اپنے سامنے والی کوٹھری کے قیدیوں کو صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔ سامنے والے قیدیوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ "ارے دیکھو' دیکھو دو قیدی لڑ پڑے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی جان لے کر رہیں گے۔"

ایسا شور برپا ہوا کہ سپاہی چلے آئے۔ انہوں نے پہلے سلاخوں کے باہر سے دھمکی دی۔ "اے' الگ ہو جاؤ۔ فوراً الگ ہو جاؤ۔ ورنہ پٹائی ہو گی۔"

لیکن حاصل مراد اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پوری قوت سے اس کا گلا دبوچ رہا تھا۔ آخر انہوں نے آہنی دروازے کو کھولا۔ پھر اندر پہنچ کر دونوں کو ڈنڈے مارنے شروع کیے۔ انہیں کھینچ کھینچ کر ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ قلندر زمین پر پڑا گہری سانسیں لینے لگا۔ وہ غرا کر حاصل مراد کو دیکھتا جا رہا تھا۔ مراد سپاہیوں کی گرفت سے نکلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسے گالیاں دے رہا تھا۔ قتل کرنے کی دھمکیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔ نائب وارڈن نے آ کر اسے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ پھر پوچھا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔ تم تو یہاں بڑے خاموش رہتے تھے۔ کسی قیدی سے الجھنا تو دور کی بات ہے۔ بات بھی نہیں کرتے تھے۔ پھر اس سے کیوں لڑ رہے ہو؟"

"جیلر صاحب! یہ اپنے بہنوئی کو قتل کر کے آ رہا ہے لیکن اس سے پہلے یہ میری بہن کو آہستہ آہستہ قتل کرتا رہا ہے۔ میں مجبور ہوں۔ یہاں سے باہر جا کر اپنی بہن کے دکھ درد میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کے کسی کام نہیں آ سکتا اور یہ ایسا بھوت ہے جو باتوں سے نہیں لاتوں سے مانتا ہے۔"

وارڈن نے اپنی بید کو نچاتے ہوئے سپاہیوں سے کہا۔ "انہیں الگ رکھو۔ ایک سو تیرہ کو سامنے والے سیل میں ڈال دو۔"

سپاہی قلندر کو پکڑ کر اس کوٹھری سے باہر لے گئے اور سامنے والی کوٹھری کا دروازہ کھول کر وہاں اندر دھکیل دیا۔ دونوں کوٹھریوں کے دروازے مقفل کر دیئے گئے۔

لیکن حاصل مراد اب بدترین عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا شکار ہاتھ سے نکل گیا تھا اور نکل کر سامنے والی کوٹھری میں پہنچ گیا تھا۔ اُدھر بھی آہنی دیوار اور اِدھر بھی آہنی دیوار تھی۔ بیچ میں کوریڈور دریا کی طرح گزر رہا تھا۔ وہ دو کناروں کی طرح تھے ایک دوسرے کی شہ رگ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

جیلر اور سپاہیوں کے جانے کے بعد حاصل مراد نے سلاخوں کو مٹھیوں سے بھینچتے

ہوئے کہا۔ "تم قسمت کے اچھے ہو جو بچ کر یہاں سے وہاں چلے گئے مگر کب تک اپنی خیر مناؤ گے۔ ہم روز جیل سے باہر پتھر توڑنے کے لئے جاتے ہیں۔ وہاں میں تم سے نمٹ لوں گا۔"

وہ غصے سے بولا۔ "جا جا' تیرے جیسے نمٹنے والوں کو میں چٹکی میں مسل دیتا ہوں۔ جیل سے باہر جا کر پتھر توڑنے سے پہلے میں تیرا سر توڑ دوں گا۔"

حاصل مراد پیچ و تاب کھاتا رہا۔ وہ رات اس نے بڑی مشکل سے کاٹی۔ بار بار کروٹیں بدلتا رہا اور سامنے والی کوٹھری کی طرف دیکھتا رہا۔ دوسری طرف قلندر ایسی حرکتیں کرتا تھا' ایسی بولی بولتا تھا کہ وہ انگاروں پر لوٹنے لگتا تھا۔ آخر وہ رات گزر گئی۔ دوسرے دن مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں قیدی مشقت کے لئے باہر جانے لگے۔ ان میں ایسے قیدی نہیں تھے جن کے مقدمات زیر سماعت تھے۔ ایسے قیدیوں کو جیل کے اندر ہی کسی کام پر لگایا جاتا تھا۔ ان میں قلندر بھی تھا۔

حاصل مراد کی یہ حسرت پوری نہ ہوئی کہ باہر جا کر اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملے گا۔ شام کے وقت پھر انہیں جانوروں کی طرح پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ قلندر نے سلاخوں کے پیچھے سے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تیری حسرت دل ہی میں رہے گی۔ ارے مجھے موت نہیں مار سکتی' تو کیا مارے گا۔ دیکھ لینا' میں مقدمہ جیت لوں گا۔ یہاں سے چھوٹ کر جاتے ہی تیری بہن کی وہ درگت بناؤں گا کہ تو یہاں سنتا رہے گا اور تلملاتا رہے گا۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولا۔ "مرد کا بچہ ہے تو مرد سے پنجے لڑا۔ ایک کمزور عورت پر کیا ظلم کرتا ہے۔"

وہ دونوں پھر چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے اور چیلنج کرنے لگے۔ جیلر نے آ کر کہا۔ "میں تم دونوں کی باتیں بہت دیر سے سن رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں۔ یہ ایک سو تیرہ تمہاری بہن کا حوالہ دے کر تمہیں اشتعال دلا رہا ہے لیکن صبر کرو یہ بہت جلد پھانسی پانے والوں کی کوٹھری میں پہنچا دیا جائے گا۔"

حاصل مراد نے کہا۔ "جیلر صاحب! اس وقت تک یہ بدمعاش مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔"

"ٹھیک ہے' میں اسے دوسری جگہ منتقل کر دیتا ہوں۔"

اسی وقت قلندر کو دوسری کوٹھری میں بھیج دیا گیا۔ اب وہ نظر تو نہیں آتا تھا لیکن

کبھی کبھی اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ حاصل مراد نے پھر جیلر سے شکایت کی۔ جیلر نے کہا۔ "اس کا مقدمہ چل رہا ہے۔ بار بار عدالت میں پیشی ہوتی ہے۔ اگر ہم اسے زیادہ ماریں گے اور اس کے جسم پر کوئی نشان آئے گا تو ہمیں جواب دہ ہونا پڑے گا۔ لہٰذا تم صبر کرو۔"

☆-----☆------☆

ایک ہفتے بعد جیلر نے بتایا۔ "کوئی امان اللہ صاحب تم سے اور قلندر سے ملنے آئے ہیں۔ ابھی وہ قلندر کے پاس گئے ہیں۔ اس کے بعد تمہارے پاس آئیں گے۔"

وہ ذہن پر زور دے کر سوچنے لگا یہ امان اللہ صاحب کون ہیں؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نام کے کسی شخص کو وہ جانتا ہے۔ بہرحال' اتنا تو تھا کہ ایک عرصے کے بعد کوئی اجنبی ہی سہی اس سے ملنے تو آ رہا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جو شخص ملنے آیا۔ اسے دیکھتے ہی حاصل مراد چونک گیا۔

وہ اندھی شبانہ کا باپ تھا۔ اس نے کہا۔ "میرا نام امان اللہ ہے۔ تم مجھے اس ہوٹل میں دیکھ چکے ہو۔ جہاں اپنے دوست کے ساتھ بیٹھے میری بیٹی کا ذکر کر رہے تھے اور میں نے بڑی شرافت سے تمہیں سمجھایا تھا کہ بیٹے کوئی کتنا ہی شہ زور ہو۔ حالات کبھی نہ کبھی اسے کسی نہ کسی معاملے میں کمزور بنا دیتے ہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا' تم سرِعام میری بیٹی کا ذکر کر رہے ہو لیکن میں تمہارا گریبان نہیں پکڑ سکتا۔ آج تمہاری بہن کے ساتھ وہ شخص جو کچھ کر رہا ہے' تم اس کا گریبان نہیں پکڑ سکتے۔ ایسا دنیا میں ہوتا ہے لیکن جوانی اور غرور میں لوگ بوڑھوں کی نصیحتوں کو سمجھنا نہیں چاہتے۔"

حاصل مراد نے ناگواری سے کہا۔ "اچھا تو آپ مجھے شرمندہ کرنے آئے ہیں لیکن آپ یہ بھول رہے ہیں کہ میں چار برس پانچ ماہ کے بعد پھر جیل سے نکلوں گا۔ اس وقت اپنی بہن پر ہونے والے ظلم کا حساب کروں گا۔ کسی ظالم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری دعا ہے کہ قلندر کو سزائے موت نہ ہو۔ وہ میرے ہاتھوں سے مرنے کے لئے یہاں سے زندہ جائے۔"

بڑے میاں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اسے قتل کر کے ایک بار پھر جیل میں آؤ گے۔ شاید سزائے موت پاؤ گے اور اپنی بہن کو ایک بار پھر دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو

گے۔ قلندر نہیں رہے گا' دوسرے بہت سے قلندر تمہاری بہن کو چین سے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ کیا انتقام لینے سے بات بنتی ہے۔ نہیں بیٹے! بگڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے' اچھا ہی کرتا ہے۔ تمہیں اتنے برس کی سزا ملی ہے۔ یہاں جیل کی تنہائی میں بیٹھ کر اپنے حالات پر غور کرو۔ زندگی گزارنے کا سلیقہ کیا ہوتا ہے' اس پر سوچو۔ تمہاری سمجھ میں آئے گا کہ بہن اور بیٹی والے کبھی جوش اور جنون میں مبتلا نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ یہی ہوتا ہے جو تمہارے اور قلندر کے ساتھ ہوا ہے۔"

وہ منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ بڑے میاں نے کہا۔ "میں تمہیں شرمندہ کرنے نہیں آیا ہوں' بلکہ تمہاری بہن کے حالات بتانے آیا ہوں۔"

اس نے چونک کر بڑے میاں کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "آپ عطیہ کے بارے میں جانتے ہیں؟"

"ہاں' اسی لئے تو قلندر سے بھی ملنے آیا ہوں۔ جب سے یہ گرفتار ہوا ہے اور اس پر مقدمہ چل رہا ہے' تب سے عطیہ میرے پاس ہے۔"

اس نے ایک بار پھر چونک کر بڑے میاں کو دیکھا۔ اب اس کی نظریں جھک گئیں۔ کیونکہ اس کی بہن ان کی پناہ میں تھی۔ اس نے آہستگی سے پوچھا۔ "وہ آپ کے پاس کیسے پہنچ گئی؟"

"قلندر کے گھر والوں نے اسے مار پیٹ کر نکال دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں جب قلندر مقدمہ جیت لے گا' زندہ سلامت واپس آ جائے گا تو وہ عطیہ کو رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کرے گا۔ اس وقت تک وہ لوگ اسے برداشت کرنا نہیں چاہتے۔"

انہوں نے سر جھکا کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بہن بہت بیمار ہے۔ اتنی بیمار کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔ وہ اپنی سسرال سے نکل کر تمہارے گھر گئی تھی۔ وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ پھر وہ ہمارے یہاں آئی۔ کہنے لگی' کسی طرح اسے بھائی سے ملایا جائے۔ میں نے اسے تسلیاں دیں اور اس کو سمجھایا۔ جب تک وہ اچھی طرح علاج نہیں کرائے گی' اس وقت تک میں اسے گھر سے نکلنے نہیں دوں گا۔ وہ میری بیٹی کی سہیلی ہے اور میرے لئے بیٹی کی طرح ہے۔ لہٰذا میں اس کا علاج کر رہا ہوں۔"

"ماموں' ممانی کہاں ہیں؟"

"وہ تو عرصہ ہوا' گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ وہاں تمہارے جو وی سی آر رکھے ہوئے

تھے۔ ان میں سے ایک خراب ہے۔ تمہارے ایک دوست نے دو وی سی آر امانت کے طور پر اپنے پاس رکھے ہیں۔ جب تم آؤ گے تو تمہیں دے دیئے جائیں گے۔ باقی دو وی سی آر تو تمہارے ماموں نے فروخت کر دیئے اور رقم لے کر کہیں چلے گئے۔"

اس نے دانت بھینچ کر زیر لب کچھ کہا۔ بڑے میاں نے کہا۔ "تم پھر غصے میں آ رہے ہو۔ غصہ تھوک دو۔ انسان ہر جگہ شہ زور نہیں ہوتا مگر ہر جگہ ذہین ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے۔ آزمائشوں سے گزرتے وقت ہمیشہ طاقت کام نہیں آتی' عقل کام آتی ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "عطیہ اب کیسی ہے؟"

"ہم علاج کرا رہے ہیں مگر اب تک کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ویسے وہ طلاق لینے پر تلی ہوئی ہے۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ ایسے شخص کے ساتھ وہ زندگی نہیں گزار سکے گی۔ میں اسی لئے قلندر سے ملنے آیا ہوں۔"

"جب قلندر کے گھر والوں نے اسے نکال ہی دیا ہے تو پھر قلندر کو طلاق دے دینا چاہئے۔"

"میں کیا کہوں۔ وہ بہت ہی بدمزاج ہے۔ عطیہ کا نام لیتا ہوں تو گالیاں دے کر بات کرتا ہے۔ کہتا ہے' اب عطیہ کے ساتھ ساتھ تم سے بھی انتقام لے گا اور تمہاری بہن کو طلاق نہیں دے گا۔"

"آپ کسی طرح اسے سمجھائیے۔"

"میں نے اسے بار بار سمجھایا کہ تمام گواہ اس کے خلاف بیان دے رہے ہیں اور قتل کے سلسلے میں ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ لہٰذا اس سے پہلے ہی عطیہ کو رہا کر دے۔ یہ سزائے موت سے پہلے بہت بڑی نیکی ہوگی۔ اس طرح وہ کفارہ ادا کر دے گا۔"

حاصل مراد نے دانت پیسنے کے بعد کہا۔ "وہ بدمعاش ہم بہن بھائی سے انتقام لینے کے لئے طلاق نہیں دے گا جب تک خود قید میں ہے' عطیہ کو بھی اپنی قید میں رکھے گا۔"

انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خدایا! تیرے بندوں کی آنکھ وقت سے پہلے کیوں نہیں کھلتی۔ یہ ٹھوکر کھاتے ہیں' سزائیں پاتے ہیں۔ موت کے منہ میں جانے والے ہوتے ہیں لیکن طاقت کے غرور میں مبتلا رہتے ہیں۔ انہیں عبرت کیوں نہیں حاصل ہوتی؟ یہ توبہ کیوں نہیں کرتے؟ آخری وقت اپنے کان

کیوں نہیں پکڑتے؟"

حاصل مراد نے کہا۔ "میری بہن آپ کے پاس مدد حاصل کرنے آئی' آپ اس کی مدد کررہے ہیں۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں لیکن میں زیادہ عرصے تک کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتا۔ آپ نے ابھی بتایا تھا کہ میرے کسی دوست کے پاس میرے دو وی سی آر رکھے ہوئے ہیں۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"اس کا نام وکی ہے۔"

"آپ مہربانی فرما کر وکی سے ملاقات کریں۔ میری طرف سے کہہ دیں کہ دونوں وی سی آر روزانہ سو روپے کے حساب سے کسی کو ٹھیکے پر دے دے۔ سو روپے روزانہ آمدنی ہوگی تو میری بہن کا علاج اچھی طرح ہوسکے گا اور وہ آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بنے گی۔"

"تم کہتے ہو تو ایسا ضرور کروں گا لیکن اچھی باتیں سمجھانا میرا فرض ہے۔ یہ وی سی آر کا کاروبار ایک تو ناجائز ہے' غیر قانونی ہے' غیر اخلاقی ہے' سنا ہے بڑی شرمناک فلمیں دکھائی جاتی ہیں جس گھر میں بھی فلمیں چلانے کے لئے تمہارا وی سی آر جاتا ہوگا وہاں کی بہنیں اور بیٹیاں ہوں گی۔ ایسی حرام کی کمائی سے تو بہتر ہے' تمہاری بہن میرے یہاں حلال کی روکھی روٹی کھائے۔"

"میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میری بہن آپ کے رحم و کرم پر ہے۔ اس لئے جو درخواست کرتا ہوں' وہ کیجئے یا پھر وکی اور میرے دوست قیصر اور بشیر وغیرہ کو میرا پیغام پہنچا دیجئے' ان میں سے کوئی بھی آکر مجھ سے ملاقات کرے۔ میں وی سی آر ان کے حوالے کردوں گا اور وہ میری بہن کو رقم پہنچاتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے میرے دوستوں کے خاندان میں کوئی ایسی ضرورت مند عورت ہو جو معقول رقم لے کر میری بہن کی سرپرست بننے پر آمادہ ہو جائے اور اس کے ساتھ میرے گھر میں آکر رہے۔"

"بیٹے! تم اتنی دور کی باتیں نہ سوچو۔ تم جیسا کہہ رہے ہو' ویسا ہی کروں گا۔ جب تک جیل سے رہا ہو کر نہیں آؤ گے' عطیہ میری بیٹی بن کر میرے پاس رہے گی۔"

وہ جانے لگے تو اس نے کہا۔ "سنئے!"

وہ رک گئے' پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"وہ عطیہ؟" وہ کہتے ہوئے ہچکچانے لگا۔

بڑے میاں نے کہا۔ "پوچھو' کیا بات ہے؟"

"عطیہ ماں بننے والی تھی' کیا ہوا؟"

"بات پرانی ہوچکی ہے' بچہ پیدا ہوا تھا' مرگیا' یہی صدمہ اسے روگ کی طرح لگ گیا ہے۔ ہمیشہ نڈھال رہتی ہے۔ میں سمجھاتا ہوں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے وہ زندگی سے مایوس ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے صرف دوا سے مریض اچھا نہیں ہوتا۔ اپنے اعتماد سے بھی اچھا ہوتا ہے اور عطیہ کا اعتماد اپنے اوپر سے ختم ہوگیا ہے۔"

وہ چلے گئے۔ دو ماہ بعد وکی کا ایک خط آیا۔ اس نے لکھا تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے اب تک تم سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے ڈیڈی کے کاروبار میں بہت الجھا ہوا تھا۔ بہرحال وہ بڑے میاں امان اللہ صاحب میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے تمہارا پیغام دیا تھا اس کے مطابق میں نے تمہارے دونوں وی سی آر ٹھیکے پر دے دیئے ہیں جو بھی آمدنی ہوا کرے گی' وہ میں عطیہ بہن تک پہنچا دیا کروں گا۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بے جھجک بتاؤ۔ میں تمہیں خط لکھتا رہوں گا۔"

اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے دوسرے دوست قیصر اور بشیر وغیرہ بھی اسے خط لکھنے لگے۔ تقریباً دس ماہ کے بعد قلندر کے خلاف مقدمے کا فیصلہ ہوا۔ اسے سزائے موت سنا دی گئی اور اس کے ساتھ ہی اسے جیل خانے کے اس حصے میں منتقل کردیا گیا جہاں پھانسی پانے والے مجرم رکھے جاتے تھے۔

ایک سال بعد قیصر نے خط میں لکھا۔ "بڑے افسوس کے ساتھ میں یہ لکھنے پر مجبور ہوں کہ تمہاری بہن عطیہ اب اس دنیا میں نہیں رہی' ایک طویل عرصے تک بیمار رہ کر' زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر آخر وہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمہیں یہ خبر سن کر کتنا صدمہ ہوگا۔ ہم تم سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتے تھے۔ آج نہیں تو کل تمہیں یہ معلوم ہونا ہی تھا تو کیوں نہ تم جیل کی تنہائیوں میں بیٹھ کر اپنی بہن کا ماتم کرلو تاکہ وہاں سے واپس آؤ تم تمہارے آنسو کسی حد تک خشک ہوچکے ہوں۔"

اس کی آنکھ سے آنسو نہیں نکلے لیکن وہ جیل خانے کی کوٹھری کو.......... خالی خالی آنکھوں سے تکتا رہا۔ یوں تو وہ اپنی بہن کو ایک حد تک چاہتا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے اسے بے حد چاہتا تھا۔ سینے میں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خالی ہوگیا ہو۔ اتنی بڑی دنیا میں مقدس رشتے کی ایک ہی محبت تھی جو اس دنیا سے اٹھ گئی تھی۔ سینہ خالی ہوگیا تھا۔

دن گزرنے لگے رفتہ رفتہ حاصل مراد کو محسوس ہونے لگا جیسے دماغ سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ بہن اتنی بڑی ذمہ داری تھی جس کے بوجھ تلے وہ انجانے طور پر دبا رہتا تھا۔ اب وہ آزاد تھا۔ باہر کی کھلی دنیا میں رہے یا جیل خانے میں' اب اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

ایک ہفتے بعد وکی کا خط آیا اس کے لفافے میں دو عدد خط تھے۔ وکی نے لکھا تھا۔ "تمہاری بہن نے مرنے سے پہلے ایک خط تمہارے نام لکھا تھا۔ اس خط کو امان اللہ صاحب نے اپنے پاس رکھا تھا۔ مجھے بلا کر کہنے لگے کہ اسے میں تمہارے پاس پہنچا دوں۔ وہ تمہیں نہ تو خط لکھنا چاہتے ہیں' نہ تمہارے پاس آنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ عطیہ کے متعلق جانے کیا کچھ بتانا چاہتے ہیں لیکن کہتے ہیں' تمہاری بہن نے مرنے سے پہلے انہیں قسم دی تھی اور انہیں اپنے سلسلے میں زبان بند رکھنے پر مجبور کیا ہے۔ میں نہیں جانتا' معاملہ کیا ہے۔ بہرحال تم اپنی بہن کا خط پڑھ لو۔"

اس نے دوسرا خط کھول کر پڑھا۔ عطیہ نے لکھا تھا۔ "بھائی جان! میں زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہوں۔ آپ کے جیل جانے کے بعد میں نے جیسی بدترین زندگی بسر کی ہے' خدا ویسی زندگی کسی دشمن کو بھی نہ دے۔

میں نے تنگ آکر اپنے شوہر سے طلاق لینے کی کوششیں کیں۔ انکل امان اللہ نے میری طرف سے بھرپور کوشش کی۔ قلندر کو سمجھایا لیکن وہ طلاق پر آمادہ نہیں ہوا۔ اب اگر وہ راضی بھی ہو جائے تو میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں سمجھتی ہوں' جتنی دیر میں اس کے منہ سے طلاق کا لفظ نکلے گا اتنی دیر میں شاید میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی۔

آپ کو یاد ہے' پہلی بار جب میں آپ سے جیل میں ملاقات کرنے آئی تھی اور میں نے شبانہ کا ذکر کیا تھا تو آپ نے منہ پھیر کر کہا تھا۔ کوئی دوسری بات کرو۔ آپ کے اس رویے سے ظاہر ہو گیا تھا کہ آپ شبانہ سے محبت نہیں کرتے۔ بعد میں قیصر سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ آپ کا جگری دوست ہے۔ میں نے اس سے باتوں ہی باتوں میں حقیقت اگلوا لی۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے شبانہ کو محبت کا فریب دیا تھا۔ بھائی جان! آپ بے ایمان اور بدنیت تھے۔

یہ باتیں سن کر میرا سر شرم سے جھک گیا۔ بھائی جان! یہ ہماری دنیا میں کیا ہو رہا

ہے؟ میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو آپ غصے سے تلملانے لگتے ہیں جیسے دنیا کی ساری عزت اور سارا مرتبہ آپ کی بہن کے لئے ہو اور دنیا کی ساری عورتیں محض لوٹ کھسوٹ کے لئے رہ گئی ہوں۔

میں نے اپنے آخری وقت' یہ عہد کیا ہے کہ جب آپ اسے اپنی شریکِ حیات نہیں بنا سکتے تو اب آپ کو اسے بہن کہنا ہوگا' اس کی عزت کرنی ہوگی' اسے وہی مان اور مرتبہ دینا ہوگا جو آپ مجھے دیتے رہے اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو میرے مرنے کے بعد ایسا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ میری روح شبانہ کے اندر سما جائے گی اور وہ آپ کو کبھی بری نیت سے شبانہ کے قریب نہیں آنے دے گی۔"

اگرچہ حاصل مراد کو اپنی بہن کی موت کا صدمہ تھا لیکن ایسے فقرے پڑھ کر وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔ یہ کیسی احمقانہ باتیں لکھی ہوئی تھیں کہ مرنے کے بعد اس کی روح شبانہ میں سما جائے گی۔

آگے چل کر اس نے لکھا۔ "بھائی جان! انسان چاہے جتنی طویل عمر گزار لے مرتے وقت ایسا ہی لگتا ہے جیسے بہت مختصر سی عمر گزار کر دنیا سے جا رہا ہو لیکن جو لوگ دوسروں کے کام آتے ہیں' نیکیاں کرتے ہیں' وہ مرنے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ میں بھی ایسی نیکی یہاں سے کر کے جاؤں گی کہ اپنے مرنے کے بعد بھی زندہ رہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے جب بھی آپ جیل سے رہا ہو کر آئیں گے۔ میں آپ سے ملوں گی چاہے موت مجھے آپ سے کتنی ہی دور لے جائے۔ فقط۔ "آپ کی پگلی بہن عطیہ۔"

اس کا خط پڑھ کر یہی لگ رہا تھا کہ شوہر اور سسرال والوں کے مسلسل ظلم نے اور دکھ بیماریوں نے اسے صرف جسمانی طور پر ہی نہیں' ذہنی طور پر بھی کمزور کر دیا تھا اور وہ آخری وقت میں بہکی بہکی باتیں کیا کرتی تھی۔ ایسی ہی باتیں اس نے خط میں بھی لکھی تھیں۔

اس نے دل ہی دل کہا۔ عطیہ کا دماغ چل گیا تھا۔ یہ سراسر احمقانہ بات ہے۔ شبانہ کو میں نے جس نظر سے دیکھا تھا' اب اس کے بعد اسے بہن تو نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ اپنا دل کبھی گوارا ہی نہیں کرے گا۔

ویسے یہ ضروری نہیں ہے کہ زبان سے کسی کو بہن کہا جائے۔ صرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جائے جن میں حیا ہوتی ہے' حجاب ہوتا ہے۔ ایک ہی دفتر میں آمنے سامنے کام

کرنے والی لڑکی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا مگر حجاب ہوتا ہے اور حجاب سے بڑھ کر کوئی پردہ' کوئی چلمن' کوئی چادر' کوئی نقاب نہیں ہوتا۔

دو ماہ کے بعد قلندر کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کی وجہ سے انتقام کی جو آگ بھڑکتی رہتی تھی' وہ سرد ہوگئی۔ ایک بہن' عطیہ کی زندگی کا وہ باب بالکل ختم ہوگیا۔ اب وہ سکون سے جیل میں تھا۔ کسی کی فکر نہیں تھی' کوئی ذمے داری نہیں تھی۔ جب انسان ہر طرح سے آزاد ہو جاتا ہے تو پھر جہاں بھی رہتا ہے' آسودہ رہتا ہے۔ وقت کا حساب نہیں کرتا۔ ایک لمحہ اگر صدیوں کی طرح گزرتا ہے تو گزرے اور صدیاں ایک لمحے میں گزر جاتی ہیں' تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اور اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سزا کے دن پورے ہوگئے اور وہ جیل سے باہر آگیا۔ اس دوران وہ مختلف جیلوں میں منتقل ہوتا رہا تھا۔ اپنے دوستوں سے خط و کتابت جاری رہتی تھی۔ آخری بار رہا ہونے سے کوئی چار ماہ پہلے اسے پھر کراچی کی سینٹرل جیل میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے دوست اسے لینے آئے تھے۔ جب وہ رہا ہو کر باہر نکلا تو سب نے اسے باری باری گلے لگایا۔ پھر اسے لے کر ایک ریستوران میں پہنچ گئے۔ حاصل مراد نے کہا۔ "دوستو! تم سب ہی بہت بدل گئے ہو۔ اگر خود مجھ سے ملنے نہ آتے تو میں بڑی مشکلوں سے تمہیں پہچانتا۔"

وکی نے کہا۔ "سات برس کچھ کم نہیں ہوتے۔ ہمارے صرف چہروں پر ہی نہیں' جسموں اور ذہنوں میں بھی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ سوچنے کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ سچ پوچھو تو وہ جوانوں جیسی جوشیلی گرمی نہیں رہی۔ کیونکہ اب ہم نے اپنے اپنے گھروں کا بوجھ اٹھانا شروع کردیا ہے۔ میں اپنے ڈیڈی کا کاروبار سنبھال رہا ہوں۔ بشیر' ٹیکسی چلا رہا ہے اور قیصر ایک بینک میں ملازمت کررہا ہے۔"

قیصر نے کہا۔ "صرف ہماری بات کیا پوچھتے ہو' وہ تمہاری جتنی گرل فرینڈز تھیں' ان میں سے بھی تقریباً سب کی شادیاں ہوگئیں۔ کوئی ایک بچے کی اور کوئی دو کی اور کوئی پانچ پانچ بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔"

بشیر نے کہا۔ "بھئی اسے مایوس کیوں کرتے ہو' شبانہ نے شادی نہیں کی ہے' شاید اسی کے انتظار میں بیٹھی ہے۔"

وکی نے کہا۔ "ارے ہاں' یار تمہیں تو بتانا ہی بھول گئے۔ وہ اب اندھی نہیں رہی۔

اس کے باپ نے اپنی بیٹی کو آنکھیں دلانے کے لئے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے۔ آخر اسے بینائی مل ہی گئی۔"

حاصل مراد ان کی باتیں سن رہا تھا اور تصور میں شبانہ کو دیکھ رہا تھا۔ سات برس تک جیل کی چاردیواری میں بند رہنے کے بعد پہلی بار وہ اپنے دوستوں کی زبان سے اس قسم کی باتیں سن رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا تصور بھی قائم ہوتا جارہا تھا۔ جیل ایک ایسی جگہ ہے جہاں آدمی اکیلا رہنا سیکھ جاتا ہے اور اسے سیکھنا ہی پڑتا ہے۔ باہر آنے کے بعد یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ عورت کے متعلق سوچتے ہو تو وہ اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے۔ اسے دماغ سے نکال دو' زندگی کے دوسرے معاملات میں خود کو مصروف رکھو تو پھر ہوس باقی نہیں رہتی۔ صرف ایک ایسی عورت کی چاہت رہ جاتی ہے جو گھر سنبھال سکے اور ہمارے بچوں کی ماں ہو۔

بہرحال' وہ ایک عرصے کے بعد پھر عورت کا ذکر اپنے پرانے انداز میں سن رہا تھا اور اس کے اندر کا آتش جوان ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "شبانہ کا باپ مجھ سے ملنے جیل میں کیوں نہیں آیا۔ وہ مجھ سے کیوں کترا رہا ہے؟"

ایک نے کہا۔ "تم خود ہی بڑے میاں سے مل کر پوچھ لو۔"

دوسرے نے کہا۔ "بھئی اس کی بیٹی بھی تو تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

تیسرے نے کہا۔ "یہ بات نہیں ہے۔ پہلے وہ اندھی تھی۔ اس کا رشتہ نہیں آتا تھا۔ اب کوئی رشتہ آنے سے پہلے تم رہا ہو کر آگئے ہو۔"

حاصل مراد نے خلا میں تکتے ہوئے پوچھا۔ "اب وہ کیسی لگتی ہے؟"

"پتا نہیں' ہم نے تو اسے دیکھا نہیں ہے۔ تم نے جب دیکھا تھا تو تمہاری ہی زبان سے اس کی بے حد تعریفیں سنی تھیں۔ وہ پردے کی بے حد پابند ہے' گھر سے نکلتی ہے تو سر سے پاؤں تک برقعے میں چھپی ہوتی ہے۔"

"اب چلنا چاہئے۔" حاصل مراد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے گھر کی چابیاں کس کے پاس ہیں؟"

"وہی شبانہ کے والد تمہارے گھر کی نگرانی کرتے ہیں۔ چابیاں ان کے پاس ہیں۔"

وہ ریستوران سے باہر آگئے۔ ایک نے کہا۔ "پہلے تو تم چوری چھپے اس چلمن کے پاس جایا کرتے تھے اب بے جھجک اس کے دروازے پر دستک دے سکتے ہو۔ شبانہ تو کیا'

اس کے باپ سے بھی باتیں کر سکتے ہو۔"

اس کے دوست' بشیر کی ٹیکسی میں آئے تھے۔ انہوں نے اسی ٹیکسی میں اسے امان اللہ صاحب کی گلی میں پہنچا دیا۔ پھر ملنے کا وعدہ کر کے اس سے رخصت ہو گئے۔ اس نے دور ہی سے وہی دروازہ اور وہی کھڑکی دیکھی جس پر پلاسٹک کی چلمن آج بھی پڑی ہوئی تھی۔ اسے اپنی بہن کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کہا تھا۔ "پردہ چلمن سے نہیں ہوتا' عورت کے حجاب سے اور مرد کی اچھی نیت سے ہوتا ہے۔"

اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "دنیا میں بے شمار لڑکیاں ہیں اور بے حد خوبصورت لڑکیاں ہیں' ایک شبانہ نہ سہی۔ اب شبانہ کو بھول ہی جانا چاہئے۔"

اس نے چلمن کو نظرانداز کرتے ہوئے' کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے دروازے پر آکر دستک دی پہلی دستک پر خاموشی رہی۔ دوسری دستک پر اندر سے امان اللہ صاحب کی آواز سنائی دی۔ "ٹھہرو بھئی ٹھہرو' آرہا ہوں۔"

وہ آگئے' دروازہ کھل گیا' پہلے تو انہوں نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "مراد! یہ تم ہو جیل سے کب رہا ہوئے؟"

"آج ہی۔ ابھی وہیں سے چلا آرہا ہوں۔ میرے گھر کی چابیاں آپ کے پاس ہوں تو مجھے دے دیجئے۔"

"ہاں ہاں' چابیاں میرے پاس ہیں۔ آؤ گھر میں آؤ۔"

"نہیں' مجھے گھر جانا ہے۔ پتا نہیں وہاں کی کیا حالت ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔ میں ہفتے میں ایک بار شبانہ کو لے کر وہاں جاتا ہوں۔ وہ پورے گھر کی صفائی کر دیتی ہے۔ تم وہاں جاؤ گے تو اسے صاف ستھرا پاؤ گے۔ گھر میں تو آؤ۔"

وہ اندر آگیا۔ چاروں طرف کمرے کو دیکھنے لگا۔ اسی وقت اندر کے کھلے ہوئے دروازے سے آنگن کی طرف نظر گئی۔ وہاں سے شبانہ گزر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ پھر فوراً ہی آنچل کا پردہ بنا کر وہاں سے جانے لگی۔ امان اللہ صاحب نے کہا۔ "بیٹی! یہ حاصل مراد ہیں' آج ہی رہا ہو کر آئے ہیں۔"

وہ جاتے جاتے رک گئی۔ ایک دم سے چونک کر آنچل کو اپنے سر سے ہٹاتے ہوئے مراد کو دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اب تک اس نے اس کی آواز سنی تھی' چہرہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

حاصل مراد کو بھی یوں لگ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اب تک چلمن سے ادھورے جلوے دکھائی دیتے تھے۔ اب وہ سراپا نگاہوں کے سامنے تھی لیکن ذرا دور تھی۔ یوں بھی مصوری کا یا سنگ تراشی کا کوئی شاہکار دور سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ تاکہ وہ سرتاپا دکھائی دے اور قدرت کا بھی یہی دستور ہے' بجلی ہمیشہ دور سے گرتی ہے۔

وہ اس کی توقع کے خلاف اچانک اس کے گھر میں آگیا تھا اس لئے وہ بے یقینی سے مگر اپنائیت سے اسے دیکھتی رہی' اس کے بعد آنچل درست کرتے ہوئے آنگن سے ذرا ہٹ گئی' اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی' لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ دروازے کے قریب ہے اور وہ وہیں آڑ میں رہ کر اس کی باتیں سننا چاہتی ہے' اس نے کہا۔ "چابیاں دے دیجئے' مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"بیٹے! ذرا بیٹھو۔ میں تمہارے لئے غسل کرنے کا انتظام کرتا ہوں۔ گرما گرم روٹی کھاؤ' آرام کرو۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔"

"آپ کی اس محبت کا بہت بہت شکریہ لیکن آپ جانتے ہیں' میں نے سات برس سے اپنا وہ گھر نہیں دیکھا ہے' وہاں جانے کے لئے بیتاب ہوں۔ پلیز' چابیاں دے دیجئے میں پھر کسی وقت ضرور آؤں گا۔"

وہ چابیاں لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں شبانہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ سوچ رہا تھا' اچھا ہی ہوا جو وہاں سے چلا آیا۔ عطیہ نے کہا تھا کہ وہ اب شبانہ کو کسی ایسی ویسی نظر سے نہ دیکھے۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ ادھر کا رخ نہ کرے۔ نہ وہ نظر آئے گی اور نہ کوئی غیر اخلاقی جذبہ پیدا ہو گا۔

وہ اپنے گھر آیا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر جب اس نے الماری سے اپنے کپڑے نکالے تو پتا چلا' اتنے عرصے تک جیل میں رہنے کے بعد وہ کافی تندرست ہو گیا ہے بلکہ موٹا ہو گیا ہے۔ پہلے والے کپڑے تنگ ہو رہے تھے۔ اسی وقت امان اللہ صاحب ایک چھوٹی سی اٹیچی لے کر آگئے' اس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارے دوست ہر ماہ کبھی ڈیڑھ ہزار' کبھی دو ہزار لا کر دیا کرتے تھے۔ میں تمہاری امانت جمع کرتا رہتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ وی سی آر کے ذریعے کیا آمدنی ہوتی ہے۔ اس کا حساب تمہیں اپنے دوستوں سے مل جائے گا۔ رقم میرے پاس ہے۔ اس لئے میں دینے آیا ہوں۔"

"یہ رقم کتنی ہے؟"

"چھتیس ہزار روپے ہے۔ گن لو۔"

وہ حیران رہ گیا لیکن اور کچھ نہ کہہ سکا۔ "مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ گننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ سر جھکا کر جانے لگے۔ پھر دروازے کے پاس پہنچ کر پلٹ گئے۔ بڑی حسرت سے اور محبت سے حاصل مراد کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "بیٹے! میری ایک دلی تمنا ہے۔"

"فرمایئے؟"

"میں چاہتا ہوں' تم میرے بیٹے بن جاؤ۔ میرے گھر میں رہو۔ میری بیٹی سے تمہارا کوئی پردہ نہیں ہے۔"

حاصل مراد نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ بڑے میاں نے اتنی بڑی رقم تو واپس کردی ہے لیکن سمجھ گئے ہیں کہ میری آمدنی اچھی خاصی ہے۔ ان کی بیٹی کو خوش رکھوں گا۔ اس لئے بیٹا یا داماد بنا کر مجھے اپنے گھر میں رکھنا چاہتے ہیں۔

انہوں نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ کوئی اعتراض ہے؟ دیکھو' جب میں تمہیں بیٹا بناؤں گا تو کیا تم میری بیٹی کو اپنی بہن سمجھ کر وہاں نہیں رہ سکتے؟"

اس نے ایک دم سے چونک کر انہیں دیکھا۔ یہ بات اس کی توقع کے خلاف تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "جیسے عطیہ تمہاری بہن تھی ویسے ہی شبانہ بھی تمہاری بہن ہے۔"

وہ ناگواری سے کوئی جواب دینا چاہتا تھا لیکن ضبط سے کام لے کر بولا۔ "آپ لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں لیکن کوئی ضروری نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے لوگوں سے محبتیں کی جائیں' ان سے رشتے بھی استوار کئے جائیں۔"

"مقدس رشتے قائم کرنا تو اچھی بات ہے بیٹے!"

"دنیا میں بہت ساری اچھائیاں ہیں۔ آدمی کتنی اچھائیاں کرتا پھرے پھر یہ کہ ایک بہن کا تلخ تجربہ کافی ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے کتنی ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہونا پڑا' غیرت میں آکر میں نے قتل کیا۔ اس کے بعد بھی جیل کی چاردیواری میں سکون سے نہ رہ سکا۔ جب بھی مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سسرال میں عذاب سہہ رہی ہے تو میری نیند اڑ جاتی تھی' بھوک مرجاتی تھی۔ یہ جو رشتے ہوتے ہیں' یہ جیتے جی مارتے رہتے ہیں۔ اب میں جیتے جی مرنا نہیں چاہتا۔ میرا خیال ہے' آپ میری مجبوریاں سمجھ گئے ہوں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھے کاموں کے لئے کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ دراصل عطیہ نے............"

اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں آگے کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔ "میں عطیہ کا ذکر سننا نہیں چاہتا۔ وہ اس دنیا سے اٹھ گئی ہے مگر میرے دل میں موجود ہے۔ البتہ آپ نے اس پر جو مہربانیاں کی ہیں' اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اس کے بدلے آپ کے کچھ کام آنا چاہتا ہوں۔ آپ کو جتنی بھی رقم کی ضرورت ہو تو............"

انہوں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "نہیں نہیں بیٹا! مجھے ایک پیسہ نہیں چاہئے' نیکی اپنا معاوضہ طلب نہیں کرتی۔ یہی تو میں بتانے آیا ہوں۔ ہم نے بیشک عطیہ کے ساتھ نیکی کی۔ وہ بے یارومددگار تھی۔ ہم اس کا سہارا بن گئے۔ ہم نے توجہ سے اس کا علاج کرایا لیکن اس کے بدلے ہمارے ساتھ اس نے جو نیکی کی ہے' اس کا کوئی بدلہ نہیں چکایا جا سکتا۔ ہم ہمیشہ اس کے احسان مند رہیں گے۔ کیا تم سننا چاہو گے کہ اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟"

حاصل مراد نے نوٹوں سے بھری ہوئی اٹیچی کو دیکھا پھر سوچا۔ یقیناً چھتیس ہزار روپے سے کہیں زیادہ رقم بڑے میاں کے پاس آتی رہی ہے۔ چار برس تک اگر دو ہزار روپے ماہانہ کا حساب بھی کیا جائے تو چھیانوے ہزار روپے ہوتے ہیں۔ آخر عطیہ کی بیماری میں کتنی رقم خرچ ہوئی ہوگی؟ دس ہزار یا بیس ہزار یا تیس ہزار پھر بھی بڑے میاں گھاٹے میں نہیں رہے' اس نے کہا۔ "دیکھئے جناب! میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ مہربانی کرکے مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا پھر ہونٹوں کو سختی سے بند کرلیا۔ وہاں سے پلٹ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ گھر کے دروازوں پر تالے ڈال کر بازار گیا۔ وہاں سے اپنے لئے کپڑے خریدے۔ دوستوں میں بیٹھ کر منصوبے بناتا رہا۔ وی سی آر کے ذریعے ہونے والی آمدنی کا حساب کرتا رہا۔ اب جتنی رقم اس کے پاس تھی' اس سے وہ اور وی سی آر خرید کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرسکتا تھا۔ تقریباً شام تک وہ انہی معاملات میں مصروف رہا پھر گھر آگیا۔ سوچا تھا تھوڑی دیر آرام کرے گا۔ رات کے وقت نکلے گا' کھل کر تفریح کرے گا۔ اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔

وہ اپنے بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے دوسرے

کمرے میں آکر بیرونی دروازے کو کھولا۔ وہاں ایک برقع پوش خاتون کھڑی ہوئی تھی۔ جب اس نے نقاب کو الٹا تو شبانہ اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ تعجب کا اظہار کرتا۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے کمرے کے اندر آگئی۔ اس نے پوچھا۔ "تم کیوں آئی ہو؟"

شبانہ نے پوچھا۔ "آپ میرے ہاں سے بھاگ کر کیوں آگئے؟"

"اس لئے کہ عورت سے دور رہنا چاہئے۔"

"کیا بہن سے بھی دور رہنا چاہئے؟"

"بکواس مت کرو' کوئی عورت سگی بہن کی جگہ نہیں لے سکتی۔"

"کیوں نہیں لے سکتی؟ کیا اسی لئے مرد' عورتوں کو پردہ کرا کے اپنی شرافت کا بھرم رکھتے ہیں۔ عورت قریب ہو' سامنے ہو تو ان کی شرافت ڈگمگا جاتی ہے۔"

"مرد نہیں ڈگمگاتا' عورت بہکا دیتی ہے۔"

"میں تو نہیں بہکا رہی ہوں۔"

"یہ ضروری نہیں ہے کہ تم اپنی باتوں سے یا اداؤں سے بہکاؤ عورت کے کتنے پہلو ایسے ہوتے ہیں جو خاموشی سے مرد کو گناہ کی ترغیب دیتے ہیں۔ عطیہ نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ میں تمہاری عزت کرتا رہوں۔ فوراً واپس نہیں جاؤ گی تو ابھی دروازے کو اندر سے بند کرلوں گا۔"

"دروازہ اندر سے بند ہوجائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔ تم یہاں اپنی بہن عطیہ کے ساتھ ہمیشہ دروازہ بند کرکے رہا کرتے تھے۔ رشتے کا جیسا تقدس اس کے ساتھ تھا' آج میرے ساتھ بھی ویسا ہی رہے گا۔"

اس نے جھنجلا کر دروازے کو بند کردیا۔

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے اتنا بتا دو۔ انسان پر ہدایات اثر کیوں نہیں کرتیں؟ ابتدائے تہذیب سے آج تک' آسمانی کتابیں ہمیں ہدایات دیتی ہیں۔ لاکھوں پیغمبر آئے اور چلے گئے۔ انسان کو ٹھوکریں لگتی ہیں' عبرت ناک سزائیں ملتی ہیں۔ پھر بھی وہ اپنی غلط حرکتوں سے باز کیوں نہیں آتا؟ صرف ایک چھوٹی سی بات ہے کہ دوسری عورتوں کو بہن نہ بنایا جائے مگر حجاب باقی رکھا جائے۔ کیا مرد کے خمیر میں ایک ذرا سا حجاب نہیں ہے؟"

حاصل مراد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بولی۔ "میرا ہاتھ پکڑا ہے تو ان آنکھوں میں بھی جھانک کر دیکھو جو کبھی اندھی تھیں' کیا میری ان آنکھوں سے تمہیں عطیہ جھانکتی ہوئی نظر آرہی ہے؟"

اس نے کلائی پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے جھنجلا کر کہا۔ "اس وقت میری بہن کا ذکر مت کرو۔"

"کروں گی' ضرور کروں گی۔ کیونکہ اس نے مرنے سے پہلے ہی' اپنی بیماری کے دوران اپنی آنکھوں کا عطیہ میرے نام لکھ دیا تھا۔ یہ اسی کی آنکھیں ہیں۔ دیکھو' انہیں غور سے دیکھو۔"

حاصل مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کلائی آپ ہی آپ چھوٹ گئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر شبانہ کی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ دیکھ کر پہچاننے کے لئے صرف بصارت کی نہیں' بصیرت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بصیرت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔

وہ انکار کرنا چاہتا تھا کہ وہ آنکھیں عطیہ کی نہیں ہوسکتیں لیکن اس کی پتلیاں کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔ اس کی بہن کی پتلیاں بھی تقریباً ایسی ہی تھیں یا شاید وہی تھیں۔ کتنے ہی لوگوں کی آنکھوں کی پتلیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ صرف دیکھنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔

وہ ایک دم سے چونک گیا۔ اس کے دیکھنے کا انداز وہی تھا جیسے ایک بہن' اپنے بھائی کو دیکھ رہی ہو۔ وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ شبانہ کی زبان چپ تھی لیکن وہ نگاہوں کی پاکیزگی سے کہہ رہی تھی۔ "بھائی جان! نیکی کبھی نہیں مرتی۔ میں مرنے کے بعد بھی شبانہ میں سما جاؤں گی۔ تب شبانہ کے سامنے پہنچ کر آپ کا نقطۂ نظر بدل جائے گا۔"

شبانہ نے کہا۔ "عطیہ نے ابو کو قسم دے رکھی تھی کہ آنکھوں کے عطیے کے متعلق آپ سے کوئی ذکر نہ کریں۔ کیونکہ آپ ہمیشہ الٹی بات سمجھتے ہیں۔ آپ یہی سمجھتے کہ ہم باپ بیٹی نے عطیہ کو بہلا پھسلا کر یا کسی طرح کا دباؤ ڈال اسے آنکھوں کا عطیہ دینے پر مجبور کیا ہوگا۔ میرے ابو ہمیشہ اس کے احسان مند رہے۔ آج بھی وہ آپ سے یہی بات کہنے آئے تھے لیکن آپ نے کہنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ آپ کو دل سے بیٹا بنانا چاہتے ہیں اور میں روح کی گہرائیوں سے آپ کو کیا سمجھ رہی ہوں' یہ آپ ابھی تک نہیں سمجھ سکے اور

نہیں سمجھ سکے تو یہ لیجئے۔"

اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ پھر پوچھا۔ "کیا آپ میری کلائی پکڑ سکتے ہیں؟"

اس نے جھکی جھکی نظروں سے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "آج ہمارے درمیان کوئی چلمن نہیں ہے۔ پردے کا مطلب یہ ہے کہ عورت اور مرد کے بیچ رکاوٹ ہو۔ آج کوئی رکاوٹ نہیں ہے' صرف حجاب ہے۔ وہ حجاب جو تقدس کی بنیاد پر قائم رہتا ہے۔"

وہ آگے نہ سن سکا۔ تیزی سے پلٹ کر دروازے تک پہنچا پھر اسے ایک جھٹکے سے کھولتے ہوئے باہر نکل گیا۔ تیزی سے چلنے لگا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اپنے ہی گھر سے نکل کر کہاں جائے گا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ بہن کو مردہ سمجھتا رہا تھا لیکن وہ مکمل طور پر نہیں مری تھی۔ اس کی آنکھیں زندہ تھیں۔

تیزی سے چلنے کا نتیجہ ٹھوکر ہے۔ وہ ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ "آہ! کیا ہی اچھا ہوتا' اگر ایسا ہوتا کہ کوئی کسی پر بری نظر ڈالتا تو اس کی آنکھوں کے پیچھے سے کوئی مقدس رشتہ آنکھیں دکھانے لگتا۔ اے کاش' ایسا ہوتا۔"

☆------☆------☆

قاتل دلدار

اس ڈاکٹر کی کہانی جو موت اور مریضوں کے درمیان ایک ڈھال تھا۔ چند ضمیر فروشوں نے موت کو اس مسیحا پر مسلط کر دیا تھا۔ عجیب تماشا تھا کہ دلوں کو دھڑکنیں عطا کرنے والے کی سانسیں بند کرنے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔

وہ ٹرانسپیرنٹ دستانے لہو سے بھرے ہوئے تھے۔ انسانی لہو میں بڑی تازگی اور حرارت ہوتی ہے۔ موت ٹھنڈا کر دیتی ہے پھر بھی لہو گرم رہتا ہے۔

دو گورے گورے ہاتھوں نے آ کر ان آلودہ دستانوں کی ایک ایک انگلی سے انہیں کھینچ کر دونوں ہاتھوں سے الگ کیا پھر انہیں آلودہ باسکٹ میں ڈال دیا۔ نقاب کے پیچھے دو آنکھیں بڑی مطمئن اور سنجیدہ تھیں۔ انسانی زندگی کے ایک شعبے میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ انسانی خون کامیابی سے بہا کر اطمینان اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔

ایک اسسٹنٹ نے اس کے چہرے سے ماسک کھولتے ہوئے کہا۔ "کونگریچولیشن ڈاکٹر! آپ بڑے اعتماد سے آپریشن کرتے ہیں۔"

ایک لیڈی اسسٹنٹ نے کہا۔ "آپ کا نام کامران ہے۔ آپ ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔"

ایک نرس ڈاکٹر کامران کا ایپرن اتار رہی تھی۔ کامران نے کہا۔ "میری کامیابی میں تم سب کی محنت اور لگن شامل رہتی ہے۔ مجھے ملنے والی ایک ایک مبارکباد اور تعریف کا ایک ایک لفظ تم سب کے لئے ہے۔"

وہ بولتا ہوا دونوں آپریشن بیڈز کے سرہانے آیا۔ ان میں سے ایک آپریشن بیڈ پر لیٹنے والے کے سر سے پاؤں تک چادر ڈھانپ دی گئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مردہ ہے۔ دوسرے بیڈ پر مریض کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور اس چہرے پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا۔ کامران نے دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایک طرف زندگی ہے اور دوسری طرف موت اور ہم تمام ڈاکٹر زندگی اور موت کے درمیان ایک طویل جنگ لڑتے رہتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم زندگی سے مایوس ہونے والوں کو ایک نئی زندگی دیں۔ ہمارا پیشہ بہت ہی مقدس ہے' ہم بہت عظیم کہلاتے ہیں۔"

اس نے دونوں بیڈ کے درمیان آ کر اس مُردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ جو اس دنیا میں نہیں رہا' یہ ہم سے زیادہ عظیم ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں وصیت کی تھی کہ یہ مرنے کے بعد بھی مرنے نہ پائے اور اس کا دل کسی ضرورت مند شخص کو دے دیا جائے اور ہم نے وصیت پر عمل کیا۔ کون کہتا ہے کہ یہ مر چکا ہے اسے دیکھو' یہ تو زندہ ہے۔"

سب ہی اس مریض کو دیکھنے لگے' جس کے چہرے پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا اور جس کے سینے پر تابوت نما شیشے کا ڈھکن چڑھا ہوا تھا۔ اس شیشے کے آرپار مریض کا سینہ ننگا تھا اور دل کے مقام کے آس پاس سینے کی جلد پر ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ اسے دیکھنے والوں کی سماعت میں دل کے دھڑکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"دھک دھک' دھک دھک' دھک دھک..........."

ڈاکٹر کامران نے مُردے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اس کا صرف جسم مر گیا ہے لیکن دل کی دھڑکنیں زندہ ہیں۔ شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ دل والے کبھی نہیں مرتے۔"

وہ پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کی طرف جانے لگا۔ دو وارڈ بوائز نے آگے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ وہ باہر آیا۔ اس دروازے کے اوپر لکھا ہوا تھا۔ "ہارٹ پلانٹیشن (تبدیلی قلب)۔"

باہر وسیع کاریڈور میں کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھی عورت نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "ڈاکٹر! میرا بیٹا؟"

ڈاکٹر کامران نے کہا۔ "گاڈ از گریٹ۔ آپ کا بیٹا سلامت ہے۔"

سب لوگ خوش ہو گئے۔ بوڑھی عورت اسے دعائیں دینے لگی۔ وہ ان کے درمیان سے گزر کر اپنے چیمبر میں داخل ہوا۔ وارڈ بوائے نے چیمبر کے دروازے کو بند کر کے لوگوں کو اندر جانے سے روک دیا۔

ڈاکٹر کامران کمرے میں آ کر ایک پارٹیشن کے پیچھے گیا پھر لباس تبدیل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی' اس نے کہا۔ "یس کم اِن۔"

تین افراد دروازہ کھول کر اندر آئے۔ ایک شخص نے کہا۔ "کونگریچولیشن ڈاکٹر! اللہ تعالیٰ نے آپ کو صحیح معنوں میں مسیحا بنا کر بھیجا ہے۔ آپ پھر ایک انسان کو موت سے زندگی کی طرف لے آئے ہیں۔"

کامران نے کہا۔ "زندگی دینے والا خدا ہے۔ آپ حضرات کا تعلق اسپتال کی

انتظامیہ سے ہے۔ کیا صرف مبارکباد دینے آئے ہیں۔ یا اور کوئی معاملہ ہے؟"

دوسرے شخص نے کہا۔ "جی ہاں۔ آپ تھکے ہوئے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ آپ کو آرام کرنے دیں لیکن دو نمبر کی مریضہ مس ماریہ نے پچاس لاکھ روپے ڈونیٹ کئے ہیں۔"

کامران نے ماریہ کا نام سن کر سوچنے کے انداز میں ایک طرف دیکھا' اسے تصور میں وہ نظر آنے لگی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور دونوں ہاتھ پھیلائے اس کی طرف چلی آ رہی تھی۔

کامران نے کچھ پریشان سا ہو کر پھر چونک کر اسپتال کے ان تین معززین کو دیکھا۔ اس کے بعد مسکرا کر بولا۔ "یہ تو خوشی کی بات ہے' اس نے اسپتال کے لئے عطیہ دیا ہے۔"

"جی ہاں۔ وہ خود کہتی ہے کہ اس نے اسپتال کے لئے عطیہ دیا ہے لیکن اس چیک پر آپ کا نام لکھا ہے۔"

اس شخص نے ڈاکٹر کامران کے ہاتھ میں وہ چیک دیا۔ اس نے چیک لے کر دیکھا۔ اس پر کامران کا نام اور پچاس لاکھ روپے کی رقم لکھی ہوئی تھی۔ اس پر ماریہ کا مسکراتا ہوا خیالی چہرہ دکھائی دینے لگا۔ وہ مسکراتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"میرا جو کچھ بھی ہے۔ وہ سب تمہارا ہے اور میں دنیا کو جو کچھ بھی دوں گی۔ تمہارے نام سے دوں گی۔"

ڈاکٹر کامران نے خیالات سے چونک کر اس شخص سے پوچھا۔ "کیا آپ نے اسے یہ نہیں سمجھایا کہ اسپتال کے لئے عطیہ اسپتال کے نام سے ہی دینا چاہئے؟"

"ہم نے سمجھایا تھا۔ مس ماریہ کہتی ہیں کہ اسپتال کی انتظامیہ کے انچارج ڈاکٹر کامران ہیں۔ لہٰذا آپ کے نام سے بھی چیک جاری کیا جا سکتا ہے۔"

کامران نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں یہ چیک اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے بعد اسپتال کے ڈونیشن فنڈ میں ٹرانسفر کرا دوں گا۔"

وہ تینوں افراد واپس چلے گئے۔ کامران اس چیک کو دیکھنے لگا۔

☆------☆------☆

ماریہ اسپتال کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ بستر کے پاس ایک وکیل سیاہ کوٹ پہنے بیٹھا ہوا کورٹ پیپر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ ایک فائل بستر کے سرے پر رکھی ہوئی تھی۔ وکیل نے

لکھنے کے بعد وہ کلپ بورڈ اور کورٹ پیپر ماریہ کی طرف بڑھایا پھر قلم دیتے ہوئے کہا آپ اسے اچھی طرح پڑھ لیں۔ پھر دستخط کریں۔"

ماریہ نے اسے نہیں پڑھا۔ اس پر دستخط کر دیئے۔ وکیل نے اس سے کلپ بورڈ اور قلم لے کر کہا۔ "خدا آپ کو لمبی عمر دے۔ آپ نے اپنی دولت اور جائیداد ڈاکٹر کامران کے نام لکھ دی ہے۔ ویسے آپ کو اپنی زندگی سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔"

"میں مایوس نہیں ہوں مگر مقدر کا حال کون جانتا ہے۔ اگر زندہ رہی تو اسی کے نام سے جیوں گی۔ مر گئی تو میری تمام دولت ان مریضوں کے کام آئے گی' جو کامران کے آپریشن تھیٹر سے گزرتے رہیں گے اور بائی دی گریس آف گاڈ نئی زندگیاں حاصل کرتے رہیں گے۔"

"مس ماریہ! خدا نے آپ کو محبت کرنے والا دل دیا ہے۔"

وہ اداس مسکراہٹ سے بولی۔ "اور اس محبت کرنے والے دل کی دھڑکنیں ڈوب رہی ہیں۔ اگر کسی عطیہ دینے والے کا دل ملے گا تو اس بار میرا نمبر ہے لیکن اپنی باری کا انتظار کرتے کرتے یہ دل ڈوب ہی نہ جائے۔"

"پلیز' آپ زندہ رہنے کی باتیں کریں۔ اس ملک کے لوگ بڑے دریا دل ہیں۔ کوئی اپنا دل دے کر آپ کو نئی زندگی دے گا۔"

"ہو سکتا ہے' نئی زندگی مل جائے۔ نہ بھی ملے تو میری آخری خواہش یہی ہے کہ ڈاکٹر کامران آپریشن کرتا رہے اور میں اس کے سامنے جان دیتی رہوں۔"

وکیل سر جھکا کر کلپ بورڈ سے کاغذات نکالنے کے بعد انہیں فائل میں رکھنے لگا۔ ماریہ نے کہا۔ "میں نے آپ پر بھروسا کیا ہے۔ میری اس وصیت کو راز میں رکھیں۔ میری موت کے بعد اسے قانونی طور پر کامران کے حوالے کیا جائے۔"

"جب آپ کے ڈیڈی زندہ تھے تو وہ بھی مجھ پر اہم معاملات میں بھروسا کرتے تھے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ یہ راز اس فائل سے باہر نہیں جائے گا۔"

وہ جانے کے لئے اٹھ گیا۔ اسی وقت ڈاکٹر کامران دروازے پر نظر آیا۔ ماریہ اسے دیکھ کر خوشی سے کھل گئی۔ وکیل نے آگے بڑھ کر کامران سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ خادم کو بیرسٹر وقار احمد کہتے ہیں۔ مجھے کسی مریض کو ڈسٹرب تو نہیں کرنا چاہئے لیکن مس ماریہ کے حکم سے حاضر ہوا تھا۔ ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کام ہو چکا ہے۔ مجھے

اجازت دیں۔ خدا حافظ۔"

وہ چلا گیا۔ ڈاکٹر کامران سنجیدگی سے ماریہ کو دیکھتا ہوا بستر کے قریب آیا پھر بولا۔

"زندہ وہی رہتے ہیں' جو زندہ رہنے کا حوصلہ کرتے ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "مجھ میں حوصلہ ہے۔"

وہ بولا۔ "گھر اور قبرستان کے درمیان یہ اسپتال ایک اسٹیشن ہے۔ ڈاکٹروں کی کوشش ہوتی ہے کہ واپسی ٹرین سے مریضوں کو گھر بھیجا جائے لیکن وکیل آخری وصیت لکھنے آجاتے ہیں۔"

"کامران! وہ۔ وہ وصیت لکھنے نہیں بلکہ.........."

"مجھے کامران نہیں' ڈاکٹر کہو۔"

"ڈاکٹر تو لاکھوں ہوتے ہیں۔ کامران ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کا نام لکھتے وقت میرے بیمار دل کو نئی دھڑکنیں ملتی ہیں۔"

کامران نے اسے چیک دکھا کر کہا۔ "نام لکھتے وقت تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں بدنام ہو سکتا ہوں۔"

"میں پہلی بار سن رہی ہوں کہ گلاب کو گلاب لکھنے سے وہ مرجھا جاتا ہے۔"

"اوہ گاڈ! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ میری ایک بیوی ہے' جسے میں دل و جان سے چاہتا ہوں۔"

"کیا میں نے تمہیں بیوی سے محبت کرنے سے منع کیا ہے؟ اس بیمار دل کی قسم' تمہاری بیوی سلمٰی کی لمبی عمر کی دعائیں مانگتی ہوں۔ خدا سے التجا کرتی ہوں کہ تم سلمٰی کے پیار کے سائے میں ہمیشہ کامیاب آپریشن کرتے رہو۔"

"تو پھر یہ ڈونیشن کا چیک ہے۔ اس پر میرا نام کیوں ہے؟"

"یہ میری چاہت ہے اور چاہت کوئی گناہ نہیں ہے۔"

"یہ گناہ تو نہیں ہے لیکن کبھی کبھی مصیبت بن جاتی ہے۔"

ماریہ نے اسے گہری اداسی سے دیکھا پھر کہا۔ "جس کی زندگی چار دنوں کی رہ گئی ہو' وہ تمہارے لئے مصیبت نہیں بنے گی۔"

"پلیز ماریہ! ایسی باتیں نہ کرو۔ اس بار جو کیس آئے گا تو تمہارا آپریشن ہوگا۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ تمہیں ایک دل اور نئی زندگی ملے۔"

دروازے پر سے آواز آئی۔ "اللہ نے چاہا تو ضرور نئی زندگی ملے گی۔"

دونوں نے اُدھر دیکھا' دروازے پر سلمٰی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آکر بولی۔ "میں آپ کے چیمبر میں گئی تھی۔ ایک ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ ماریہ نے پھر آپ سے چاہت بھری شرارت کی ہے۔"

کامران نے اپنی بیوی کو وہ چیک دکھا کر کہا۔ "یہ شرارت ہے؟ تم بھی اس کی حمایت کر رہی ہو؟"

سلمٰی نے اس سے چیک لے کر تہہ کیا پھر اسے کامران کی جیب میں رکھ کر کہا۔

"کل میں اسے اسپتال کے ڈونیشن اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دوں گی۔ آپ کیسے ڈاکٹر ہیں؟ ایک دل کی مریضہ کو اس کی خواہش پوری نہیں کرنے دیتے.......... میں آپ کی شریکِ حیات ہوں۔ آپ ماریہ کی چاہت کو سمجھیں۔ اس کی چاہت میں ایک عقیدت ہے۔ اس کی چاہت میں آپ کی بھرپور صلاحیت کا اعتراف ہے لیکن آپ مرد حضرات ایک ہی بات جانتے ہیں کہ کوئی عورت کسی کاغذ پر آپ کا نام لکھ دے تو آپ اسے عاشق سمجھنے لگتے ہیں۔"

ماریہ نے خوش ہو کر کہا۔ "مسز کامران! آپ بہت اچھی ہیں۔ جو باتیں میں نہیں سمجھا سکتی تھی' وہ آپ نے سمجھا دیں۔"

سلمٰی نے پلنگ کے سرے پر بیٹھ کر ماریہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"تمہیں بھی یہ اچھی طرح سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں' جو نیک جذبات کو سمجھتے ہیں۔ ورنہ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ بدنامی کو ہوا نہیں دینا چاہئے۔"

ماریہ نے کہا۔ "میں حیران ہوں' تم دنیا والوں سے ڈرتی ہو۔ مجھ سے نہیں ڈرتیں کہ میری چاہت میں کھوٹ ہو سکتا ہے اور میں تمہارے ڈاکٹر کو تم سے چھین بھی سکتی ہوں۔"

سلمٰی ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوگئی پھر کامران کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "میرا ڈاکٹر صرف میرا ہے' انہیں صرف ایک ہی چیز مجھ سے چھین سکتی ہے اور وہ ہے' میری موت.........."

کامران نے فوراً ہی سلمٰی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر کہا۔ "موت آئے گی تمہارے دشمنوں کو چلو یہاں سے۔"

وہ سلمٰی کا ہاتھ تھام کر چلتا ہوا دروازے تک آیا پھر پلٹ کر بولا۔ "تم نے اسپتال

کے لئے بہت بڑا عطیہ دیا ہے۔ میں اسپتال کے تمام عملے کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ سلمٰی کے ساتھ چلا گیا۔ ماریہ کھلے ہوئے دروازے کو تکتی رہی۔ کامران نے کاریڈور سے گزرتے ہوئے پوچھا۔ "سلمٰی! سچ بتاؤ۔ یہ ماریہ جس طرح چاہت کا اظہار کرتی ہے کیا اس سے تمہیں جلن نہیں ہوتی؟"

"میں آپ کے پیار کا ایک تنکا بھی کسی کو نہیں دے سکتی اور یہ بات دنیا کی ہر بیوی کہے گی لیکن ماریہ کی بات اور ہے۔ وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر ہے۔ کیا پتا' کسی کے دل کا عطیہ ملنے تک وہ رہے یا نہ رہے۔ لہٰذا وہ جب تک سانسیں لے رہی ہے' ہمیں اس کے سانسوں کو بحال رکھنا اور اسے ہر طرح سے خوش رکھنا چاہئے۔"

کامران نے مسکرا کر کہا۔ "تم بہت اچھی ہو۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔"

سامنے سے ایک نوجوان لڑکی رائمہ آرہی تھی۔ وہ کامران کو دیکھ کر بولی۔ "بھائی جان! میں نے سن لیا ہے اور سنتا کیا ہے۔ میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ میرے بھائی جان کے ہاتھ میں شفا ہے۔ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔"

سلمٰی نے پوچھا۔ "آج تمہاری نائٹ ڈیوٹی ہے؟"

"جی بھابی جان! صبح آجاؤں گی۔"

سلمٰی نے کامران سے کہا۔ "یہ کب تک ہاؤس جاب کرے گی۔ اس کی ملازمت پکی کرائیں۔"

وہ بولا۔ "میں دو چار بار اسے آپریشن کے کیس میں اپنے ساتھ رکھوں گا اگر اس نے پرفیکٹ کام کیا تو پھر ملازمت پکی کرا دوں گا۔"

رائمہ نے خوش ہو کر کہا۔ "اوہ تھینک یو بھائی جان! میرے لئے اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ میں آپ کو کسی آپریشن میں اسسٹ کروں گی۔"

کامران نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "تمہاری ڈیوٹی کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

رائمہ نے سلمٰی کے قریب ہو کر اس کے کان میں کہا۔ "یہ گھڑی دیکھ کر نہیں' آپ کو دیکھ کر مجھے بھگا رہے ہیں۔"

سلمٰی نے اس کے بازو میں چٹکی لی۔ وہ "اوئی" کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ کامران

نے سلمٰی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "وہ شریر کیا کہہ رہی تھی؟"

سلمٰی نے کہا۔ "زنانہ باتیں کر رہی تھی۔ آپ کو بتانا ضروری نہیں ہے۔"

وہ دونوں ہنستے ہوئے اسپتال کی عمارت کے باہر آئے۔ ایک ملازم نے آ کر کہا۔ "سر! مجھے چابی دیں میں آپ کی کار لے آتا ہوں۔"

"نہیں۔ رہنے دو۔ میں خود لے آؤں گا۔ ہمیں ذرا پیدل بھی چلنا چاہئے۔"

وہ دونوں عمارت کے بیسمنٹ کی طرف جانے لگے۔ ایسے وقت ایک ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی تیزی سے آئی پھر بیسمنٹ کی طرف جانے لگی۔ کامران نے حیرانی سے کہا۔ "ایمبولنس میں کوئی مریض ہوگا اسے اسپتال کے دروازے پر لے جانا چاہئے پھر یہ ایمبولینس بیسمنٹ کی طرف کیوں گئی ہے۔"

سلمٰی اس کے ساتھ تیزی سے چلتی ہوئی کئی گاڑیوں کے درمیان آئی' وہ تمام گاڑیاں بیسمنٹ میں کھڑی ہوئی تھیں۔ بہت آگے جانے والی ایمبولینس ایک کھڑی ہوئی لینڈ کروزر سے ٹکرا کر آگے بڑھی اور دوسری طرف گھوم گئی۔ سلمٰی اور کامران ٹھٹک گئے۔ ٹکراؤ کے نتیجے میں ایمبولینس کے نچلے حصے سے ایک سیون ایم ایم کی رائفل نیچے فرش پر گر پڑی تھی۔

کامران چند لمحات کے لئے ٹھٹک گیا تھا پھر وہ دوڑتا ہوا آیا اور رائفل کو اٹھا کر دیکھا۔ بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ "ہتھیار اور ایمبولینس سے؟"

وہ دوڑتا ہوا اُدھر گیا۔ جدھر ایمبولینس گھوم کر گئی تھی۔ اسپتال کی پوری عمارت کے نیچے اس بیسمنٹ کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں اور دوسرے حصے کی چار دیواری میں دوائیں اسٹاک کی جاتی تھیں۔ اس چار دیواری کے ایک بڑے دروازے کے پاس ایمبولینس کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں ڈرائیور کے علاوہ تین افراد اور تھے۔ ایک شخص ایمبولینس کے نیچے لیٹا ہوا چمڑے کے بیلٹ کھول رہا تھا۔ ان تمام بیلٹ کے ذریعے درجنوں ہتھیاروں کو گاڑی کے نچلے حصے سے باندھا گیا تھا۔ اب ان بیلٹس........... کو کھول کر ان ہتھیاروں کو دواؤں کے گودام کے اندر پہنچایا جا رہا تھا۔

ایمبولینس کے باہر کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں نے ڈاکٹر کامران کو ایک رائفل کے ساتھ دیکھا۔ وہ پہلے تو گھبرائے۔ پھر ایک شخص نے مسکرا کر کہا۔

"سلام صاحب! آپ اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کے ہاتھوں میں ہتھیار اچھا نہیں

لگتا۔ لائیے، ہمیں دے دیجئے۔"

کامران نے پوچھا۔ "یہ ہتھیار ہمارے اسپتال میں کیوں لائے گئے ہیں؟"

"مجبوری ہے صاحب! آپ تو جانتے ہیں۔ شہر میں دہشت گردی پھیلی ہوئی ہے۔ ہتھیاروں پر پابندی ہے۔ ہر موڑ اور ہر سڑک پر گاڑیوں کی چیکنگ ہوتی ہے۔ پورے شہر میں فائر بریگیڈ اور ایمبولینس دو گاڑیاں ایسی ہیں، جنہیں روکا نہیں جاتا۔ کیونکہ کہیں آگ بجھانا اور مریضوں کو فوری امداد پہنچانا لازمی ہوتا ہے۔ ہم ایمبولینس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسی زخمی کو گاڑی میں ڈال کر لاکھوں روپے کے ہتھیار شہر میں لے آتے ہیں۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس ایمبولینس میں کوئی زخمی بھی ہے؟"

"جی صاحب! ہمارے ایک آدمی نے اسے گولی مار کر ایمبولینس میں لٹا دیا تھا۔ اب تک تو وہ مر چکا ہوگا۔"

کامران نے غصے سے کہا۔ "بے رحم! درندے! تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے ایک انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ میں ابھی تم سب کو گرفتار کراؤں گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "صاحب! غصے میں کام بگڑ جاتا ہے۔ ذرا اپنے پیچھے دیکھو۔"

اسے سلمٰی کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک شخص نے سلمٰی کی گردن دبوچ کر اس کی کنپٹی سے ریوالور کی نال لگا رکھی تھی۔ وہ اپنی سلمٰی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ ریوالور والے نے دھمکی دی۔ "خبردار! ایک قدم بھی آگے بڑھاؤ گے تو گولی چل جائے گی۔ بیوی زندہ نہیں ملے گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ............ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ یہ اسپتال ہے یہاں انسانوں کی جانیں بچائی جاتی ہیں اور تم لوگ موت کا سامان کر رہے ہو؟"

"ڈاکٹر! نصیحت نہ کرو۔ نصیحتوں کے لئے آسمان سے کئی کتابیں اتر چکی ہیں۔ ابھی تو تم دونوں ہمارے لئے پرابلم بن گئے ہو۔ تمہیں گولی ماریں گے تو دور تک آواز جائے گی۔ ہمارا بھید کھل جائے گا۔ ویسے مجبور کرو گے تو گولیاں چلانی ہی پڑیں گی۔"

دوسرے نے کہا۔ "اور ہاں تم نے جو رائفل پکڑی ہے۔ وہ خالی ہے۔ اسے اپنے اطمینان کے لئے چیک کر لو پھر نیچے پھینک دو۔ ایک ڈاکٹر کو اوزار اٹھانا چاہئے۔ ہتھیار نہیں۔"

کامران نے رائفل کو چیک کیا پھر اسے فرش پر پھینک دیا۔ ایک شخص نے اپنی

اوپری جیب سے ایک لاکٹ نکالا پھر کامران کے پاس آ کر کہا۔ "اسے اپنے گلے میں پہن لو۔"

کامران نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"پہلے پہنو، پھر سوال کا جواب مل جائے گا۔ نہیں پہنو گے تو بیوی جان سے جائے گی۔"

کامران نے بے بسی سے سلمٰی کو دیکھا۔ وہ دشمن کی گرفت میں تھی اور اس کی کنپٹی سے ریوالور کی نال لگی ہوئی تھی۔ اس نے لاکٹ کو گلے میں ڈال لیا۔ اس شخص نے ذرا دور جا کر اپنی جیب سے ریموٹ کنٹرول نکالا پھر کہا۔

"ڈاکٹر! اس لاکٹ میں ایک ننھا سا طاقتور بم ہے۔ میں اس ریموٹ کنٹرول کا ایک بٹن دباؤں گا تو زبردست دھماکا ہوگا اور تمہارے جسم کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔"

سلمٰی نے کہا۔ "یہ کیسا ظلم ہے؟ جو ڈاکٹر بیماروں کو نئی زندگیاں دیتا ہے۔ اسے مار ڈالنا چاہتے ہو؟"

"اگر تم اپنے ڈاکٹر کو زندہ رکھنا چاہتی ہو تو ایک شرط ہے۔ اس سے ایک گھنٹے کے لئے دور رہو۔ یہ تمہارے پیچھے دوڑے گا، تم اس سے دور رہنے کے لئے بھاگتی رہو۔ اگر اس کے ہاتھ آجاؤ گی تو میں یہ بٹن دبا دوں گا۔ بولو کیا مجھے بٹن دبانا چاہئے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں۔ میں انہیں بچانے کے لئے ایک گھنٹے تو کیا ساری زندگی بھاگتی رہوں گی۔"

کامران نے پوچھا۔ "لیکن تم ہمیں اس طرح دوڑانا کیوں چاہتے ہو؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "معمولی سی بات ہے۔ تم دونوں کے دوڑنے اور بھاگنے کے دوران ہم یہ تمام ہتھیار دوسری جگہ پہنچا دیں گے۔ اس طرح نہ تم ہمیں الزام دے سکو گے اور نہ ہی ہم تمہارے جیسے باکمال ڈاکٹر کی خواہ مخواہ جان لیں گے۔"

ایک دوسرے شخص نے کہا۔ "ابھی تم ہمیں درندے کہہ رہے تھے۔ لیکن یہ دیکھو کہ ہم تمہارے جیسے کامیاب سرجن کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ تم دونوں کی زندگی اسی میں ہے کہ بھاگتے رہو۔ چلو اپنی بیوی سے کہو پہلے یہ جائے۔ جب یہ بیسمنٹ سے باہر چلی جائے گی تو تم یہاں سے اس کے پیچھے جاؤ گے۔"

سلمٰی نے کہا۔ "میں جا رہی ہوں کامران! مجھ سے تیز نہ دوڑنا۔ میرے قریب نہ آنا۔

تمہاری زندگی صرف میرے لئے ہی نہیں' دنیا کے ہزاروں اور لاکھوں بیماروں کے لئے ضروری ہے۔"

ریوالور والے نے سلمٰی کو چھوڑ دیا۔ وہ دوڑتی ہوئی جانے لگی۔ ریوالور والا ایک موٹرسائیکل پر بیٹھ کر بولا۔ "میں دور ہی سے تمہاری بیوی کا تعاقب کرتا رہوں گا۔ اگر تم وہ لاکٹ گلے سے اتارو گے تو میں اسے گولی ماردوں گا۔"

"میں یہ لاکٹ کیسے اتار سکتا ہوں۔ یہ تو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے بلاسٹ ہوجائے گا۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ ایک شخص نے ریموٹ کنٹرول کو ایک طرف پھینک کر کہا۔ "اس لاکٹ میں کوئی بم نہیں ہے لیکن تم اسے اتار کر اپنی بیوی کو دکھاؤ گے اور اسے حقیقت بتاؤ گے تو ہم اسے گولی مار دیں گے۔"

ریوالور والے نے موٹرسائیکل اسٹارٹ کرکے کہا۔ "اور یاد رکھو۔ تمہارے گلے سے لاکٹ نکلنے سے پہلے تمہاری بیوی کو گولی لگے گی۔"

دوسرے شخص نے کہا۔ "ہاں ایک شرط اور ہے تم دوڑتے رہنے کے دوران اپنی بیوی کو آوازیں دیتے رہو گے اور اسے رکنے کے لئے کہتے رہو گے شاباش۔ اب جاؤ۔"

موٹرسائیکل والا تیزرفتاری سے جانے لگا۔ قانونی تقاضا تو یہی تھا کہ وہ فوراً ہی قانون کے محافظوں سے رجوع کرتا لیکن سلمٰی کی زندگی خطرے میں تھی۔ وہ بھی دوڑتا ہوا بیسمنٹ کے باہر آگیا۔

بہت دور اسپتال کے احاطے کے گیٹ کے پاس سلمٰی بھاگتی ہوئی دکھائی دی۔ کامران کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بیوی کو آوازیں دیتا رہے۔ اس نے چیخ کر آواز دی۔ "سلمٰی! رک جاؤ۔ رک جاؤ سلمٰی............"

گیٹ کے دربان نے سلمٰی کے ساتھ دوڑتے ہوئے پوچھا............ "بی بی جی! آپ کیوں بھاگ رہی ہیں؟ بڑے ڈاکٹر صاحب آپ کو پکار رہے ہیں۔"

وہ دوڑتی ہوئی بولی۔ "جاؤ یہاں سے۔ میرے پیچھے نہ آؤ۔"

دربان رک گیا جب کامران دوڑتا ہوا آیا تو اس نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے؟ آپ بیگم صاحب کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہیں؟"

"یو شٹ اپ۔" وہ دربان کو ڈانٹ کر سلمٰی کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔

دربان نے حیرانی سے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "خدایا خیر۔ ادھر تو میاں بی بی کا خانہ خراب ہورہا ہے۔"

وہ تیزی سے بھاگتی جارہی تھی۔ ایک بھری پری شاہراہ پر اور کبھی فٹ پاتھ پر ایسی خاتون بھاگی جارہی تھی جو غیر معروف نہیں تھی۔ اس علاقے میں سب ہی اسے ایک ہارٹ سرجری کے ماہر کامران کی شریکِ حیات کی حیثیت سے جانتے تھے پھر دیکھنے والوں کے لئے پریشانی کی بات یہ تھی کہ خود ڈاکٹر کامران اپنی بیوی کے پیچھے اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہو اور وہ بھی جیسے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگی جارہی تھی۔

مخالف سمت سے ایک پولیس انسپکٹر چند سپاہیوں کے ساتھ ایک جیپ میں آرہا تھا اور وہ دشمن موٹرسائیکل والا ریوالور لئے سلمٰی کے پیچھے سُست رفتاری سے جارہا تھا۔ انسپکٹر کو اس دشمن پر شبہ نہیں ہوا لیکن وہ کامران جیسے ملک کے مشہور اور معزز ڈاکٹر کو دوڑتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے جیپ روکنے کے لئے کہا۔ وہ رک گئی۔ انسپکٹر نے فٹ پاتھ پر کامران کو روکا۔ "ڈاکٹر! رک جاؤ۔ کیا بات ہے' مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے؟"

کامران اس موٹرسائیکل والے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے۔ میں اسے............"

کامران نے بات ادھوری چھوڑ کر بڑی پھرتی سے انسپکٹر کے ہولسٹر پر ہاتھ ڈالا پھر اس میں سے ریوالور نکال کر سلمٰی اور موٹرسائیکل والے کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔ انسپکٹر نے چیخ کر کہا۔ "ڈاکٹر! رک جاؤ۔ کیا پاگل ہوگئے ہو؟"

اس نے جیپ میں بیٹھ کر پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ وہ جیپ جتنی دیر میں ٹرن لے کر تعاقب میں جاتی۔ اتنی دیر میں سلمٰی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ کامران سرعام ہاتھ میں ریوالور لئے دوڑتے ہوئے اس موٹرسائیکل والے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دشمن بھی اس فائیو اسٹار ہوٹل کے احاطے میں جاکر نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

عجیب بھاگ دوڑ اور افراتفری تھی۔ سب سے پیچھے پولیس کی جیپ آکر ہوٹل کے احاطے میں رکی۔ انسپکٹر نے دور تک نظریں دوڑائیں۔ ڈاکٹر کامران نظر نہیں آرہا تھا۔ ہوٹل کے دربان نے دوڑ کر آتے ہوئے کہا۔ "صاحب! ابھی ایک عورت بھاگتی ہوئی چیخ رہی تھی۔ "ڈاکٹر کو روکو۔ ڈاکٹر کو روکو۔ اسے پکڑلو۔ میرے پاس نہ آنے دو۔"

ہوٹل کا کچھ اور عملہ بھی آگیا۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ "آپ لوگوں نے ڈاکٹر کو کیوں

نہیں روکا؟"

"ہم کیسے روکتے۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔"

انسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا اس دربان کو لے کر ہوٹل کے دوسری طرف گیا۔ وہاں دوسری طرف سوئمنگ پول پر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ مختصر سے لباس میں نہانے والیاں چیختی چلاتی بھاگ رہی تھیں۔ سلمٰی پول کے دوسرے کنارے پر کھڑی ہوئی انکار میں ہاتھ ہلاتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "میرے پاس نہ آؤ۔ میرا پیچھا نہ کرو۔ اپنی زندگی سے نہ کھیلو۔ تم دوسروں کو زندگی دیتے........"

اس کی بات پوری ہوتے ہی ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی۔ سلمٰی کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ اوندھے منہ پول کے پانی میں گر پڑی۔ کامران نے حلق کے بل چیخ کر کہا۔ "سلمٰی!" اس نے اِدھر اُدھر سر اٹھا کر دیکھا۔ گولی چلانے والا کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے ریوالور پھینک کر پول میں چھلانگ لگائی۔ تیرتا ہوا اپنی سلمٰی کے پاس پہنچا تو آس پاس کا پانی لہو سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی شریکِ حیات کی لاش پانی کی سطح پر اوندھی تیر رہی تھی۔

انسپکٹر نے پول کے دوسرے کنارے پر پڑے ہوئے اپنے ریوالور کو اٹھایا۔ کتنے ہی سپاہی پانی میں کود گئے۔ انہوں نے ان دونوں کو پانی سے نکالا۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ "ڈاکٹر! یہ آپ نے کیا کیا؟ اپنی ہی شریکِ حیات کو مار ڈالا؟"

"یہ جھوٹ ہے دیکھو' اس کی سانسیں چل رہی ہیں۔ بدن گرم ہے فوراً اسپتال لے چلو۔"

سب نے مستعدی دکھائی۔ ہوٹل کی ایک ایمرجنسی ایمبولینس میں سلمٰی کو ڈالا گیا۔ کامران نے کہا۔ "انسپکٹر میں قاتل نہیں ہوں۔ اگر قاتل سمجھتے ہو تو جب چاہو اسپتال میں آکر گرفتار کر لینا لیکن پہلے اسپتال کے بیسمنٹ کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ وہاں سے ایک شخص یا ایک گاڑی کو باہر نہ نکلنے دو۔ دہشت گردوں کا کوئی گروہ ہے جو وہاں اسلحہ چھپا رہا ہے۔"

ہوٹل کے فون کے ذریعے پہلے ہی اسپتال میں خبر پہنچا دی گئی تھی کہ ڈاکٹر کامران کی بیوی سلمٰی کو گولی مار دی گئی ہے۔ اسے لایا جا رہا ہے۔ آپریشن تھیٹر کا عملہ الرٹ رہے۔

ایمبولینس وہاں پہنچی تو کامران کی بہن رائمہ اپنی بھابی کو خون میں لت پت دیکھ کر رونے لگی۔ اس نیم مردہ جسم کو ٹرالی اسٹریچر پر ڈال کر سب تیزی سے آپریشن تھیٹر میں

لے آئے۔ وہاں پہنچتے ہی کامران نے سب سے پہلے آکسیجن ماسک چڑھانا چاہا پھر ٹھٹک گیا۔ برسوں کے تجربات نے بتایا کہ وہ ابدی نیند سو چکی ہے۔

پھر بھی اس نے ہر طرح معائنہ کر کے تسلی کی لیکن وہ تاحیات شریک رہنے والی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ انکار میں سر ہلا کر کہنے لگا۔ "نہیں نہیں' میں تمہارے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ اسپتال ہے۔ یہاں ہم ٹوٹی پھوٹی زندگیوں کی مرمت کرتے ہیں۔ لوگوں کو نئی زندگیاں دیتے ہیں لیکن اسی اسپتال کی تہہ میں موت کا کاروبار ہو رہا ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا آپریشن تھیٹر کے باہر آیا۔ وہاں سپاہیوں کے ساتھ چند بڑے پولیس افسران بھی کھڑے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے کہا۔ "ڈاکٹر! ہم نے بیس منٹ کا محاصرہ کیا تھا اور اچھی طرح تلاشی بھی لی تھی لیکن وہاں صرف دواؤں کا اسٹاک ہے۔"

ایک افسر نے کہا۔ "بہتر ہے ہم آپ کے چیمبر میں آپ کا بیان لیں۔"

وہ سب آگے پیچھے کامران کے چیمبر میں آئے۔ ڈاکٹر کامران نے کہا۔ "انہوں نے وہاں سے ہتھیار ہٹانے کے لئے مجھے اور سلمٰی کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ مجرم بہت چالاک ہیں۔"

بڑے افسر نے کہا۔ "چالاک تو آپ بھی ہیں۔ بیوی کو ریوالور دکھا کر دہشت زدہ کرتے ہوئے دوڑا رہے تھے۔"

کامران نے غصے سے پوچھا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے اپنی شریکِ حیات کو قتل کیا ہے؟"

کمرے میں چار افراد داخل ہوئے۔ ان میں دو ڈاکٹر تھے اور دو کا تعلق وہاں کی انتظامیہ سے تھا۔ ایک نے کہا۔ "میں یہاں کی انتظامیہ کا جنرل سیکرٹری ہوں اور آپریشن تھیٹر کا منتظم بھی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ فی الحال پولیس کارروائی ملتوی کر دیں اس وقت تبدیلی قلب کا آپریشن بہت ضروری ہے۔"

کامران نے چونک کر جنرل سیکرٹری کو دیکھا۔ وہ کامران سے بولا۔ "ڈاکٹر! آپ کی وائف بیگم سلمٰی نے اس اسپتال میں یہ وصیت ڈپازٹ کی تھی کہ ان کی وفات کے بعد ان کا دل کسی ضرورت مند کو ضرور دیا جائے۔ یہاں آپ سے بڑا سرجن کوئی نہیں ہے۔ یہ ہارٹ پلانٹیشن کی سرجری بھی آپ کریں گے۔"

بڑے افسر نے کہا۔ "جس نے سرعام اپنی بیوی کو دوڑا دوڑا کر قتل کیا۔ اس سے آپ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے مریض کو نئی زندگی دے گا؟ سوری ہم اسے دوسرا قتل نہیں کرنے دیں گے۔"

ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "پھر ہمیں بھی افسوس کے ساتھ کہنا ہوگا کہ آپ اپنی پولیس پارٹی لے کر اسپتال سے باہر جائیں اگر یہاں کسی مریض کی موت واقع ہوگی تو اس کے ذمے دار آپ ہوں گے۔"

افسر نے کرسی سے اٹھ کر اپنی کیپ پہنتے ہوئے کہا۔ "آل رائٹ۔ ہم اسپتال کے احاطے میں اپنے مجرم کا انتظار کریں گے۔"

ڈاکٹر کامران گم صم کھڑا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ یہ خیال ہی جان لیوا تھا کہ جس محبت کرنے والی کی دھڑکنوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا تھا' اسی کے سینے کو چیر کر اس کا دل نکالے گا!

☆-------☆-------☆

آپریشن تھیٹر کے اندر دو ٹرالی بیڈ تھیں۔ ایک بیڈ پر سونے والی کے اوپر سر سے پاؤں تک چادر پڑی ہوئی تھی۔ دوسرے بیڈ پر لیٹنے والی کے چہرے پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ پہچانی جاسکتی تھی کہ وہ ماریہ ہے۔

ان دونوں بیڈز کے درمیان سرجیکل آلات کی ٹرالی رکھی ہوئی تھی۔ اسسٹنٹ ڈاکٹر' لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں آپریشن کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ ایک نرس' ڈاکٹر کامران کو ایپرن پہنا رہی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں دستانے پہنتے ہوئے ذرا فاصلے پر کھڑی ہوئی بہن کو دیکھا۔ رائمہ اپنے چہرے پر آدھا نقاب باندھ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

کامران نے ایک ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈاکٹر محمود! پلیز رائمہ کو یہاں سے باہر نکال دو۔"

رائمہ تڑپ کر بھائی کے پاس آئی اور بولی۔ "نہیں بھائی جان! میں پہلی بار آپ کو اسسٹ کرنے آئی ہوں۔"

"سوری۔ تم ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مریضہ کے پاس نہیں' اپنی بھابی کی لاش کے پاس آئی ہو۔ تمہاری وجہ سے یہ کیس بگڑ سکتا ہے۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔"

"آنکھوں میں نہیں آئیں گے۔ دل میں ٹپکتے رہیں گے۔ میں نے کہہ دیا باہر جاؤ اور آئندہ آپریشن تھیٹر میں قدم رکھنے سے پہلے قسائی بننا سیکھو۔"

ڈاکٹر محمود رائمہ کا بازو تھام کر اسے باہر لے گیا پھر اس نے واپس آکر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ دونوں آپریشن بیڈز کے اوپر بڑی بڑی لائٹیں روشن ہوگئیں۔ تمام ڈاکٹر مُردہ سلمٰی کے بیڈ پر جھک گئے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے سلمٰی کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ کوئی اور محبت کرنے والا شوہر ہوتا تو اس کے منہ سے آہ ضرور نکلتی لیکن ڈاکٹر کامران کے چہرے پر پتھر جیسی سختی آگئی تھی۔ اس نے پندرہ برس کے عرصے میں امریکا اور یورپ کے نہایت نامور ماہرین تبدیلی قلب کے ساتھ ایک معاون کی حیثیت سے کام کیا تھا اور سرجری کا پہلا بنیادی سبق یہی سیکھا تھا کہ اپنوں کے لئے بھی سنگدل بن جایا کرو۔

ایک اسسٹنٹ نے ایک ٹرے پر سے نہایت دھاردار............ آلہ اٹھا کر کامران کے ہاتھ میں دیا۔ اس آلے سے سینہ اتنی مہارت سے چاک کیا جاتا کہ دل ثابت و سالم نکل آتا۔

اس نے آلے کو سلمٰی کے سینے پر رکھا۔ اس کی سماعت میں اس کی چاہنے والی شریکِ حیات کی آواز سرگوشی کرنے لگی۔ "میرے کامران! یہ دل تمہاری امانت ہے۔ جب چاہو لے لو۔ محبت میں دل مانگتے بھی ہیں اور اپنا سمجھ کر چھین بھی لیتے ہیں۔ آؤ چھین لو............"

آپریشن تھیٹر کے دوسرے حصے میں ایک ڈاکٹر مانیٹرنگ ٹی وی اسکرین کے پاس بیٹھا آپریشن کے عمل کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرا ہارٹ لنگ مشین اور بریدنگ بیگ کی حرکتوں کو نوٹ کر رہا تھا۔ یہ چیزیں ماریہ سے منسلک تھیں۔

پھر ایک باؤل میں انسانی دل نظر آیا۔ سلمٰی کو چہرے تک چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ کامران نے بڑے افسوس سے اس چادر کو دیکھا' جس کے نیچے زندگی کی ساتھی ہمیشہ کے لئے چھپ گئی تھی۔

تمام ڈاکٹروں کا رخ بدل گیا۔ وہ سب دوسرے بیڈ کے چاروں طرف آگئے' جہاں ماریہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سینے سے ہارٹ لنگ مشین کو ایک نلکی کے ذریعے منسلک کیا گیا تھا۔ اگر چند لمحوں کے لئے سینے میں دل نہ رہتا' تب بھی وہ ہارٹ لنگ مشین کے ذریعے سانسیں لے کر زندہ رہتی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر باؤل میں رکھا

ہوا سلمٰی کا دل کامران کے پاس لائی۔ وہ اپنی مہارت آزمانے میں مصروف ہو گیا۔ دوسرے ڈاکٹروں کے چہروں کے تاثرات سے پتا چل رہا تھا کہ کامران ماریہ کے سینے میں سلمٰی کے دل کی پیوند کاری کر رہا ہے اور ٹانکے لگاتا جا رہا ہے۔

پھر اس کے ہاتھ رک گئے۔ تبدیلی قلب کا عمل مکمل ہو گیا تھا۔ اب کامران کی سماعت میں ماریہ کی سرگوشی سنائی دے رہی تھی۔ "کامران! جس دل سے تم محبت کرتے تھے وہ دل مجھے دے دیا؟ ہائے ایسا سخی حاتم طائی بھی نہیں تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ محبت صورت شکل سے ہوتی ہے یا دل سے؟ اگر دل سے ہوتی ہے تو تم میری ہر دھڑکن کی آواز پر آؤ گے............"

ایک نرس کامران کے خون آلود دستانے اتارنے لگی۔ دوسری اس کے چہرے سے ماسک اور ایپرن اتار رہی تھی۔ وہاں سب کے چہروں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے کامران سے کہا۔ "ہم ہمیشہ آپریشن کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا آج کس دل سے مبارک دیں۔"

ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر نے کہا۔ "میں نے اپنی زندگی میں ہارٹ سرجری کے بڑے بڑے آپریشن دیکھے ہیں لیکن آج پہلی بار ایک ڈاکٹر کو اپنی بیوی کے سینے سے دل نکالتے دیکھا ہے۔"

کامران نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپریشن سے پہلے میں نے اپنی بہن کو سمجھایا تھا کہ یہاں قدم رکھنے سے پہلے قسائی بننا سیکھو۔ میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ وی آر بوچرز............"

یہ کہہ کر وہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے واش روم میں چلا گیا۔

☆------☆------☆

اس کمرے میں وہ تمام سامان تھا' جس کے ذریعے انسانوں پر بڑی درندگی سے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ دیواروں پر زنجیریں' کلہاڑیاں' آریاں اور تیز دھار والے خنجر لٹک رہے تھے۔ چھت پر رسی کا پھندا تھا' جہاں قیدیوں کو الٹا لٹکایا جاتا تھا۔ ایک میز پر اذیتیں پہنچانے کے کئی اوزار تھے۔ ڈرل مشین تھی' جس کے ذریعے گوشت پوست کے جسم میں سوراخ کیا جاتا تھا۔ ایک پلاس تھا اس سے ناخن کو پکڑ کر کھینچا جاتا تھا تو ناخن گوشت سے اکھڑنے لگتا۔ ایسی درندگی سے کسی مظلوم کو کیسی تکلیف پہنچتی ہوگی' یہ تو صرف وہی

مظلوم جانتا ہوگا۔ ایسے عقوبت خانوں کو دیکھ کر انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بے انتہا خوب صورت بنائی ہے' انسان نما درندے اسے بے انتہا بدصورت اور ہیبت ناک بناتے جا رہے ہیں۔

اس عقوبت خانے کا دروازہ کھلا۔ ایک پولیس افسر سپاہی کے ساتھ اندر آیا۔ ان کے پیچھے ڈاکٹر کامران ایک اور پولیس افسر اور دو سپاہی بھی تھے۔ کامران نے اندر آکر اس کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ ایک افسر نے کہا۔ "یوں تو میرا نام جبار خان ہے لیکن مجھے جابر خان کہا جاتا ہے کیونکہ جبر کرنے میں میرا کوئی ثانی نہیں ہے۔ جب میں ظلم کی انتہا کرتا ہوں تو بڑے سخت جان قسم کے فولادی ارادے رکھنے والے مجرم بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیتے ہیں۔"

کامران نے کہا۔ "تم ایک ہارٹ سرجری کے ڈاکٹر کو یہ کھلونے دکھا رہے ہو۔ تم نے بڑی سے بڑی درندگی کا مظاہرہ کرکے مجرموں کو مار ڈالا ہوگا۔ میں بھی کچھ ایسی ہی درندگی کرتا ہوں۔ ایک انسان کے سینے سے دل نکال لیتا ہوں اور اس دل سے دوسرے انسان کو نئی زندگی دیتا ہوں۔ یہ سبق یاد کر لو کہ زندگی لینے والے سے زندگی دینے والا طاقتور ہوتا ہے۔"

جبار خان اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ دوسرے افسر نے کہا۔ "مسٹر جبار خان آج شام تک پاکستان میڈیکل بورڈ ایسوسی ایشن کے چیئرمین چند بڑے ڈاکٹروں کے ساتھ آئیں گے۔ انہوں نے کل رات ہی کو فیکس کے ذریعے کہا تھا کہ ملک کے سب سے بڑے سرجن کو ہتھکڑی نہ پہنائی جائے جب تک تفتیش مکمل نہ ہو' سرجن کامران کو اے کلاس میں رکھا جائے۔"

جبار خان نے حقارت سے کہا۔ "پولیس کو تفتیش مکمل کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ ہم تو بستر پر لیٹے ہی لیٹے مجرم کو پورے ثبوت کے ساتھ اپنے جوتوں کے نیچے لے آتے ہیں۔"

"یہ مت بھولو کہ جوتے میں سوراخ ہو جائے تو بے گناہ قیدی کانٹے کی طرح چبھ جاتا ہے۔"

جبار خان نے کہا۔ "میرے سامنے کوئی زبان ہلانے کی جرأت نہیں کرتا لیکن تم اس لئے زبان لڑا رہے ہو کہ تمہیں اس ملک کے تمام میڈیکل بورڈز کے عہدیداروں کی

حمایتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ بہت سے اخبارات تمہاری بہترین صلاحیتوں کی تعریفیں کررہے ہیں۔"

"اس لئے تم مجھ پر ایسا کوئی ظلم نہیں کرسکتے، جس سے میرے جسم پر کوئی نشان آئے یا ہڈیوں پر چوٹ کی ایکسرے رپورٹ ملے۔ آئندہ اس عقوبت خانے میں بدترین مجرموں کو لایا کرو۔ شریفوں کو نہیں۔"

ایک سپاہی نے کامران کا بازو پکڑا۔ کامران اپنا بازو چھڑا کر ان کے درمیان چلتا ہوا عقوبت خانے سے باہر آیا۔ وہ عمارت کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے میں آیا۔ وہاں ایک بڑی سی میز کے اطراف دو اعلیٰ فوجی افسر بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک افسر نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

کامران بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے جبار خان ایک......... افسر اور دو سپاہیوں کے ساتھ کھڑا رہا۔ ایک اعلیٰ افسر نے کامران سے کہا۔ "اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھو۔"

اس نے میز پر دونوں ہاتھ رکھے۔ دوسرے اعلیٰ افسر نے کہا۔ "ہم نے تمہارا تحریری بیان پڑھا ہے اور یہ بیان سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ اسپتال کے بیسمنٹ میں اسلحے کا گودام نہیں ہے۔ تم نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کے لئے اپنے بیان میں جتنی باتیں بتائی ہیں، وہ سب غلط ثابت ہو رہی ہیں۔ اسپتال کے گیٹ کا دربان گواہ ہے کہ تمہاری بیوی تم سے خوف زدہ ہو کر بھاگ رہی تھی اور تم اس کا تعاقب کررہے تھے پھر تم نے انسپکٹر آفریدی کے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر بیوی کو اور زیادہ دہشت زدہ کیا۔ آخر اسے سوئمنگ پول کے پاس گولی مار دی۔"

کامران نے کہا۔ "میں نے گولی نہیں ماری۔ یہ دشمنوں کی چال ہے۔"

"انسپکٹر آفریدی کی رپورٹ سے تمہاری یہ بات درست ہے کہ اس کے ریوالور سے گولی نہیں چلائی گئی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے انسپکٹر آفریدی سے ریوالور چھینا لیکن اسے سوئمنگ پول کے کنارے پھینک کر اپنے پاس چھپائے ہوئے ریوالور سے بیوی کی جان لے لی۔"

"میں ڈاکٹر ہوں۔ ایسے ہتھیار کبھی نہیں رکھتا۔ نہ گھر میں، نہ جیب میں۔"

ایک افسر نے چند تصویریں اس کی طرف پھینک کر کہا۔ "انہیں دیکھو۔"

تصویریں بتا رہی تھیں کہ کامران کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ وہ کسی تصویر میں سلمٰی

کے پیچھے ٹریفک کے درمیان دوڑ رہا تھا اور کسی تصویر میں فٹ پاتھ پر اسے دوڑ رہا تھا۔

ایک افسر نے کہا۔ "یہ تمہاری بدنصیبی ہے کہ اس وقت دو فوٹو گرافر وہاں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے تمہاری درندگی کی یہ تصویریں اتاری ہیں پھر فائیو اسٹار ہوٹل کے عملے میں سے کئی چشم دید گواہوں نے بیان دیا ہے کہ تم نے اپنی بیوی کو سرعام دوڑا دوڑا کر دہشت زدہ کر کے مارا ہے۔"

کامران نے پوچھا۔ "کیا آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے کہ ہمارے ملک کے خلاف بہت گہری سازشیں کی جا رہی ہیں۔ اس شہر میں ہتھیار پہنچانے والی ایجنسیاں جانتی ہیں کہ راستوں کی ناکابندیاں کرنے والے اور گاڑیوں کی چیکنگ کرنے والے ایمبولینس کو روک کر چیک نہیں کرتے کیونکہ اس میں لیٹے ہوئے مریض کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے پھر یہ اسپتال ایک ایسی جگہ ہے جہاں مریضوں کو نئی زندگی دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں لہٰذا ایسی جگہ ہتھیاروں کا خفیہ گودام نہیں بنایا جائے گا لیکن موت کے سوداگروں کو اسپتال کے مریضوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں نے اور سلمٰی نے اتفاق سے یہ راز معلوم کر لیا۔ دشمن چاہتے تھے کہ یہ راز ہمارے ذریعے بیسمنٹ سے باہر نہ جائے اور ہمیں اتنی دور تک دوڑایا جائے کہ تب تک وہ بیسمنٹ کو ہتھیاروں سے خالی کر لیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے میری بیوی سلمٰی کے پیچھے ایک ریوالور والے کو دوڑایا اور مجھ سے کہا گیا کہ میں ایک منٹ کے بعد ان کے پیچھے جاؤں اور اپنی بیوی کی جان بچاؤں مگر میں کیسے یقین دلاؤں کہ سلمٰی کا تعاقب کرنے والے نے ہی اسے قتل کیا ہے۔"

ایک افسر نے کہا۔ "ہمارے آدمی اس ریوالور کو تلاش کر رہے ہیں جس سے گولی چلائی گئی تھی۔ تمہیں قاتل ثابت کرنے کے لئے آلۂ قتل کو عدالت میں پیش کرنا ضروری ہے۔ باقی جتنے ثبوت اور گواہ ہیں، وہ سب تمہارے خلاف ہیں۔"

"میں انسانیت اور محبت کے نام پر پوچھتا ہوں۔ سلمٰی میری وفادار بیوی تھی۔ میں اسے دل و جان سے چاہتا تھا پھر میں اسے خواہ مخواہ کیوں قتل کروں گا۔"

"دولت میں اتنی گرمی ہوتی ہے کہ محبت پسینہ بن کر بہہ جاتی ہے۔"

"کیا آپ مجھے دولت کا لالچی سمجھتے ہیں؟ اگر میں ایسا ہوتا تو امریکا اور یورپ چھوڑ کر پاکستان نہ آتا۔ میں نے صرف اپنی قوم کے لئے ہارٹ سرجری کے تجربات حاصل کئے ہیں۔"

"سیاسی لیڈر بھی قوم کی خدمت کے دعوے کرتے ہیں۔ لیکن صرف پچاس لاکھ روپے کے چیک پر پھسل جاتے ہیں۔"

ایک اعلیٰ افسر نے وہ چیک کھول کر دکھایا' جس پر ماریہ نے کامران کے نام پچاس لاکھ روپے لکھ کر دستخط کئے تھے۔ "اسپتال کی انتظامیہ کہتی ہے کہ یہ رقم اسپتال کے لئے ڈونیٹ کی گئی تھی مگر تمہارے نام کا چیک اس کی نفی کرتا ہے۔"

کامران نے کہا۔ "سانچ کو آنچ کیا ہے۔ آپ ماریہ سے سچائی معلوم کر سکتے ہیں۔"

دوسرے اعلیٰ افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ نے اسے نئی زندگی دی ہے۔ اسے ایک نئے صحت مند دل کا عطیہ دینے کے لئے اپنی بیوی کو قتل کیا۔ کیا اس قدر احسان مند ہونے کے بعد وہ آپ کے خلاف بیان دے گی۔"

کامران چند لمحوں تک اس اعلیٰ افسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "اب میں کچھ سمجھ رہا ہوں۔ آج ہماری دنیا میں ہتھیاروں کا کاروبار سرفہرست ہے۔ ہر ملک' ہر شہر میں اسلحے کی ترسیل کے لئے ان کی ایجنسیاں ہوتی ہیں۔ ان ایجنسیوں کے ایجنٹ یا دلال ہر شہر میں ہوتے ہیں۔ وہ دلال یہاں بھی موجود ہیں۔"

اعلیٰ افسر نے میز پر گھونسا مار کر کہا۔ "کیا تم ہمیں دلال کہہ رہے ہو؟"

"آپ گرمی نہ دکھائیں۔ میں نے آپ کا نام نہیں لیا ہے۔ مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ اسلحے کے دلال میرے آگے نہیں' پیچھے ہیں۔ پیچھے نہیں تو اس عمارت میں یا اس شہر میں ہیں۔"

"کیا تم ان کی نشاندہی کر سکتے ہو؟"

"مجرموں کی نشاندہی کرنے اور انہیں گرفتار کرنے کی تنخواہ آپ لیتے ہیں اور میں تو زیر حراست ہوں۔ بھلا کیا نشاندہی کروں گا۔"

ایک سپاہی نے کمرے میں آ کر سیلوٹ کیا پھر کہا" سر! ملزم کامران کا وکیل حاضر ہونا چاہتا ہے۔"

افسر نے کہا۔ "اسے بھیج دو۔"

سپاہی چلا گیا۔ افسر نے کامران سے کہا۔ "تمہارے قاتل ہونے کے ایسے واضح ٹھوس ثبوت اور چشم دید گواہ ہیں کہ عدالت بھی تمہیں عارضی رہائی نہیں دے گی۔"

وکیل نے آ کر اعلیٰ افسر سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ خادم کو بیرسٹر وقار احمد کہتے ہیں۔ میں مِس ماریہ کے ڈیڈی کا بھی وکیل رہ چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ماریہ کے دادا نے مجھے اپنے اخراجات سے بیرسٹر بنایا تھا۔"

افسر نے کہا۔ "تشریف رکھیں۔ کیا آپ ضمانت کے سلسلے میں آئے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں نے بے شمار قتل کے کیس بھگتائے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر کامران کی ضمانت نہیں ہو سکے گی۔"

"اس ملک کے تمام میڈیکل ایسوسی ایشن کے چیئرمین اور ملک کے بڑے بڑے نامور ڈاکٹر ان کے حمایتی ہیں۔ ان سب کی حمایت کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انہیں شاید پھانسی نہیں ہو گی لیکن عمر قید ضرور ہو گی۔" پولیس کے افسر نے کہا۔

بیرسٹر نے کہا۔ "میں اس ڈاکٹر کو پھانسی دلاؤں گا۔"

کامران نے چونک کر بیرسٹر کو دیکھا پھر کہا۔ "وقار صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ سے میری کوئی ذاتی دشمنی ہے؟"

"نہیں تم ماریہ سے دشمنی کر رہے ہو۔ اس کی کروڑوں کی جائیداد حاصل کرنے کے لئے تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔ پھر کسی دن ماریہ کو بھی اس دنیا سے رخصت کر دو گے۔ میں نے اس فیملی کا نمک کھایا ہے۔ جس کے دادا نے مجھے بیرسٹر بنایا' میں اس نادان لڑکی کو تمہارے ہاتھوں مرنے نہیں دوں گا۔"

کامران نے کہا۔ "آپ اسے نادان کہہ رہے ہیں۔ مگر میں نے اسے نادان نہیں بنایا ہے۔"

"بنایا ہے' ایک سچے عاشق ہونے کا ثبوت دینے کے لئے اسے اپنی بیوی کے دل کا تحفہ دیا ہے۔ اس نادان لڑکی نے تحفہ وصول کرنے سے پہلے ہی اپنی تمام دولت اور جائیداد تمہارے نام لکھ دی ہے۔"

بیرسٹر نے ماریہ کی وصیت کی فوٹو اسٹیٹ کاپی فائل سے نکال کر اعلیٰ افسر کو دیتے ہوئے کہا۔ "مِس ماریہ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس وصیت کو راز میں رکھوں لیکن میں وعدہ پورا کروں گا تو اس خاندان سے نمک حرامی ہو گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ماریہ کو یہ بات معلوم ہو گی تو وہ مجھے ٹھوکر مار کر کوئی دوسرا وکیل کر لے گی۔ کوئی بات نہیں میں ٹھوکر کھا لوں گا لیکن اپنے محسن کی اولاد کو اس ڈاکٹر کے قریب میں نہیں آنے دوں

گا۔"

افسر اس وصیت کو پڑھ رہا تھا پھر اس نے بیرسٹر وقار احمد کے ہاتھ کو مصافحے کے انداز میں تھام کر کہا۔ "آپ نے واقعی بیرسٹر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ آپ نمک حلال بھی ہیں اور آپ نے قانون کی برتری بھی قائم رکھی ہے۔ اب اس مسیحا بننے والے ڈاکٹر کو کوئی طاقت پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکے گی۔"

ڈاکٹر کامران حیران و پریشان کبھی اس افسر اعلیٰ کو اور کبھی بیرسٹر وقار احمد کو دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے پچاس لاکھ روپے کا چیک دینے والی ماریہ نے محض محبت اور نیک دلی سے اس کے نام وصیت بھی لکھ دی ہوگی۔ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر لالچی نہیں ہے۔ اس کی چھوڑی ہوئی تمام دولت مریضوں کو نئی زندگیاں دینے میں صرف کرے گا لیکن دل سے کی جانے والی محبت اور روح سے کی جانے والی نیکی ایک ڈاکٹر کے لئے پھانسی کا پھندا بن چکی تھی۔

☆-------☆-------☆

ماریہ بستر کے سرہانے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ رائمہ اس کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی پھر اس کے بازو سے بلڈ پریشر کا آلہ کھول کر ٹرے پر سے جوس کا ایک گلاس اسے دیتی ہوئی بولی۔ "آپ بالکل نارمل ہیں اسی طرح دوائیں اور غذائیں استعمال کرتی رہیں گی تو جلد ہی چلنے پھرنے اور دوڑنے لگیں گی۔"

ماریہ نے کہا۔ "میری خدمت ایک نرس بھی کر سکتی ہے لیکن آپ لیڈی ڈاکٹر ہو کر کئی بار میرے پاس آتی رہتی ہیں اور ایسا خیال رکھتی ہیں جیسے ہمارے درمیان کوئی گہرا رشتہ ہو۔"

رشتے کے ذکر پر رائمہ نے ماریہ کے سینے کو دیکھا۔ اس کے کانوں میں دھک دھک دھک کی آوازیں سنائی دیں پھر اس کی بھابی سلمٰی نے جیسے سرگوشی کی۔ "میں یہاں ہوں۔ یہاں ہوں..........."

ماریہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے ڈاکٹر! آپ اچانک خاموش کیوں ہو گئیں؟"

رائمہ نے چونک کر کہا۔ "وہ بات یہ ہے کہ بھائی جان یاد آ گئے تھے۔"

"آپ کے بھائی جان نے مجھے نئی زندگی دی ہے لیکن مجھے ایک بار بھی دیکھنے نہیں آئے۔ ڈاکٹر زیدی کہہ رہے تھے کہ وہ چھٹی لے کر پہاڑی علاقے میں گئے ہیں۔"

رائمہ نے صدمے سے کہا۔ "ہاں بڑی لمبی چھٹی لے کر گئے ہیں آپ دعا کریں وہ جلد ہی لوٹ آئیں۔"

"میری تو دعا ہے وہ ابھی چلے آئیں لیکن آپ کی بھابی نہیں آنے دیں گی۔"

"بھابی؟" ہزار ضبط کے باوجود رائمہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ جلدی سے منہ پھیر کر آنکھیں پونچھنے لگی۔ ماریہ نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔

"آپ رو رہی ہیں؟"

وہ پلٹ کر بولی۔ "نہیں تو۔ بس یونہی بھابی کی یاد آ گئی تھی۔"

ماریہ نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔ "آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔"

"نہیں بھلا میں کیا چھپاؤں گی؟ اوہ سوری۔ دوسرے مریض کو اٹینڈ کرنا ضروری ہے۔"

وہ فوراً ہی پلٹ کر کمرے سے باہر آئی۔ باہر برآمدے میں ایک عورت دیوار کی طرف منہ کئے کھڑی تھی۔ جب رائمہ اس کے قریب سے گزر گئی تو اس عورت نے پلٹ کر ماریہ کے کمرے کی طرف دیکھا پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے پر آئی۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس نے دستک دے کر پوچھا۔ "میں اندر آ سکتی ہوں؟"

ماریہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "آیئے۔"

وہ اندر آ کر بولی۔ "تم مجھے نہیں جانتیں مگر میں تمہیں جانتی ہوں۔ وہ اس طرح کہ میں سلمٰی کی ماں اور ڈاکٹر کامران کی ساس ہوں۔"

ماریہ نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ سے پہلی بار مل رہی ہوں۔ بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ آئیں یہاں۔ میرے پاس بیٹھیں۔"

وہ بستر کے سرے پر بیٹھ کر بولی۔ "میں پہلی بار نہیں آئی ہوں۔ تم سے ملنے کئی بار یہاں آئی لیکن ڈاکٹروں نے اجازت نہیں دی۔ وہ کہتے تھے تم کمزور ہو۔ تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہئے جس سے تمہیں شاک پہنچے۔"

وہ تعجب سے بولی۔ "بھلا ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ مجھے شاک پہنچے؟"

"میرا خیال ہے اب تمہیں کسی طرح کا صدمہ نہیں پہنچے گا۔ میں باہر کھڑی سن رہی تھی۔ رائمہ نے ابھی کہا تھا کہ تم بالکل نارمل ہو۔ میں حیران ہوں کہ جب تم نارمل ہو تو

تم سے حقیقت کیوں چھپائی جا رہی ہے؟"

اس نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیسی حقیقت؟"

"یہی کہ اب تم میری سلمیٰ ہو۔ اس وقت تمہارے سینے میں میری بیٹی کا دل دھڑک رہا ہے۔"

"کیا؟" ماریہ گم صم سی ہو کر اس خاتون کو تکنے لگی۔

خاتون نے کہا۔ "تم اپنے دل پر بوجھ نہ ڈالنا۔ وہ بوجھ میری بیٹی کے دل پر پڑے گا۔"

ماریہ نے اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "سلمیٰ .... سلمیٰ کو کیا ہوا تھا؟"

"اسے قتل کیا گیا تھا اور جس نے اسے قتل کیا ہے۔ وہ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ہے۔"

"وہ ظالم درندہ کون ہے؟ اسے سلمیٰ سے کیا دشمنی تھی؟"

"کسی ایک کی محبت کو حاصل کرنے کے لئے دوسری کو ٹھکرانا پڑتا ہے۔ اس نے تمہیں حاصل کرنے کے لئے اسے قتل کر دیا جب قتل سے پہلے پچاس لاکھ روپے کا چیک مل سکتا ہے تو اس کے دل کا نذرانہ پیش کرنے کے بعد اسے اور زیادہ دولت مل سکتی تھی۔"

خاتون کی باتیں اب ماریہ کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔ وہ خلا میں تک رہی تھی۔ اسے کامران نظر آ رہا تھا لیکن یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی خاطر وہ اپنی بیوی کو دل و جان سے چاہنے کے باوجود قتل کر سکتا ہے۔

☆======☆======☆

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے ایک دیوار سے لگا بیٹھا تھا پھر اس نے حیرانی سے دیکھا۔ سلاخوں کے باہر ماریہ آہستہ آہستہ چلتی آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا سلاخوں کے پاس آ کر بولا۔ "تم؟ اور یہاں؟"

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "جہاں ڈاکٹر ہو گا وہاں مریضہ آئے گی۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ آپریشن کو صرف تین ہفتے ہوئے ہیں۔ تمہیں آرام کرنا چاہئے۔"

"ماریہ زندہ ہو گی تو آرام کرے گی۔ تم سے سلمیٰ ملنے آئی ہے۔"

کامران نے بے اختیار ماریہ کے سینے کو دیکھا۔ اس کے کانوں میں دھک دھک کی جانی پہچانی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ماریہ نے دل کی جگہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیا تم سلمیٰ کے دل پر اس طرح ہاتھ رکھتے تھے؟"

وہ نظریں چرانے لگا۔ ماریہ نے کہا۔ "کیا اس دل سے کان لگا کر سلمیٰ کے دل کی دھڑکن نہیں سنو گے۔ تم تو دلوں کے مسیحا ہو۔ مجھے دیکھو۔ محبت کرنے والوں کی صورتیں بدل جاتی ہیں۔ دل کبھی نہیں بدلتے۔"

اس نے ماریہ کو دیکھ کر کہا۔ "تم میری محنت پر پانی پھیر رہی ہو۔ تمہیں اسپتال سے نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"میں اسپتال سے اور پولیس اسٹیشن سے بہت کچھ معلوم کر کے آئی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے ایک چیک نے اور رازداری سے لکھی ہوئی وصیت نے تمہیں مسیحا سے قاتل بنا دیا ہے مگر دیکھ لو میں چٹان کی طرح اس لئے مضبوط بن رہی ہوں کہ اس سینے میں جو دل ہے وہ تمہاری امانت ہے۔ یہ دل دنیا والوں کی دشمنی سے نہیں ٹوٹے گا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم مضبوط ارادوں کی مالک ہو۔ اس کے باوجود تمہیں پراپر ٹریٹمنٹ کے لئے اسپتال میں رہنا چاہئے۔"

"تم کہتے ہو تو اسپتال میں رہوں گی لیکن تمہیں بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اپنی دولت پانی کی طرح بہاتی رہوں گی۔"

"اس طرح مجھ سے دشمنی کرو گی۔ میرے نام وصیت لکھ چکی ہو۔ اب تمام دولت بھی مجھ پر لٹاؤ گی تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ میں نے تمہیں دل کا عطیہ دینے کے لئے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔"

ماریہ نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ اچانک ایک خاتون نے آہنی سلاخوں کے پاس آ کر کہا۔ "داماد جی! یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ تم نے اس لڑکی کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے میری بیٹی کو قتل کیا ہے۔"

"ممی! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں سلمیٰ سے کتنی محبت کرتا تھا۔ کوئی مجھے ساری دنیا کی دولت دیتا' تب بھی میں اپنی سلمیٰ پر آنچ نہ آنے دیتا۔ آپ چشم دید گواہ کے طور پر میری اور سلمیٰ کی محبت کے سلسلے میں تحریری بیان دے سکتی ہیں۔"

"میں بیان دے چکی ہوں کہ قتل سے ایک دن پہلے سلمٰی تم سے طلاق مانگ رہی تھی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"وہی جو قانون کی آنکھیں اب دیکھ رہی ہیں۔ میں نے بیان دیا ہے کہ میری بیٹی کو تمہاری اور ماریہ کی سازشوں کا علم ہو گیا تھا۔ وہ بات بڑھنے سے پہلے طلاق لے کر تمہاری زندگی سے دور ہو جانا چاہتی تھی لیکن تمہیں ماریہ کے لئے میری بیٹی کے دل کی ضرورت تھی۔ اس لئے تم نے اسے طلاق نہیں دی۔ اسے اپنے قریب رکھا۔ پھر درندے بن کر ان سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئے ہو۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ مجھے ایک نہایت شریف اور بے ضرر انسان کہتی تھیں۔ مجھ سے میٹھے لہجے میں باتیں کرتی تھیں مگر.........."

"مگر یہ کہ تم میٹھے نہ رہے۔ اپنی معصوم بچی کے قاتل کے لئے اب تو میں یہاں سے عدالت تک زہر اگلتی رہوں گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ساس مصیبت ہوتی ہے' میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں صرف مصیبت نہیں ہوں۔ پھانسی کا پھندا بھی ہوں۔"

وہ اسے نفرت سے دیکھ کر چلی گئی۔ ماریہ نے کہا۔ "تم نے بے شمار مریضوں کو دل کی دولت دی ہے۔ اگر صرف ایک سلمٰی کا دل مجھے نہ دیتے تو یوں میرے ساتھ بدنام نہ ہوتے اور قتل کے الزام میں اپنی برسوں کی شہرت اور عزت کو داؤ پر نہ لگاتے۔"

"آپریشن کی ویٹنگ لسٹ میں تمہارا نام تھا۔ اس لئے سلمٰی کا دل تم ہی کو ملنا تھا۔ میں نے اسپتال کے قواعد کے مطابق کام کیا تھا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ اسلحے کا کاروبار کرنے والے دہشت گرد مجھے اور سلمٰی کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سلمٰی کو قتل کر دیا اور مجھے یہ لوگ پھانسی کے پھندے تک ضرور پہنچائیں گے لیکن یہ میری ساس عاصمہ خاتون میرے دل و دماغ کو' میرے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی اچانک دشمنی پر اتر آئی ہیں۔"

"اور جس بیرسٹر وقار احمد پر ہمارا پورا خاندان اعتماد کرتا تھا اس نے بھی میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ صرف تمہارے ساتھ نہیں میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے جو ہمارے اپنے تھے' وہ بدترین مخالف ہو چکے ہیں۔"

"کیا تم تکلیف محسوس کر رہی ہو؟"

"تکلیف نہیں ہے' شکایت ہے۔ تم نے اتنی دیر میں ایک بار بھی اس دل پر ہاتھ نہیں رکھا۔ اسے میرا نہ سہی' سلمٰی کا ہی سمجھ کر ہاتھ رکھو۔ اسے آرام آ جائے گا۔"

کامران نے اس کی قمیض کو دیکھا۔ وہ اپنی قمیص کا ایک ایک بٹن کھولنے لگی۔ گہرے رنگ کی قمیص سے گورے بدن کا دن نکلنے لگا۔ دل کی طرف ابھار کے آس پاس ٹانکے لگے ہوئے تھے وہ بولی۔ "میں نے اسپتال کی ڈاکٹروں سے کہہ دیا ہے کہ ان ٹانکوں کے کھلنے کا وقت آئے تو اسے تم ہی کھولو گے۔"

"یہ خواہ مخواہ کی ضد ہے۔"

"ضد نہیں' یہ دل جس کا ہے وہی میرے بدن کو ہاتھ لگائے گا۔ میرے اندر چھپی ہوئی سلمٰی کہتی ہے کہ اس حیا والی تک تمہارا ہی ہاتھ پہنچے گا۔"

وہ بول رہی تھی اور کامران کو سلمٰی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "آپ کے سامنے جو کچھ ہے سب میرا ہے۔ مجھ پر ہاتھ رکھو۔ مجھے ذرا سکون دو۔"

کامران نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا پھر اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ کو سلمٰی اور ماریہ کے مشترکہ دل پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ واضح طور پر سلمٰی کی دھڑکنوں کو محسوس کر رہا تھا۔

☆------☆------☆

ڈاکٹر نارمن نے وائس چانسلر جے ڈیسوزا کے ہاتھ کو اس کے دھڑکتے ہوئے دل سے ہٹایا۔ پھر کہا۔ "آپ اس قدر تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ آپ کو یہ خود سمجھنا چاہئے کہ آپ بار بار اپنے دل پر ہاتھ رکھیں گے یا کسی وجہ سے صرف دل پر توجہ دیتے رہیں گے تو یہ احساس حاوی ہو گا کہ آپ کے سینے میں اپنا نہیں کسی دوسرے کا دل ہے۔"

وائس چانسلر جے ڈیسوزا نے کہا۔ "ڈاکٹر! اس میں غلط کیا ہے۔ میرے سینے میں واقعی میرا اپنا دل نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر کامران کو دعائیں دیتا ہوں۔ آج سے چھ برس پہلے اس نے آپریشن کیا تھا۔ نہ جانے کس بیچارے کے دل کو میرے اندر زندہ رکھے ہوئے ہے اور اس دل کے ساتھ میں بھی زندگی پا رہا ہوں۔"

ڈاکٹر نارمن نے کہا۔ "ڈاکٹر کامران واقعی مارویلس ڈاکٹر تھا۔ تبدیلی قلب کے درجنوں کیس ایسے ہیں کہ آپریشن کے بعد مریض چند دنوں یا چند مہینوں تک زندہ رہتا ہے۔ پھر دل کی پیوند کاری میں کوئی ایسا نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ بیچارہ زیادہ جی نہیں پاتا۔"

"بے شک میں چھ برس سے زندہ ہوں اور وائس چانسلر کے فرائض بخوبی انجام

دے رہا ہوں۔ آپریشن کے بعد کچھ عرصے تک پرابلمز پیدا ہوتے رہے۔ اس کے بعد اب تک نارمل زندگی گزار رہا ہوں۔"

"پھر آج کیا بات ہو گئی کہ آپ صدمہ محسوس کر رہے ہیں؟ میں نے اچھی طرح چیک اپ کیا تھا۔ آپ کا دل بالکل صحیح طور سے کام کر رہا ہے۔"

"ڈاکٹر! اگر میری موت کا وقت قریب ہوتا۔ یا میرا اپنا کوئی مرجاتا مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا لیکن آج کا اخبار پڑھ کر بہت دکھ ہو رہا ہے۔ وہ سامنے میز پر اخبار ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ پاکستان میں ہارٹ سرجری کے ماہر ڈاکٹر کامران کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت ہیں کہ وہاں کے میڈیکل بورڈ کے بڑے بڑے عہدیدار بھی اسے سزائے موت سے نہیں بچا سکیں گے۔"

ڈاکٹر نارمن نے میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھا۔ پھر کہا۔ "سویٹ! میں یقین نہیں کر سکتا کہ ڈاکٹر کامران دولت کے لالچ میں کسی مالدار لڑکی کو اپنانے کے لئے اپنی بیوی کو قتل کرے گا۔ یہاں وہ لاکھوں ڈالر کماتا تھا۔ میں نے اسے منع کیا تھا کہ پاکستان نہ جائے لیکن وہ اپنے وطن کی محبت میں چلا گیا۔"

"جو لالچی نہیں ہوتے وہ وطن میں رہ کر اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ میں کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ کسی کو قتل کر سکتا ہے۔ وہ دوسروں کو زندگی دیتا ہے۔ زندگی لیتا نہیں ہے۔ اس نے مجھے زندگی دی ہے۔ میرا ضمیر پوچھ رہا ہے کہ میں اسے کس طرح زندگی دے سکتا ہوں؟"

"بہت مشکل ہے۔ جو کام نہیں ہو سکتا اس کے لئے اتنا افسوس کرنے سے آپ بیمار پڑ جائیں گے۔ آپ صبر کریں اور اپنے تعلیمی فرائض کی طرف دھیان دیتے رہیں۔"

ڈاکٹر نارمن اس سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد وائس چانسلر جے ڈیسوزا تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر میز کے پاس آ کر ایک خط لکھنے لگا۔ اس نے خط لکھنے کے بعد اسے لفافے میں بند کیا پھر اس پر ڈاکٹر ڈین مارکوس کا نام اور پتہ لکھا۔ وہ خط دوسرے دن پیرس کے ڈاکٹر ڈین مارکوس کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

ڈین مارکوس پلاسٹک سرجری کا ماہر تھا۔ اس نے وائس چانسلر کے اس خط کو پڑھا۔ اس میں ڈاکٹر کامران اور اس کے موجودہ تشویش ناک حالات کی تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ پھر یہ بھی لکھا تھا کہ مسٹر ڈین مارکوس ہم پرانے ساتھی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر کامران

نے تمہارے جوان بیٹے کی کامیاب ہارٹ سرجری کی تھی۔ آج میرا ضمیر کہہ رہا ہے کہ تمہارے ضمیر سے بھی پوچھوں کہ ہم کس طرح ڈاکٹر کامران کو بے قصور ثابت کر سکتے ہیں؟ اگر تم ٹیلی گرام کرو گے یا فون کرو گے تو میں تم سے ملاقات کرنے آ جاؤں گا۔

ڈاکٹر ڈین مارکوس نے ٹیلی فون کے ذریعے وائس چانسلر جے ڈیسوزا سے فون پر رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ "تم کسی بھی پہلی فلائٹ سے چلے آؤ۔ ہم سوچیں گے کہ اپنے محسن کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ اگر ناکام رہے، تب بھی اس سے آخری بار ملنے جائیں گے اور اس مسیحا کے ہاتھوں کو چوم کر آئیں گے۔"

جے ڈیسوزا تیسرے دن صبح اتوار کو پیرس پہنچا۔ ڈاکٹر ڈین مارکوس اسے ائرپورٹ سے سیدھا نوٹرے ڈیم کے چرچ میں لے گیا۔ یہ وہی چرچ ہے جہاں کے ایک کبڑے عاشق کی کہانی "ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم" مشہور ہے۔

اتوار کی صبح چرچ میں بڑی بھیڑ تھی۔ لوگ عبادت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ فادر بنجامن ایک اونچی جگہ کھڑے مقدس انجیل کے مطابق وعظ کر رہے تھے۔ جے ڈیسوزا نے ڈاکٹر ڈین مارکوس سے راستے ہی میں پوچھا تھا۔ "کیا سفری سامان گھر میں رکھے بغیر نوٹرے ڈیم جانا ضروری ہے؟"

"ہاں بہت ضروری ہے۔ میں نے ڈاکٹر کامران کے سلسلے میں فادر بنجامن سے مشورہ کیا تھا۔ فادر بھی ڈاکٹر کامران کو محسن سمجھتے ہیں۔ اس نے چرچ کی ایک نن کی کامیاب ہارٹ سرجری کی تھی۔ وہ بھی کامران کے تحفظ کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

عبادت کے اختتام پر لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر ڈین مارکوس اور وائس چانسلر جے ڈیسوزا چرچ کے ہال میں بیٹھے رہے۔ فادر نے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے کمرے میں گفتگو کی جائے۔"

ڈاکٹر نے فادر سے وائس چانسلر کا تعارف کرایا پھر وہ چرچ کے پیچھے ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ فادر بنجامن نے کہا۔ "ڈاکٹر کامران ایک نیک اور فرض شناس ڈاکٹر ہے۔ خداوند یسوع اس پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ میں نے آل پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے چیئرمین سے فیکس کے ذریعے تفصیلی معلومات حاصل کی ہیں۔ وہاں کچھ ڈاکٹر حاسد ہیں لیکن اکثریت ایسے ڈاکٹروں کی ہے جو ڈاکٹر کامران کی قدر کرتے ہیں اور سب کی مشترکہ رائے یہ ہے کہ کامران بے قصور ہے۔ اسے کسی سازش کے تحت آہنی سلاخوں

کے پیچھے پہنچا دیا گیا ہے۔"

وائس چانسلر نے کہا۔ "ہمیں یہی بات پریشان کر رہی ہے کہ ایک بے قصور اور باصلاحیت ڈاکٹر بدنام ہو رہا ہے اور اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔"

"ڈاکٹر کامران کو چاہنے والے ڈاکٹر اور اعلیٰ عہدیدار مقدمے کی تاریخیں بڑھاتے جارہے ہیں۔ فی الوقت کامران کو زندہ رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے جس پر وہ عمل کررہے ہیں لیکن ایسا کب تک ہوگا؟"

"فادر! یہی سوال ہمیں پریشان کررہا ہے اگر اسے سزائے موت ہوگی تو ہم شرم سے مرجائیں گے۔"

"میں نے ورلڈ میڈیکل ایسوسی ایشن کے عہدیداران سے بھی اس سلسلے میں رابطہ کیا تھا۔ دنیا کے تمام مشہور و معروف ڈاکٹر ایسے ہیں جو ڈاکٹر کامران کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کا مشترکہ بیان ہے کہ یہ پاکستان کا داخلی معاملہ ہے۔ پھر یہ کہ اس کے پس پردہ ایک بہت بڑی............ مافیا کارفرما ہے اور وہ ہے اسلحے کی مافیا۔ یہ ڈاکٹر کامران کی بدقسمتی ہے کہ اس نے اسلحے کے اسمگلروں کو اور اسلحے کے ایک بڑے خفیہ گودام کو دیکھ لیا ہے۔ پاکستان میں اسلحہ سپلائی کرنے کی جو خفیہ ایجنسی ہے' وہ کامران کو جیل سے باہر نہیں آنے دے گی۔ اسے پھانسی کے تختے تک پہنچا کر رہے گی۔"

معاملہ بہت پیچیدہ تھا۔ فی زمانہ سب سے نفع بخش تجارت اسلحے کی ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل' جہاں دنیا کی تمام قوموں کی سلامتی اور تحفظ کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس سلامتی کونسل کے پانچ بڑے اہم ارکان امریکا' برطانیہ' چین' فرانس اور روس سب سے زیادہ اسلحے کا کاروبار کرتے ہیں۔

ان ممالک میں سب سے پہلا نمبر امریکا کا ہے۔ جہاں اربوں ڈالر کی لاگت سے طرح طرح کے خطرناک جان لیوا ہتھیار تیار کئے جاتے ہیں اور انہیں دوسرے ضرورت مند ممالک میں فروخت کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جو ممالک ضرورت مند نہیں ہوتے وہاں سیاسی چالبازیوں کے ذریعے خانہ جنگی کی صورت پیدا کی جاتی ہے۔ ایک طرف اس ملک کے حکمران ان سے بڑی تعداد میں اسلحہ خریدنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دوسری طرف خفیہ ایجنسیاں اسی ملک کے باغیوں یا سیاسی اپوزیشن پارٹیوں کو اسلحہ سپلائی کرتی ہیں۔

ڈاکٹر ڈین مارکوس نے کہا۔ "میں محض ایک پلاسٹک سرجری کا ماہر ہوں۔ نہ سیاست جانتا ہوں اور نہ ہی اسلحہ سپلائی کرنے والی خفیہ ایجنسیوں تک پہنچ کر ڈاکٹر کامران کی زندگی کی بھیک ان سے مانگ سکتا ہوں۔"

جے ڈیسوزا نے کہا۔ "میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ میں ایک وائس چانسلر ہوں۔ میڈیکل یونیورسٹی کے باہر کی پُرفریب دنیا کو نہیں جانتا ہوں۔"

فادر نے کہا۔ "مجھے بھی یہی کہنا چاہئے۔ میں مذہبی تعلیمات کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ خفیہ ایجنسیوں والے کہاں پائے جاتے ہیں۔ وہ پُرامن شہریوں کی طرح پُرتعیش زندگی گزار رہے ہوں گے۔ ہم ان کی اصلیت معلوم نہیں کرسکتے۔"

وہ تینوں اپنی اپنی کرسیوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ فادر بنجامن نے کہا۔ "جب فلاح پانے کے تمام دنیاوی راستے بند ہوجاتے ہیں تب خدا کی طرف سے کوئی ایسا دروازہ کھل جاتا ہے' جس کے بارے میں ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔"

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص وہاں نظر آیا۔ فادر نے کہا۔ "وہ دیکھو دروازہ کھل چکا ہے۔ اللہ کی مدد آ پہنچی ہے۔ کم آن حیات محمد! یہ دونوں میرے وہی مہمان ہیں جن کا ذکر میں کرچکا ہوں۔"

اس نے دروازے کو بند کیا پھر قریب آکر جے ڈیسوزا اور ڈین مارکوس سے مصافحہ کیا۔ فادر نے ان سب کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ حیات محمد نے ایک کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "میں ایک افغانی ہوں۔ جب روس افغانستان پر مسلط ہونے کے لئے جنگ لڑ رہا تھا تب میں بوڑھے والدین کے ساتھ پاکستان کے پناہ گزینوں کے کیمپ میں آگیا اور افغانستان کی آزادی کے لئے جہاد میں حصہ لینے لگا۔ جہاد کے دوران میں نے طرح طرح کے جدید ہتھیار دیکھے اور انہیں استعمال کرنا بھی سیکھتا رہا۔"

وہ اپنی داستان سناتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ان دنوں وہ عالمی سیاست سے واقف نہیں تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ روس افغانستان میں آکر پورے جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے لئے خطرہ بن سکتا ہے اور برفانی علاقوں میں رہنے والی روسی قوم کی یہ ازلی خواہش ہے کہ وہ جنوبی ایشیا کے گرم پانی تک پہنچ سکے۔

حیات کو رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ روس تو دشمن ہے ہی لیکن امریکا بھی دوست اور ہمدرد نہیں ہے۔ اسے بھلا کیا پڑی ہے کہ روس کو پاکستان کی مدد سے بھگا کر افغانستان کو

ایک آزاد اور خود مختار ملک بنائے؟ وہ آزادی کے نام پر وہاں اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے روس سے جنگ کے دوران کئی افغانی قبیلوں کو ایک دوسرے کا مخالف بنا دیا تھا۔ اب اس کی کامیابی یہ تھی کہ روس کو بری طرح پسپا کرنے کے بعد افغانستان کو خانہ جنگی میں اُلجھا کر تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ جن قبائل کی حمایت کرتا تھا انہیں بھاری قیمت پر ہتھیار سپلائی کرتا تھا اور جن قبائل کی مخالفت کرتا تھا ان کی بھی درپردہ اس طرح مدد کرتا تھا کہ اس کے خفیہ ایجنٹ ان قبائل کو ہتھیار فراہم کرتے تھے۔

حیات محمد کے بوڑھے والدین کابل جانے کے لئے بے چین تھے۔ وہاں ان کے آباؤاجداد صدیوں سے رہتے آئے تھے۔ ان دنوں مختلف قبائل کے درمیان جنگ جاری تھی۔ کابل کا سفر کرنے کے دوران اس کے بوڑھے والدین اپنے ہی ہم وطن قبیلوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

حیات محمد کے دل کو زبردست دھچکا پہنچا۔ آزادی کی جنگ راس نہیں آئی تھی۔ برسوں تک جہاد کرتے رہنے کے بعد اپنے ہی آزاد وطن میں اپنے ہی ہم وطن قبیلوں کی گولیوں سے والدین مارے گئے تھے اور نہ جانے کتنے بے شمار افغانی باشندے آپس کی لڑائی میں مارے جارہے تھے۔ حیات محمد نے اس عرصے میں بڑے ممالک کے سیاسی پس منظر کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ان ممالک کے دو عزائم تھے ایک تو خانہ جنگی کے ذریعے افغانستان کو کھنڈر بنا کر امریکا کی سیاسی پالیسی کے مطابق افغانستان میں نئی حکومت اپنی مرضی کے مطابق قائم کرنا۔ دوسری بات یہ تھی کہ لاکھوں ڈالر کے ہتھیار افغانیوں' پاکستانیوں اور کردوں کو فروخت کئے جارہے تھے۔

حیات نے اس دوران ہتھیار فروخت کرنے والی ایک خفیہ ایجنسی میں جگہ بنالی تھی پھر اس ایجنسی کی سفارش پر برطانیہ چلا گیا تھا۔

تمام دنیا کی اسلحہ منڈیوں میں امریکا کے بعد برطانیہ کا دوسرا نمبر ہے۔ ان بڑے ممالک کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں امن و امان قائم رکھنے اور دنیا کی مختلف حکومتوں کو مضبوط بنانے اور دہشت گردوں کو کچلنے کے لئے ہتھیار فراہم کرتے ہیں۔ اسے سیاسی اور تجارتی مذاق کہنا چاہئے۔ کیونکہ جو ہتھیار ترقی پذیر ممالک کو فروخت کئے جاتے ہیں' وہی ہتھیار دہشت گردوں اور تخریب کاروں تک بھی پہنچائے جاتے ہیں۔ اس کام کے لئے وہ مختلف ایجنسیوں کو اپنا ذریعہ بناتے ہیں تاکہ امریکا اور برطانیہ جیسے بڑے ممالک پر کوئی

الزام نہ آئے۔

حیات محمد نے ایک ایجنسی میں رہ کر ایسی کارکردگی دکھائی کہ چند ماہ کے اندر ہزاروں پاؤنڈز کمانے لگا۔ لندن جیسے مہنگے شہر میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا۔ ایسے وقت اس نے مونا نامی ایک لڑکی کو دیکھا اور اس پر عاشق ہوگیا۔ مونا اس سے مسکرا کر ملتی تھی لیکن خود کبھی ملاقات کا وقت نہیں دیتی تھی۔ حیات نے محسوس کیا کہ وہ اخلاقاً اس سے ملتی ہے اور اکثر کترا کر کسی بہانے اس سے دور ہو جاتی ہے۔

اس نے پوچھا۔ "مونا! کیا ہماری دوستی پائیدار نہیں ہو سکتی؟ اگر تم راضی ہو جاؤ تو ہم شادی کرلیں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں شادی نہیں کروں گی۔ تم بہت اچھے ہو۔ میں ہمیشہ تمہاری دوست بن کر رہوں گی۔"

"آخر شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟"

"تمہاری محبت اور دیوانگی سے ڈر لگتا ہے۔ سوچتی ہوں' میں مرجاؤں گی تو تم میرے بغیر کیسے رہو گے؟"

"میں شادی کی بات کررہا ہوں اور تم مرنے کی بات لے بیٹھی ہو۔ کیا تم نے کاتب تقدیر کا لکھا ہوا پڑھا ہے کہ مجھ سے پہلے تم دنیا سے رخصت ہو جاؤ گی؟"

"ہاں میں نے مقدر کو پڑھ لیا ہے۔ میری زندگی بہت مختصر ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا کسی نجومی نے پیش گوئی کی ہے؟"

"نہیں ڈاکٹروں کی رپورٹ ہے۔ میں دل کی مریضہ ہوں۔ مجھ پر دو بار ہارٹ اٹیک ہوچکا ہے۔ تیسری بار اٹیک ہوگا تو میں نہیں بچوں گی۔"

حیات نے اسے پریشان ہو کر دیکھا' پھر پوچھا۔ "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"بتانے سے کیا ہوتا؟ علاج بہت مہنگا ہے اور کوئی ایسا دل والا نہیں ہے' جو اپنا دل سینے سے نکال کر مجھے دے دے۔"

حیات کہنا چاہتا تھا کہ محبت میں دل کیا' وہ جان بھی دے سکتا ہے لیکن ایسا کہنے سے مونا کبھی اپنے محبوب کو کھو کر اس کے دل کی دھڑکنیں اپنے سینے سے سن سن کر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ "علاج مہنگا ہے مگر میری محبت سے اور میری دولت سے مہنگا نہیں ہے۔ اگر دولت ہو تو اس دنیا میں ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ میں تمہارا علاج

کراؤں گا۔"

اس نے ہارٹ سرجری کے ایک ماہر سے ملاقات کی۔ اسے مونا کے حالات بتائے۔ اس ماہر نے ملاقات کا وقت دیا۔ مونا کی میڈیکل رپورٹس دیکھیں۔ پھر کہا۔ "مسٹر حیات! میں اوپن ہارٹ سرجری کا ماہر ہوں۔ سوچا تھا کہ دل تک خون پہنچانے والی کسی رگ میں نقص ہوگا تو آپریشن کے ذریعے دور کردوں گا لیکن دل کا فنکشن بہت کمزور بلکہ ناقص ہوتا جارہا ہے۔ یہ دل زیادہ عرصے تک اپنی دھڑکنیں قائم نہیں رکھ سکے گا۔"

"لیکن ڈاکٹر! ایک نئے دل کے ذریعے تو اسے زندگی مل سکتی ہے۔"

"ہاں۔ اگر تبدیلی قلب کا آپریشن ہوجائے تو اسے زندگی مل سکتی ہے۔"

"تو پھر کریں، جتنے ہزار جتنے لاکھ پاؤنڈز کی ضرورت ہے۔ مجھے بتائیں، میں فوراً ادا کروں گا۔"

"آپ بڑی سے بڑی قیمت دے رہے ہیں۔ میں یہ سرجری ضرور کرتا لیکن میرا تجربہ صرف اوپن ہارٹ سرجری تک محدود ہے۔ تبدیلی قلب کے آپریشن میں ایک نئے دل کی پیوند کاری کا مرحلہ بہت ہی نازک اور دشوار ہوتا ہے۔ یہاں ایسے چند ڈاکٹر ہیں لیکن عالمی شہرت رکھنے والا صرف ایک ہی ڈاکٹر کامران ہے، آپ اس سے رجوع کریں۔"

اس نے ڈاکٹر کامران سے ملاقات کی۔ کامران نے مونا کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "آپ مریضہ کو اسپتال میں داخل کرادیں۔ جب ان کے آپریشن کی باری آئے گی تو آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔"

"مونا کی باری کب آئے گی؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، مس مونا سے پہلے تین مریض ہیں۔ اس حساب سے چوتھا نمبر ان کا ہے۔ پھر یہ کہ انسانی دل بازار سے خریدے نہیں جاتے۔ کوئی زندہ انسان عطیے کے طور پر دینا چاہے تو اسے قبول نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ ایک زندہ انسان کو مار کر دوسرے کو زندگی دینا قانون کے خلاف ہے۔"

حیات نے کہا۔ "میں اتنا جانتا ہوں کہ موت سے پہلے جو لوگ اپنے دل عطیے کے طور پر دینے کی وصیت کرتے ہیں، صرف ان کے ہی دلوں کے ذریعے دوسرے دل کے مریضوں کی جان بچانے کی کوشش کی جاتی ہیں لیکن ایسے کتنے لوگ ہوں گے، جنہوں نے وصیت کی ہوگی۔ میرا خیال ہے، چند لوگ ہوسکتے ہیں پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام

وصیت کرنے والے موت کے بعد آپ ہی کے اسپتال میں لائے جائیں۔"

کامران نے کہا۔ "ہاں، یہ ضروری نہیں ہے۔ دل سب کو عزیز ہوتا ہے۔ یہ ہے تو زندگی ہے۔ ہمارے پاس بہت کم عطیات آتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عطیے کے انتظار میں نئی زندگی کی آس لگانے والے مریض مرجاتے ہیں۔"

"ڈاکٹر! میں اپنی مونا کو مرنے نہیں دوں گا۔ آپ کچھ بھی کریں مگر پہلے اس کا آپریشن کریں۔ اسے چوتھے نمبر پر نہ رکھیں۔"

"یہ اصول اور انسانیت کے خلاف ہے۔ جو تین مریض پہلے سے منتظر ہیں وہ بھی انسان ہیں۔ وہ بھی نئی زندگی کی آس لگائے اس اسپتال میں موجود ہیں۔"

"آپ اصول اور انسانیت کی بات نہ کریں۔ رقم بتائیں، میں لاکھوں پاؤنڈز دوں گا۔ آپ میری مونا کو پہلے نمبر پر لے آئیں۔"

"مسٹر حیات! میں یہاں دولت کمانے کے لئے نہیں ہوں۔ اسپتال والوں سے معقول فیس لے کر مریضوں کی جان بچانے کی کوششیں کرتا ہوں۔ آپ کی مونا سے پہلے تین مریض بھی جینے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر آپ مس مونا کا چوتھا نمبر چاہتے ہیں تو کاؤنٹر پر جاکر یہاں کے فارم پُر کریں اور انہیں داخل کرادیں۔ پلیز اب ملاقات کا وقت ختم ہوچکا ہے۔"

وہ مونا کے ساتھ ڈاکٹر کامران کے چیمبر سے باہر آیا۔ پھر جھنجلا کر بولا۔ "یہ ڈاکٹر جانتا نہیں ہے کہ میں ہتھیاروں سے کھلونوں کی طرح کھیلتا ہوں۔ مونا! اگر تمہاری جان کو کچھ ہوا تو میں ڈاکٹر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

مونا نے کہا۔ "تم غصے میں ایک انسان کی اچھائی کو سمجھ نہیں پاتے ہو۔ ڈاکٹر کامران نے درست کہا ہے۔ مجھ سے پہلے جو تین مریض ہیں وہ بھی جینے کا حق رکھتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "اس دنیا میں اربوں انسان ہیں۔ انسانوں کے اتنے بڑے ہجوم میں صرف تم میرے لئے ہو۔ میں تمہاری عمر بڑھانے کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"اگر آپریشن سے پہلے میری موت ہوگئی اور تم انتقاماً ڈاکٹر کو قتل کرو گے تو میری روح قیامت تک بھٹکتی رہے گی اور اس ڈاکٹر کے لئے ماتم کرتی رہے گی جو لالچی نہیں ہے۔ اپنے اصولوں کے مطابق اپنے فرائض ادا کرتا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟ کس طرح جلد سے جلد تبدیلی قلب کے ذریعے تمہیں اپنے

لئے زندہ رکھوں۔"

"ایسا کرو' مجھے اس اسپتال میں داخل کرا دو پھر دوسرے اسپتالوں میں بھی میرے نام کی پرچیاں بنوا لو۔ جس اسپتال میں میرا نمبری جلدی آئے گا۔ وہاں مجھے آپریشن کے لئے پہنچا دینا۔"

حیات نے یہی کیا۔ مونا کو اسی اسپتال میں داخل کرا دیا پھر ہارٹ پلانٹیشن کے دوسرے ماہرین سے بھی ملاقات کرنے لگا۔ ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "اگر اسپتال کی فیس کے علاوہ مجھے پچاس ہزار پاؤنڈ الگ سے ادا کرو گے تو میرے اسپتال میں دل کا جو پہلا عطیہ آئے گا' اسے میں مس مونا کے لئے وقف کردوں گا۔"

حیات نے فوراً ہی رشوت کی نصف رقم ادا کردی۔ ایک ہفتے بعد ہی ایک لاش آئی۔ ایک کار کے حادثے میں موت واقع ہوئی تھی۔ حیات نے ڈاکٹر کامران سے کہا۔ "دوسرے اسپتال میں آج ہی مونا کو دل کا عطیہ مل رہا ہے۔ اس لئے میں اسے یہاں سے لے جارہا ہوں۔"

کامران نے کہا۔ "تمہاری مرضی ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

وہ مونا کو وہاں سے لے گیا۔ دوسرے اسپتال میں آپریشن کے انتظامات ہو چکے تھے۔ مونا کو فوراً ہی آپریشن تھیٹر میں پہنچایا گیا۔ حیات باہر برآمدے میں موجود رہا۔ کار کے حادثے میں جس عورت کی موت ہوئی تھی' اس کے عزیز و اقارب بھی آئے تھے پھر حیات کو پتا چلا کہ آپریشن میں کچھ دیر ہو رہی ہے۔ اسپتال کے ایک بڑے ہال میں لندن کے چند نامور ڈاکٹروں اور پولیس والوں کی خفیہ میٹنگ ہو رہی ہے۔

جس آئل ٹینکر کے ڈرائیور نے کار کو ٹکر ماری تھی وہ فرار ہونے سے پہلے گرفتار ہو گیا تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ اس اسپتال کے ایک ڈاکٹر نے اسے چھ ہزار پاؤنڈ دیئے تھے اور اس عورت کی نشاندہی کی تھی جسے کار کے حادثے کا بہانہ کر کے ہلاک کرنا تھا۔ وہ ڈاکٹر جانتا تھا کہ اس ہلاک ہونے والی عورت نے اپنی زندگی میں دل کا عطیہ دینے کی وصیت کی تھی۔ صرف پچاس ہزار پاؤنڈ حاصل کرنے کی خاطر اس بے چاری کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔

اس ڈرائیور کے علاوہ رشوت خور ڈاکٹر کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اس عورت کی تو زندگی ختم ہو چکی تھی اس کے والدین نے کہا کہ اس کے نصیب میں ایسی ہی موت لکھی

تھی۔ موت کسی بھی بہانے سے آجاتی ہے۔ لہٰذا ان کی بیٹی کی وصیت پر عمل کیا جائے اور اس کے دل کا عطیہ کسی ضرورت مند کو دے دیا جائے۔

قانون کے مطابق صرف رشوت لینے والا ہی نہیں' رشوت دینے والا بھی پکڑا جاتا ہے۔ لہٰذا حیات محمد کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ وہ چیختا چلاتا رہا کہ مونا کو اسپتال میں چھوڑ کر نہیں جائے گا لیکن اسے لاک اپ میں پہنچا دیا گیا۔

وہ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتا تھا اور جس ایجنسی کے لئے کام کرتا تھا۔ اس کے باس نے اس کی رہائی کے لئے اوپر تک اپنے اثر و رسوخ استعمال کئے۔ پھر یہ دھمکی بھی دی کہ حیات محمد کو رہا نہ کیا گیا تو لندن کی کسی مصروف شاہراہ یا شاپنگ سنٹر میں بموں کے دھماکے ہوں گے۔ شہر میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے دوسرے دن حیات محمد کو رہا کر دیا گیا۔ وہ رہائی پاتے ہی سیدھا اسپتال پہنچا۔ پتا چلا کہ دیر ہو جانے کے باعث پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس لئے ڈاکٹر کامران کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

چونکہ اڑتالیس گھنٹوں تک مونا کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی اس لئے وہ ڈاکٹر کامران کے پاس آیا۔ اس نے پوچھا۔ "حوالات سے باہر کیسے آگئے؟"

وہ بولا۔ "میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ آپ نے میری مونا کو ایک نئی زندگی دی ہے۔"

"زندگی دینے والا خدا ہے۔ میں نے صرف فرض ادا کیا ہے۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا مگر میرا اندازہ ہے کہ تم نے پولیس والوں کو بھی رشوت دے کر جان چھڑائی ہے۔ ڈاکٹر کو دینے والی رشوت پہلے ہی ظاہر ہو گئی ہے۔"

"میری بات رہنے دیں۔ مجھے حکم دیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ مجھے کتنی رشوت دے سکتے ہو؟"

"آپ رشوت کا لفظ استعمال نہ کریں میں معاوضہ دینا چاہتا ہوں۔"

"میں نے جس اسپتال میں جاکر آپریشن کیا تھا۔ وہاں سے معاوضہ مل چکا ہے۔ میری ایک بات توجہ سے سنو۔ خدا ہر بندے کو معصوم پیدا کرتا ہے۔ شاید مونا بھی اب تک معصوم تھی لیکن تم نے رشوت کے ذریعے اسے دوسری زندگی دی ہے۔ جسے دل و جان سے چاہتے ہو' اس کی معصومیت پر اس طرح بھی دھبہ لگا دیا ہے کہ اس کے لئے ایک عورت کی زندگی چھین لی گئی۔"

پھر کامران نے میز پر جھک کر کہا۔ "بے چاری مونا کو کبھی یہ نہ معلوم ہونے دینا کہ اس کے سینے میں ایک بے قصور مقتولہ کا دل دھڑک رہا ہے۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ سر جھکا کر کامران کے کمرے سے باہر آگیا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا کہ اس نے اپنی محبوبہ کے سینے میں ایک مقتولہ کا دل پہنچا دیا ہے۔ اگرچہ اس نے مونا کے لئے دل حاصل کرنے کی خاطر کسی کو ہلاک نہیں کیا تھا لیکن رشوت میں دی ہوئی رقم نے ایک ایسی صحت مند عورت کی جان لی تھی' جو نہ جانے کتنے عرصے تک زندہ رہنے والی تھی۔

بہرحال مونا کو نئی زندگی مل گئی۔ اس سے یہ حقیقت چھپائی گئی کہ کس نے اسے دل کا عطیہ دیا ہے؟ ڈاکٹر کامران نے توجہ سے اس کا علاج کیا پھر تین ماہ کے بعد وہ پاکستان چلا گیا۔ وہاں اس کے چچا کی بیٹی سلمٰی سے شادی ہو گئی۔ اس کے بعد وہ پھر لندن واپس نہیں آیا۔

مونا مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تھی۔ چھ ماہ بعد حیات نے اس سے شادی کرلی پھر اسے اپنے ساتھ پیرس لے گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو عورت کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔ اس کے والدین یا قریبی عزیز مونا سے ملنے آئیں۔ وہ اپنی ہلاک ہونے والی عزیزہ کی صورت نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن مونا کے سینے میں اس کا دھڑکتا ہوا دل اپنوں کو محبت سے اس کے قریب لا سکتا تھا۔

مونا ہر اتوار کو نوٹریڈیم چرچ میں عبادت کے لئے جاتی تھی اور فادر بنجامن سے دعائیں لیا کرتی تھی۔ عبادت کے دوران حیات محمد چرچ کے باہر اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ فادر نے اس سے کہا۔ "تم مسلمان ہو۔ بے شک مسلمان رہو لیکن عبادت کے دوران چرچ کے اندر آ کر بیٹھا کرو۔ تم چرچ میں آؤ گے اور میں مسجد میں جاؤں گا تو نہ ہمارا ایمان بدلے گا اور نہ ہی کسی کے مذہب کو نقصان پہنچے گا۔"

اس طرح ملاقات کا سلسلہ جاری رہا تو فادر نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کامران کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ لندن سے پہلے وہ پیرس کے ایک اسپتال میں تھا۔ وہاں اس نے چرچ میں رہنے والی ایک نن کا بھی کامیاب آپریشن کیا تھا اور اس آپریشن کا معاوضہ بھی نہیں لیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کہا تھا کہ دنیا کا ہر مذہب انسان کو تہذیب سکھاتا ہے اور تہذیب یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان کی صلاحیتوں سے ایک عیسائی نن کو نئی زندگی ملے۔

مونا ڈیڑھ برس تک پیرس میں رہنے کے بعد ایک ہفتے کے لئے حیات کے ساتھ لندن گئی پھر ضد کرنے لگی کہ برطانیہ اس کا اپنا وطن ہے۔ اس لئے انہیں لندن میں رہنا چاہئے۔ یوں ضد کرتے رہنے کے دوران وہ ایک صبح دریائے ٹیمز کے ساحل پر ٹہلنے گئی تو پھر واپس نہیں آئی۔ حیات نے گھنٹے دو گھنٹے اس کا انتظار کیا پھر پریشان ہو کر اس نے تلاش شروع کی۔ اس نے پولیس میں رپورٹ کی۔ خفیہ طور سے ہتھیار سپلائی کرنے والے جتنے شناسا تھے۔ سب کو مونا کی تصویر دکھائی۔ اس نے ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ رات کو فون پر مونا کی آواز سنائی دی۔

اس نے بڑی بے قراری سے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ میں صبح سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔"

"میں بھی خود کو تلاش کر رہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں زندہ ہوں' یا مر چکی ہوں۔"

"مونا! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"یہ باتیں تم سمجھ سکتے ہو اور مجھے سمجھا سکتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ میرے سینے میں کس کا دل دھڑک رہا ہے؟"

چند لمحوں کے لئے حیات کو چپ سی لگ گئی پھر اس نے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک بے چاری کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔"

"یہ نہیں بتایا تھا کہ حادثہ کیسے ہوا تھا۔ کار کسی آئل ٹینکر سے نہیں ٹکرائی تھی' رشوت کی رقم سے ٹکرائی تھی۔"

"پلیز مونا! فون پر ایسی باتیں نہ کرو۔ تم کہاں ہو؟ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔"

"یہی تو نہیں جانتی ہوں کہ کہاں ہوں؟ کیا اس دنیا میں ہوں' مگر کیسے ہو سکتی ہوں؟ میں آپریشن بیڈ پر مر گئی تھی۔ جس عورت کو برسوں زندہ رہنا تھا' وہ میرے سینے کے اندر زندہ ہے۔ اس سے جبراً زندگی چھیننے کے باوجود وہ فون پر بول رہی ہے کہ تمہاری مونا مر چکی ہے۔ جسے زندگی دینا چاہتے تھے اسے تم زندہ رکھنے میں ناکام رہے ہو۔"

"فار گاڈ سیک مونا! مجھے مجرم نہ سمجھو۔ میں نے کسی کو ہلاک کرنے کے لئے رشوت نہیں دی تھی۔"

"رشوت ایک مقصد کے لئے دی جاتی ہے لیکن جسے دی جاتی ہے' وہ اس لعنت کو

دوسرے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ریٹا مارلن دو برس کے ایک بچے کی ماں تھی۔ وہ بچہ اپنی ماں سے ڈیڑھ برس تک محروم رہا لیکن اب محروم نہیں ہے۔ میں ریٹا مارلن ہوں۔ میں نے بچے کو ماں کے دھڑکتے ہوئے دل سے لگا لیا ہے۔"

"او گاڈ! تم بہت زیادہ جذباتی ہو رہی ہو۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ ریٹا مارلن کے گھر میں ہو۔"

"ہاں اتفاق سے بچے کی نانی سے ملاقات ہو گئی تھی۔ بے چارہ نانا مر چکا ہے۔ بوڑھی نانی کے سوا بچے کا اپنا کوئی سگا رشتے دار نہیں تھا۔ ایسے میں خدا نے مجھے صحیح جگہ پہنچا دیا ہے۔"

"مونا! ہم بچے کو گود لے لیں گے۔ اس کی نانی کو بھی اپنے ساتھ رکھیں گے۔ میں تم سب کو لینے آ رہا ہوں۔"

"ایسی حماقت نہ کرنا۔ تمہیں دیکھتے ہی میں خود کشی کر لوں گی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا مجھ سے نفرت کر رہی ہو؟"

"مونا کبھی تم سے نفرت نہیں کر سکتی لیکن معلوم تو ہو کہ میں مونا ہوں یا نہیں؟ محبت ہو یا شادی ہو' وہ دل سے کی جاتی ہے اور دل تو ریٹا مارلن کا ہے۔ میں ایک بچے کی ماں ہوں مگر باپ تم نہیں ہو۔ میں بے چاری ریٹا مارلن بیوہ ہوں۔"

"مونا! میرا سر چکرا رہا ہے۔ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے ان سچے جذبوں کو سمجھو' جو صرف تمہارے لئے ہیں۔"

"اس وقت بچہ میرے سینے سے لگا ہوا میرے شانے پر سر رکھ کر سو رہا ہے۔ کیا اس بچے سے زیادہ سچا جذبہ کسی کا ہو سکتا ہے؟"

"میں تمہاری ہر بات تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے مجرم کہو گی۔ میں مان لوں گا۔ مجھے سزا کے لیے کہو گی' میں عدالت میں حاضر ہو جاؤں گا لیکن ایک بار مجھ سے ملاقات کرو۔"

"میں پہلے فادر بنجامن کے پاس جاؤں گی۔ ان سے مشورہ کروں گی۔ ان سے پوچھوں گی' کیا دل بدل جانے سے جذبے اور رشتے بدل جاتے ہیں؟ کیا میں ریٹا مارلن کے دل کو حیات محمد کے دل کی دھڑکنوں سے لگا کر اسے محبتیں دے سکتی ہوں؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "چلو یہی سہی' پہلے ہم فادر کے پاس جائیں گے۔"

"ہم نہیں' صرف میں' بچے اور اس کی نانی کے ساتھ جاؤں گی۔ تم یہاں رہو گے

پھر دو دنوں کے بعد فادر بنجامن سے ملنے آؤ گے۔"

دوسری طرف مونا نے ریسیور رکھ دیا۔ حیات تھوڑی دیر تک ریسیور ہاتھ میں پکڑے سوچ میں گم رہا۔ ڈاکٹر کامران نے اسے مشورہ دیا تھا کہ مونا کو حقیقت معلوم نہیں ہو' ورنہ اسے شاک پہنچے گا۔ وہ مر بھی سکتی تھی اور زندہ رہتی تو یہ احساس مارتا رہتا کہ اسے ایک نئی زندگی دینے کے لئے ایک ایسی فراخ دل عورت کو ہلاک کیا گیا ہے' جس نے اپنی زندگی میں ہی اپنا دل کسی کے لئے بھی وقف کر دیا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ مونا کے بغیر لندن میں دو دن گزارنا محال ہو گا لیکن دوسرے دن کے اخبار نے محبوبہ کی جدائی کے احساس کو کسی حد تک کم کر دیا۔ اس اخبار میں ڈاکٹر کامران کی گرفتاری کی خبر اور تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھنے سے پتا چلا کہ اس کی گرفتاری کی خبر پچھلے تین دنوں سے شائع ہو رہی ہے اور دنیا کے مختلف ممالک سے ہارٹ سرجری کے بڑے نامور ڈاکٹر اس کی حمایت میں بیان دے رہے ہیں۔

حیات محمد کی نظروں میں یوں بھی کامران کی بہت قدر اور اہمیت تھی لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ کامران کی گرفتاری کے سلسلے میں ہتھیاروں کی سپلائی کا ذکر ہو رہا تھا۔ کامران کے بیان کے مطابق اسلحے کا خفیہ کاروبار کرنے والوں نے اس کی بیوی سلمیٰ کو قتل کیا تھا اور اسے بھی سزائے موت تک پہنچانا چاہتے تھے۔

حیات نے اسی دن خفیہ ایجنسی کے باس سے ملاقات کی پھر اس سے کہا۔ "ہم اسلحے کی تجارت یورپی ممالک میں کرتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ایشیا میں ہماری جیسی کتنی ایجنسیاں ہیں۔ میں خاص طور پر افغانستان' پاکستان اور ہندوستان کی انڈر گراونڈ ایجنسیوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"پوری دنیا میں ایسی ایجنسیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہ تمام ایجنسیاں ایک دوسرے سے تجارتی تعلقات بھی رکھتی ہیں اور ان کے درمیان تجارتی عداوت بھی رہتی ہے۔"
باس نے کہا۔ "تم جن ملکوں کی بات کر رہے ہو۔ وہاں کئی ایجنسیاں ہیں۔"

"آپ پاکستان کے متعلق بتائیں۔"

باس نے میز کے قریب رکھے ہوئے کمپیوٹر کو آن کیا۔ پاکستان اور اس کے آس پاس کے ممالک کا ایک ڈسک اٹھا کر کمپیوٹر میں لگایا پھر اپنی انگلیوں سے مختلف بٹن کو دباتا رہا۔ اسکرین پر مختلف ممالک کے نام اور کچھ تفصیلات نظر آتی رہیں۔ پھر پاکستان کا نام

آیا۔ حیات محمد غور سے پڑھنے لگا اور کاغذ قلم لے کر ضروری معلومات نوٹ کرنے لگا۔
باس نے پوچھا۔ "تمہارے ارادے کیا ہیں؟ کیا پاکستان جاؤ گے؟"

"آپ جانتے ہیں۔ میں اپنی مونا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا لیکن میں ایک پاکستانی ڈاکٹر کامران کا مقروض ہوں۔ یہ بات بھی آپ جانتے ہیں کہ اس نے مونا کو ایک نئی زندگی دینے کے لئے نہ رشوت لی تھی اور نہ معاوضہ لیا تھا۔"

باس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں۔ وہ بہت اچھی شہرت کا مالک ہے۔ میں نے پچھلے دنوں اخبار میں اس کے متعلق پڑھا ہے۔ ہم بری شہرت رکھنے والے اتنا جانتے ہیں کہ کامران جیسے نیک اور شریف لوگوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ وہاں کی اسلحہ فروخت کرنے والی ایجنسی اسے زندہ رہنے نہیں دے گی۔"

"اور میرا ضمیر کہتا ہے کہ میں اسے مرنے نہ دوں۔"

"تم ہماری ایجنسی میں ہو۔ یہ دیکھتے رہتے ہو کہ ہم کتنے طاقتور اور بااختیار ہوتے ہیں۔ اکثر حکومتوں کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ پاکستان میں بھی جو ایجنسیاں ہیں' وہ اتنی زبردست ہیں کہ تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دیں گی۔"

"باس! میں کامران کا قرض اتارنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری کچھ مدد نہیں کر سکیں گے؟"

"بہت مشکل ہے۔ ہم پاکستان سے ہزاروں میل دور ہیں۔ قریب بھی ہوتے تو مخالف ایجنسی سے ٹکرا کر اپنے کاروبار کو نقصان نہ پہنچاتے۔ ہاں ایک کام ہو سکتا ہے۔ جو ایجنسی ڈاکٹر کامران کی دشمن ہو گئی ہے۔ اسے ہم بڑی رقم دے کر کامران کو جیل سے فرار کرا سکتے ہیں اور اسے یہاں لندن میں پناہ دے سکتے ہیں۔"

"مجھے یقین ہے۔ آپ کوشش کریں گے تو ڈاکٹر کامران کو سزائے موت سے بچنے اور جیل سے فرار ہونے کا موقع مل جائے گا اور اسے یہاں پناہ بھی مل جائے گی لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ وہ کس قدر اصول پسند ہے۔ آپریشن کے لئے میری وائف کا چوتھا نمبر تھا لیکن بھاری رشوت کا لالچ دینے کے باوجود اس نے میری وائف کو پہلا نمبر نہیں دیا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں' وہ قانون کے مطابق اپنے حق میں ثبوت اور گواہ پیش کر کے رہائی حاصل کرنا چاہے گا۔"

باس نے کہا۔ "ایسے احمقوں کی باتیں کر کے میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اس کمپیوٹر

سے معلومات حاصل کرو اور جاؤ۔"

وہ وہاں سے چلا آیا۔ اس کے لئے یہ بات پریشان کن تھی کہ مونا نے بھی اخبار کے یا فادر بنجامن کے ذریعے ڈاکٹر کامران کے بارے میں کچھ سنا ہو گا۔ وہ بڑی حساس اور جذباتی تھی۔ ریٹا مارلن کا دل اپنا کر اس کے بچے کو بھی اپنا لیا تھا اور وہ جب تک زندہ رہتی' اس بچے کو بھرپور ممتا دیتی رہتی۔

اسی طرح وہ ڈاکٹر کامران کے بارے میں بھی جذباتی ہو کر سوچ رہی ہو گی۔ اس کی پہلی اور آخری خواہش یہی ہو گی کہ اسے نئی زندگی دینے والے کو موت نہ ملے۔

حیات نے فون پر فادر بنجامن سے رابطہ کیا۔ فادر نے کہا۔ "تم نے صحیح وقت پر فون کیا ہے۔ کیا تم نے ڈاکٹر کامران کے متعلق خبر پڑھی ہے؟"

"جی ہاں۔ اسی سلسلے میں آپ سے اور مونا سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔"

"اس سے کیا باتیں کرو گے۔ وہ رو رہی ہے اور بچوں کی طرح ضد کر رہی ہے کہ ہم کامران کو کسی بھی طرح سزائے موت سے بچائیں۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے یہ لو تم خود باتیں کرو۔"

چند لمحوں کے بعد مونا کی آواز سنائی دی۔ اس کی آواز اور لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ آنسوؤں میں بھیگ کر بول رہی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "حیات! اگر میں دل کی بیماری میں مر جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ کیا میں نے ایسے صدمات اٹھانے کے لئے یہ زندگی حاصل کی ہے؟"

"مونا! آنسو کسی مسئلے کا علاج نہیں ہوتے۔ پہلے خود کو سنبھالو۔"

"مجھے تسلیاں نہ دو۔ بولو یہ کیسی زندگی ہے' جس عورت کا دل میرے سینے میں دھڑک رہا ہے۔ اسے ہلاک کیا گیا تھا اور جس مہربان نے اس دل کو میرے سینے تک پہنچایا اسے بھی ہلاک کیا جائے گا۔ یہ کیسی دنیا ہے؟ یہ کیسے لوگ ہیں؟ یہ کیسے درندے ہیں کہ زندگی دینے والے کو مار ڈالتے ہیں؟"

"مونا! ہم دہشت گردوں کی دنیا میں جی رہے ہیں۔ ہم کسی کو اپنے آنسو دکھا کر فریادیں سنا کر بھی زندگی کی بھیک نہیں مانگ سکتے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے میرے مسیحا کی زندگی چاہئے۔"

"تمہارا وہ مسیحا کامران قانون پسند شہری ہے۔ اگر میری تدبیر پر عمل کرے تو میں

اسے جیل سے فرار کرا کے یہاں لا سکتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "کیا اب بھی تمہیں نصیحت حاصل نہیں ہوئی کہ ایک برا عمل دوسرے برے عمل کو جنم دیتا ہے۔ تمہاری دی ہوئی ایک رشوت نے ایک بے قصور عورت کی جان لی۔ جب کہ تم نے کسی کی جان لینے کے لئے رشوت نہیں دی تھی۔ اس طرح تم میرے مسیحا کی جان بچانے کے لئے اسے جیل سے فرار کرانا چاہتے ہو؟ کیا اس طرح یہ ثابت نہیں ہو گا کہ ڈاکٹر کامران واقعی قاتل تھا۔ اس لئے فرار ہو گیا؟ تم اپنی دانست میں نیکی کرنا چاہتے ہو لیکن اپنے غلط عمل سے ایک فرشتہ سیرت انسان کو مجرم ثابت کر دو گے۔"

"میں نے صرف اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ ورنہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اپنی حمایت میں ٹھوس ثبوت اور گواہ حاصل کئے بغیر جیل سے باہر نہیں آئے گا۔"

وہ بولی۔ "تم نے جس انداز سے مجھے نئی زندگی دی ہے' اس کی میں سخت مخالف ہوں۔ تم سے ناراض بھی ہوں' میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ تم سے دور رہوں گی لیکن اب میں یہ فیصلہ اس شرط پر بدل سکتی ہوں کہ تم کسی طرح ڈاکٹر کامران کو بے قصور ثابت کرو۔"

"میں تمہاری ناراضی دور کرنے اور پھر سے تمہاری بھرپور محبت پا لینے کے لئے کچھ بھی کر گزروں گا۔"

"تو پھر کل شام کو فادر کے پاس چلے آؤ۔ یہاں دو ایسے مہمان بھی آنے والے ہیں' جو ڈاکٹر کامران کے ممنون اور احسان مند ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔"

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا اور سوچنے لگا' کیا تدبیر کرے؟ کس طرح اس مسیحا کو بے قصور ثابت کرے؟

وہ دوسری شام فادر بنجامن کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہاں دو اجنبی شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ فادر نے تعارف کرایا۔ "حیات محمد! یہ شکاگو میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر جے ڈیسوزا ہیں اور ڈاکٹر ڈین مارکوس پلاسٹک سرجری کے ماہر ہیں۔"

ان سب نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا پھر حیات محمد نے اپنی زندگی کے مختصر سے

حالات بتائے کہ وہ کس طرح افغانستان سے برطانیہ آیا تھا اور اب تک کیسی زندگی گزار رہا ہے۔ اس دوران مونا ان سب کے لئے کبھی ناشتا اور کبھی چائے لاتی رہی۔

حیات نے کہا۔ "مونا! تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھو۔ کیونکہ ڈاکٹر کامران' تمہارا بھی محسن ہے۔ تم نے' فادر نے' ڈیسوزا صاحب اور مارکوس صاحب نے اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیا ہو گا۔ کیا آپ میں سے کسی کے ذہن میں اس مسئلے کا حل آ رہا ہے؟"

فادر نے کہا۔ "ہم نے مسئلے پر غور بھی کیا ہے اور آل ورلڈ میڈیکل ایسوسی ایشن کے بڑے عہدے داروں سے بھی رابطہ کیا ہے۔ وہ بھی ڈاکٹر کامران کی صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ اس کے لئے قاتل کا لفظ بھی استعمال نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ مجبوری ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ پاکستان کے داخلی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکیں گے۔ اگر بہت زیادہ کوشش کریں تو سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرا سکتے ہیں۔"

"عمر قید کی سزا سے بھی یہی ثابت ہو گا کہ وہ قاتل ہے۔"

فادر نے کہا۔ "ڈاکٹر کامران کی رہائی کا ایک عظیم مقصد ہے۔ ہم چاہتے ہیں وہ ہمیشہ کی طرح آزادی سے تبدیلی قلب کا آپریشن کرتا رہے اور بجھنے والی زندگیوں کو روشن کرتا ہے۔ عمر قید کی سزا میں یہ نیک مقصد پورا نہیں ہو گا۔"

حیات نے پوچھا۔ "مونا! تم فون پر کہہ رہی تھیں کہ اپنے مسیحا کی زندگی چاہتی ہو۔ کیا اسے عمر قید کی سزا ملے اور وہ جیل میں زندہ رہے تو تمہارے دل کو تسلی ہو گی؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں نے فون پر جذباتی ہو کر ایسا کہا تھا۔ ڈاکٹر کامران کو ایسی زندگی ملے کہ دوسرے اس سے نئی زندگیاں حاصل کرتے رہیں۔"

حیات نے وائس چانسلر اور ڈاکٹر ڈین مارکوس سے پوچھا۔ "کیا آپ اس کی رہائی کا کوئی راستہ دکھا سکتے ہیں؟"

انہوں نے انکار میں سر ہلایا اور باری باری اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔ حیات نے کہا۔ "مونا میری زندگی ہے۔ اس زندگی کو زندگی دینے والا میرے لئے سب سے زیادہ محترم ہے۔ اس لئے میں اسے رہائی دلاؤں گا۔"

سب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "میں کل سے سوچ رہا ہوں اور بار بار میرے ذہن میں یہ بات آ رہی ہے کہ لوہے کو صرف لوہا کاٹتا ہے۔ بدمعاش کو کوئی شریف آدمی نہیں مار سکتا' اسے بدمعاش ہی مار سکتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہی سوچ رہا ہوں کہ اپنی بات کیسے سمجھاؤں۔ آپ جیسے شریف حضرات کے درمیان میں ایک بدمعاش ہوں۔ مجھے جب سوجھتی ہے' ٹیڑھی چال سوجھتی ہے۔۔ مونا کہتی ہے کہ ایک برا عمل دوسرے برے عمل کو جنم دیتا ہے۔ اگر میں ڈاکٹر کامران کو اس طرح رہائی دلاؤں کہ وہ اپنی طبعی عمر تک بیمار دلوں کی مسیحائی کرتا رہے اور اس پر جیل سے فرار ہونے کا الزام بھی نہ آئے تو کیا اس میں کوئی برائی ہے؟"

وائس چانسلر نے کہا۔ "تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جیل سے فرار بھی ہو اور اس پر الزام بھی نہ آئے۔"

"اگر آپ حضرات میرے منصوبے سے متفق ہوں گے تو پھر آپ تمام کو زندگی میں ایک بار' صرف ایک بار غیر قانونی کام کرنا ہو گا۔"

مونا نے کہا۔ "کیا میں نے تمہیں اسی لئے بلایا ہے کہ تم معزز شخصیات سے غیر قانونی کام کرواؤ؟"

وہ بولا۔ "صرف ایک بار ایسا کرنے سے ڈاکٹر کامران کو وہ آزادی اور رہائی ملے گی کہ وہ تمام عمر انسانیت کی خدمت کرتا رہے گا۔"

فادر نے کہا۔ "بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جھوٹ بول کر کسی کی عزت یا زندگی بچائی جاتی ہے۔"

ڈاکٹر ڈین مارکوس نے کہا۔ "اگر میرے جھوٹ بولنے اور فراڈ کرنے سے سیکڑوں مریضوں کو ڈاکٹر کامران کے ذریعے زندگیاں ملتی رہیں تو میں ضرور جھوٹ بولوں گا اور فراڈ کروں گا۔"

وائس چانسلر نے کہا۔ "ہم ڈاکٹر کامران کو صرف زندگی نہیں دینا چاہتے' مسیحائی کے مواقع بھی دینا چاہتے ہیں۔ مسٹر حیات! آپ کھل کر بات کریں۔"

حیات نے کہا۔ "بات آپ سے شروع ہوتی ہے۔ آپ شکاگو میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ کیا آپ میرے نام یعنی حیات محمد خان کے نام ایک سرٹیفکیٹ جاری کر سکتے ہیں' جس سے ثابت ہو جائے کہ میں ڈاکٹر حیات محمد خان ہارٹ اوپن سرجری اور ہارٹ پلانٹیشن کا ماہر ہوں۔"

وائس چانسلر نے کہا۔ "مائی گاڈ! تم ہارٹ سرجری کی اے بی سی سے واقف نہیں ہو۔

اپنے نام سے ایسا سرٹیفکیٹ لے کر کیا کرو گے؟"

"اگر میں کامیاب سرجری کر کے دکھاؤں تو آپ مطمئن ہو جائیں گے؟"

مونا نے کہا۔ "کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ تم ڈاکٹر کب سے بن گئے؟ وہ بھی معمولی نہیں' ہارٹ سرجن بن رہے ہو؟"

"پلیز مونا! ابھی خاموش رہو۔ میں جناب وائس چانسلر سے جواب چاہتا ہوں۔"

وائس چانسلر جے ڈیسوزا نے کہا۔ "اگرچہ تم ناممکن بات کر رہے ہو پھر بھی تم اگر مجھے مطمئن کرو گے تو میں تمہارے نام بڑی رازداری سے سرٹیفکیٹ بھی جاری کروں گا اور آل ورلڈ میڈیکل بورڈ کے نامور ڈاکٹروں سے بھی یہ سرٹیفکیٹ دلاؤں گا کہ تم نے دنیا کے مشہور و معروف ہارٹ سرجری کے ڈاکٹروں کے ساتھ کام کیا ہے۔"

حیات نے کہا۔ "آپ ایک بڑی مشکل آسان کر رہے ہیں۔ آج میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ جعلسازی کے ذریعے ایسا سرٹیفکیٹ بنواؤں گا پھر ایک پلاسٹک سرجری کے ماہر کی خدمات حاصل کر کے ڈاکٹر کامران بن جاؤں گا۔"

"کیا؟" سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

حیات نے کہا۔ "پلاسٹک سرجری کے ذریعے دو کیا دس آدمی ہم شکل بن جاتے ہیں۔ کیا آپ مجھے ڈاکٹر کامران نہیں بنا سکیں گے؟"

ڈاکٹر ڈین مارکوس نے کہا۔ "یہ میرے لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن تمہارا منصوبہ کیا ہے؟"

"یہی کہ یہاں سے ڈاکٹر کامران کا ہم شکل ڈاکٹر حیات محمد خان پاکستان جائے گا۔ میرے وہاں پہنچتے تک ڈاکٹر کو جیل سے فرار کرایا جائے گا۔ یہ کام میری ایجنسی کے لوگ کریں گے۔ جہاں ڈاکٹر کامران کو پہنچایا جائے گا۔ وہاں اسے ڈاکٹر حیات محمد خان ہارٹ سرجری کے ماہر کا سرٹیفکیٹ دے دیا جائے گا اور میں ڈاکٹر کامران بن کر پولیس والوں کو اپنے پیچھے لگاؤں گا۔ ہسپتال میں ڈاکٹر کامران اپنے فرائض انجام دیتا رہے گا اور لوگ سمجھیں گے کہ ڈاکٹر حیات محمد خان ہارٹ سرجری کے فرائض انجام دے رہا ہے۔"

وائس چانسلر نے حیرت اور مسرت سے کہا۔ "اگر اس منصوبے پر کامیابی سے عمل ہو گا تو پھر کمال ہو جائے گا۔ میں جو سرٹیفکیٹ جاری کروں گا اس کا غلط استعمال نہیں ہو گا۔ ڈاکٹر تو کامران ہی رہے گا۔ صرف نام بدل جائے گا۔"

سب تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ حیات نے جو منصوبہ پیش کیا تھا' اس کے ہر پہلو پر غور کرنے لگے۔ مونا نے حیات کا ہاتھ محبت سے تھام کر کہا۔ "میں جانتی ہوں' تم میرے دل کو میرے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔ پولیس والے تمہیں مفرور ڈاکٹر کامران سمجھ کر گولی مار سکتے ہیں۔"

"مونا! نیکیاں کرنے کے لئے کوئی خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے تم میری فکر نہ کرو۔ خدا نے چاہا تو میں زندہ سلامت تمہارے پاس آؤں گا۔"

فادر بنجامن سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ حیات نے پوچھا۔ "فادر! میرے منصوبے میں کوئی کھوٹ ہے تو بتائیں؟"

فادر نے کہا۔ "خداوند یسوع تمہاری اور مونا کی محبت سلامت رکھے۔ تم مونا کی خاطر واقعی خطرہ مول لے رہے ہو۔ تمہارا منصوبہ پیچیدہ ہے لیکن قابلِ عمل ہو جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ بائی دی وے' مجھے ایک بات پر اعتراض ہے۔"

"آپ فرمائیں اور بہتر مشورہ دیں۔"

فادر نے کہا۔ "یہ کام ہم چند معزز افراد کے اشتراک سے بڑی رازداری سے ہو گا۔ اس میں جرائم پیشہ افراد کو شریک نہیں ہونا چاہئے۔ تم کہتے ہوں کہ تمہاری ایجنسی کے کچھ لوگ ڈاکٹر کامران کو جیل سے فرار کرائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی مجرم ہمارا راز دار ہو۔ حتیٰ کہ میں تمہارے بھی منصوبے میں اس وقت تک شریک نہیں ہوں گا' جب تک تم مجرمانہ زندگی سے توبہ نہیں کرو گے۔"

حیات نے کہا۔ "آپ نہ کہتے تب بھی میں یہی کرتا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ پلاسٹک سرجری کے بعد میرا چہرہ بدل جائے گا تو ایجنسی والے مجھے کبھی پہچان نہیں سکیں گے۔ میں ایک نئی شریفانہ زندگی شروع کروں گا لیکن فادر! کامران کو جیل سے فرار کرانے کے لئے ان مجرموں کی مدد حاصل کرنی ہو گی۔"

"میں راہب ہوں۔ چرچ میں آنے والوں کو نیک ہدایات دیتا ہوں اور ہمیشہ خدا کی مدد مانگتا ہوں۔ تم بھی خدا پر بھروسہ کرو۔ کسی مجرم کو اس منصوبے میں شریک نہ کرو۔ ڈاکٹر کامران کو میں جیل سے باہر لے آؤں گا۔"

"آپ............! وہ کیسے؟"

"میں کل کسی فلائٹ سے پاکستان جاؤں گا۔ وہاں حالات کے مطابق کچھ کروں گا۔

کامیابی ہوتے ہی فیکس کے ذریعے وائس چانسلر کو تمام باتیں تفصیل سے بتاؤں گا۔ اس کے مطابق تم ڈاکٹر حیات محمد خان ہارٹ سرجری کے ماہر بن کر آؤ گے۔"

وہ سب رات کے کھانے کے وقت بھی اس منصوبے کے ایک ایک پہلو پر طرح طرح سے بحث کرتے رہے اور اطمینان حاصل کرتے رہے کہ منصوبہ قابل عمل ہے اور انہیں ایک نیک مقصد میں کامیابی ضرور ہو گی۔

☆-------☆-------☆

اس اسپتال کی شہرت ذرا سی گہنا گئی۔ ڈاکٹر کامران کے جیل جانے کے بعد تبدیلی قلب کے ایک آپریشن کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اسپتال کی انتظامیہ نے اور ڈاکٹروں نے عدالت میں درخواست دی تھی کہ آپریشن کے لئے ڈاکٹر کامران کو ضمانت پر ایک دن کے لئے رہا کیا جائے لیکن درخواست کو نامنظور کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ کسی دوسرے ہارٹ سرجری کے ماہر کی خدمات حاصل کی جائیں۔

ایسا مجبوراً کرنا پڑا لیکن آپریشن ناکام رہا۔ جس مریض کے سینے میں دل منتقل کیا جا رہا تھا' وہ آپریشن کے دوران مر گیا۔ مرنے والے کے عزیز و اقارب بہت دولت مند تھے۔ انہوں نے اسپتال کی انتظامیہ سے مل کر عدالت کے اس جج کے خلاف قانونی کارروائی شروع کی اور یہ مؤقف اختیار کیا کہ ڈاکٹر کامران کو پولیس کسٹڈی میں آپریشن کی اجازت دی جاتی تو آپریشن ناکام نہ ہوتا۔ یوں تو بعض آپریشن ناکام رہتے ہیں اور خصوصاً تبدیلی قلب کے آپریشن میں کامیابی کے چانس بہت کم ہوتے ہیں۔ تاہم دنیا کے ایسے مشہور معروف ڈاکٹروں میں کامران کا شمار ہوتا تھا' جنہوں نے ننانوے فیصد کامیاب آپریشن کئے تھے۔

بہرحال یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ انسانی زندگی بچانے کی خاطر ڈاکٹر کامران کو پولیس کسٹڈی میں آپریشن کرنے کے لئے اسپتال لے جایا جا سکتا ہے۔

ایسے وقت فادر بنجامن............ اس شہر میں آئے۔ چونکہ وہ نوٹرے ڈیم سے آئے تھے۔ اس لئے مقامی گرجا گھروں کے فادر اور دوسرے راہبوں نے ان کا پُرجوش استقبال کیا۔ انہوں نے مختلف اسپتالوں کا دورہ کیا پھر اس اسپتال میں بھی پہنچے' جہاں ایک نہایت ہی کامیاب سرجن کی حیثیت سے ڈاکٹر کامران کی ایک بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔

اسپتال کی انتظامیہ کے بڑے بڑے عہدے دار فادر بنجامن کے ساتھ تھے۔ فادر نے

اس تصویر کو دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔ "کیا ڈاکٹر حیات خان شکاگو سے پاکستان آ گئے ہیں؟ اور آپ کے اسپتال میں ہیں؟"

انتظامیہ کے سیکرٹری نے کہا۔ "یہ ڈاکٹر کامران کی تصویر ہے جو پچھلے ڈیڑھ برس سے ہمارے اسپتال کا نام روشن کر رہے ہیں۔"

فادر نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ میں نے دو ماہ پہلے انہیں شکاگو میں دیکھا تھا۔ اگر یہ ڈاکٹر کامران ہیں تو میں ان سے ملنا چاہوں گا۔"

"ہمیں افسوس ہے کہ ان کے ساتھ کچھ ایسی ٹریجڈی ہوئی ہے کہ یہ آج کل جیل میں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ وضاحت کر دیں کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ یہ صرف ہمارے اسپتال کے ہی نہیں' پورے ملک کے نہایت باصلاحیت سرجن تسلیم کئے جاتے ہیں۔"

"پھر تو میں ان سے اور ان کے عزیزوں سے ضرور ملاقات کروں گا۔"

"ان کے عزیزوں میں صرف ایک بہن رائمہ ہے۔ وہ ابھی ڈیوٹی پر آنے والی ہے۔"

وہ اسپتال کا ایک چکر لگا کر ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ فادر نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے اسپتال کی نیک نامی قائم رکھنے کے لئے ڈاکٹر حیات محمد خان کی خدمات حاصل کر لیں۔"

"فادر! وہ امریکا میں ہیں۔ یہاں بلایا جائے گا تو بہت مہنگے پڑیں گے۔"

"بالکل نہیں۔ وہ خود مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اپنا وطن بہت یاد آتا ہے اگر پاکستان سے انہیں بلایا جائے تو وہ کم سے کم معاوضے پر کام کرنے چلے آئیں گے۔ شاید آپ نہیں جانتے' ڈاکٹر حیات محمد خان کا شمار امریکا کے چند بڑے سرجنوں میں ہوتا ہے۔"

"ایسی بات ہے تو ہم آج ہی انہیں خط لکھیں گے۔ کیا آپ ان کا پتا جانتے ہیں؟"

"آپ شکاگو میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر جے ڈیسوزا کا فون نمبر نوٹ کر لیں۔ وہ ڈاکٹر حیات محمد خان کے سلسلے میں تمام معاملات آپ سے طے کرا دیں گے۔"

فادر نے وائس چانسلر کا فون نمبر اور پتا نوٹ کرا دیا۔ جب رائمہ ڈیوٹی پر آئی تو فادر سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ فادر نے کہا۔ "میں نے تمہارے بھائی کی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔ میں کل ہی خصوصی اجازت نامہ لے کر ڈاکٹر کامران سے ملنے جیل جاؤں گا۔ کیا تم

میرے ساتھ چلو گی؟"

وہ اداس مسکراہٹ سے بولی۔ "یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔ میں اکثر بھائی جان سے ملنے کی درخواست دیتی ہوں اور وہ نامنظور ہو جاتی ہے۔ پتا نہیں' ان قانون کے محافظوں کو میرے بھائی جان سے کیا دشمنی ہے؟"

"فکر نہ کرو۔ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ میں کل صبح تمہارے بھائی جان سے ملانے تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

"فادر! آپ بہت اچھے' بہت مہربان ہیں۔"

اسی وقت ماریہ کمرے میں آئی۔ ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "مس ماریہ! تمہیں کئی بار سمجھایا گیا ہے کہ اپنے کمرے میں آرام کیا کرو۔"

ماریہ نے کہا۔ "ذہنی سکون ہو تو آرام ملتا ہے۔ کیا اسپتال کے بستر پر لیٹے رہنے سے مریض صحت یاب ہو جاتے ہیں؟"

رائمہ نے کہا۔ "پلیز بھابی! آپ کمرے میں چلیں۔"

فادر نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ تمہاری بھابی یعنی مسز کامران ہیں؟"

ڈاکٹروں اور انتظامیہ کے عہدے داروں نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ رائمہ نے کہا۔ "یہ میری آدھی بھابی ہیں۔ میں پہلے انہیں مس ماریہ کہتی تھی لیکن یہ ضد کرنے لگیں۔ مجھے بھی ایسا ہی لگا جیسے میری بھابی ان کے سینے سے دھڑک دھڑک کر کہہ رہی ہوں کہ میں ان کی ضد پوری کروں۔"

فادر نے اپنی پیشانی سے سینے تک مقدس صلیب بناتے ہوئے کہا۔ "خداوند یسوع' اس کے دل کی دھڑکنوں کو سلامت رکھے۔ بیٹی رائمہ! تم اسے بھابی کہہ کر آکسیجن دیتی رہتی ہو۔ جاؤ بیٹی ماریہ اپنے کمرے میں آرام کرو۔"

رائمہ اسے وہاں سے لے گئی۔ فادر نے ایک ڈاکٹر سے معلوم کیا کہ رائمہ کی ڈیوٹی کب ختم ہو گی۔ پتا چلا' وہ رات دس بجے تک اسپتال میں رہے گی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں کے ڈاکٹروں اور انتظامیہ کے عہدیداروں سے گفتگو کرتے رہنے کے دوران فادر نے ان سب کو ڈاکٹر کامران کا مداح پایا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہاں کامران سے مخالفت رکھنے والے ڈاکٹر ہوں لیکن ایک بیرونی ملک سے آنے والے فادر کے سامنے جھوٹی زبان سے کامران کی تعریفیں کر رہے ہوں۔ فادر نے دنیا دیکھی تھی وہ دوسروں کی گفتگو اور لہجے

سے ان کے مزاج کا اندازہ کر لیتے تھے۔ اور پھر ہر ایک پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

وہ رات کے دس بجے اس اسپتال سے ذرا دور جا کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ آدھے گھنٹے بعد رائمہ اپنی کار ڈرائیو کرتی ہوئی اسپتال کے احاطے سے باہر آئی۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر اس نے کار کی ہیڈ لائٹس میں فادر کو دیکھا۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تھے۔ رائمہ نے ان کے قریب پہنچ کر کار روکی' پھر پوچھا۔ "فادر! آپ؟ یہاں تنہا کھڑے ہیں؟ آیئے آپ کہاں جائیں گے؟"

انہوں نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کیا پھر کہا۔ "میں اس لئے کھڑا ہوا تھا کہ تم مجھے دیکھو گی تو اپنی کار ضرور روکو گی۔ پھر مجھ سے میری منزل پوچھو گی اور میں کہوں گا کہ میری منزل تمہارا بھائی ہے۔ چونکہ تم اس کی سگی بہن ہو۔ اس لئے تم پر بھروسا کر کے یہ راز بتا رہا ہوں کہ میں یہاں تمہارے بھائی کو بے قصور ثابت کرنے آیا ہوں۔"

اس نے حیرانی سے فادر کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "آپ ہزاروں میل دور سے میرے بھائی کی بے گناہی ثابت کرنے آئے ہیں؟ کیا ان سے آپ کی گہری شناسائی ہے؟"

"بیٹی! تم نہیں جانتیں۔ میری طرح بے شمار لوگ ڈاکٹر کامران کو اتنی محبت سے جانتے ہیں کہ اس کی طویل عمری کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ایسے ہی چند لوگ کامران کی رہائی کے لئے میرے ساتھ عملی کوششیں کر رہے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔"

رائمہ نے فادر کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے چوما پھر اسے اپنے چہرے سے لگا کر رونے لگی۔ فادر نے کہا۔ "ایک لیڈی ڈاکٹر کا دل مضبوط ہوتا ہے۔ اسے رونا نہیں چاہئے۔ اگرچہ یہ خوشی کے اور تشکر کے آنسو ہیں' تاہم انہیں پونچھ لو۔ مجھے تمہارے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔"

"میں تعاون کرنے کے لئے دن رات آپ کے قدموں میں پڑی رہوں گی۔ میرے بھائی جان کی بے گناہی ثابت ہو گی تو میرا سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔"

"کار اسٹارٹ کرو۔ میں تمہارے گھر چل رہا ہوں۔"

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی اور کہا۔ "میں نے اسپتال سے سنا ہے کہ

امریکا میں میرے بھائی جان کا ایک ہم شکل ڈاکٹر ہے اور ہماری انتظامیہ ان کی خدمات حاصل کرنے والی ہے۔"

"تم تمام حقائق سے آگاہ رہو گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اسپتال کے عملے میں ایسے کتنے ڈاکٹر' نرسیں اور دوسرے کارکن ہیں' جو تمہارے بھائی جان کی خداداد صلاحیتوں سے حسد کرتے ہوں گے۔ میرا یہ سوال اہم ہے۔ کامران کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے ایسے افراد کو اچھی طرح پہچاننے کی کوشش کرنا چاہئے' جو بظاہر تعریفیں کرتے ہوں مگر باطن میں عداوت رکھتے ہوں۔"

"میں دو ڈاکٹروں کو اور ایک نرس کو جانتی ہوں۔ وہ اس طرح کہ بھائی جان نے ہر آپریشن کے دوران اس نرس کو نا اہل قرار دیا تھا۔ باقی دو ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ جب تک بھائی جان اسپتال کے سینئر سرجن رہیں گے ان دونوں کو کبھی اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع نہیں ملے گا۔"

"تم کتنے ڈاکٹروں اور نرسوں پر بھروسا کر سکتی ہو کہ وہ تمہارے بھائی جان کے موجودہ معاملے میں رازدار بن کر رہ سکتے ہیں۔"

"ہارٹ پلانٹیشن کے لئے بھائی جان نے مجھ سمیت دو لیڈی ڈاکٹر' تین ڈاکٹر اور تین نرسوں کی ایک مستقل ٹیم بنائی ہے۔ ہر آپریشن میں صرف اسی ٹیم کے افراد موجود رہتے ہیں۔ کسی اور کو آپریشن تھیٹر کے اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔"

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کامران کو اپنی اس مستقل اور مخصوص ٹیم کے ہر فرد پر مکمل اعتماد ہے۔ اگر کبھی ضرورت پیش آئے گی تو ان سب کو کامران کی رہائی کے سلسلے میں راز دار بنایا جا سکتا ہے۔"

"جی ہاں' لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا ہے کہ بھائی جان کی رہائی کے سلسلے میں رازداری کیا ہو گی؟"

"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے مجھے مطمئن ہونے دو۔ اب یہ بتاؤ کہ موجودہ کیس میں تمہیں کن افراد پر شبہ ہے؟ ایک تو پیشہ وارانہ حسد اور عداوت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ سماجی اور گھریلو مسائل پر اختلافات ہو سکتے ہیں۔"

"فادر! آپ کا یہ سوال بہت اہم ہے۔ میرے بھائی جان کی ساس عاصمہ خاتون کے تیور اچانک بدل گئے ہیں۔ وہ بھی بھائی جان کو اپنی بیٹی سلمٰی کا قاتل کہہ رہی ہیں اور یہ

جھوٹا بیان دے چکی ہیں کہ سلمیٰ بھابی میرے بھائی جان سے طلاق لینا چاہتی تھیں لیکن بھائی جان نے طلاق نہیں دی بلکہ ان کا دل نکال کر دولت مند ماریہ کو دے دیا ہے۔ عاصمہ خاتون کے اس بیان کی تائید ماریہ کا سابقہ بیرسٹر وقار احمد بھی کر رہا ہے اور عدالت میں وہ وصیت پیش کر چکا ہے جس کی رُو سے ماریہ کی تمام دولت اور جائیداد بھائی جان کو مل جاتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلحے کی تجارت کرنے والی کسی بڑی ایجنسی نے عاصمہ خاتون اور بیرسٹر وقار احمد کو خرید لیا ہے اور کامران کے خلاف قتل کے کیس کو اس قدر مضبوط بنا دیا ہے کہ جائز طریقوں سے قانونی جنگ لڑی جائے تو کامران کو بے قصور ثابت کرنا ممکن نہیں ہو گا۔"

"مجھے یہی سوچ کر رونا آتا ہے کہ میں کسی بھی طرح اپنے بھائی جان کو سزائے موت سے نہیں بچا سکوں گی۔"

"بیٹی! مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ایک چھوٹا سا کیس تمہارے بھائی کے حق میں جیت لیا گیا ہے کہ مقدمے کا آخری فیصلہ ہونے تک اسپتال میں جب بھی ہارٹ پلانٹیشن کا آپریشن ہو گا۔ تمہارے بھائی کو پولیس کسٹڈی میں آپریشن کے لئے لایا جائے گا۔ یہ جیتنے والی بازی ہے۔ یہ پوائنٹ مضبوط ہوتا رہے گا کہ جو شخص جیل میں رہ کر بھی مریضوں کو نئی زندگیاں دیتا رہا' وہ قاتل کہلائے گا یا مسیحا؟"

فادر اس رات رائمہ کے ساتھ رہے اور اسے اس منصوبے کا ایک ایک پہلو سمجھاتے رہے' جس پر آئندہ عمل کرنا تھا۔ وہ دونوں دوسری صبح کامران سے ملنے کے لئے جیل گئے۔ کامران نے انہیں دیکھتے ہی پہچان کر پوچھا۔ "فادر! آپ اور یہاں؟"

"ہاں بیٹے! ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے تم سے ایک چیز مانگنے آیا ہوں۔ کیا دو گے؟"

"آپ مانگنے کا لفظ استعمال کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ حکم دیں میں عمل کروں گا' جو میرے اختیار میں ہے وہ آپ کے سامنے پیش کروں گا۔"

"میں تمہاری سلامتی مانگنے آیا ہوں۔"

"اب تو میری سلامتی میرے بس میں نہیں رہی۔"

"میری ہدایات پر عمل کرو گے تو خدا کی مرضی سے سلامت رہو گے۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ انسان کو ظلم کے آگے جھکنا نہیں چاہئے۔ کوئی دشمنی کرے تو اس کا جواب نہایت چالبازی سے دینا چاہئے۔ کوئی خواہ مخواہ تمہاری جان لینا چاہے تو احمقوں اور بزدلوں کی طرح جان نہیں دینا چاہئے۔"

"فادر! مجھے قانون کی طاقت پر بھروسا ہے۔"

"قانون ظالموں کے ہاتھوں میں ہو تو بھروسا کرنا نادانی ہے۔ ذرا عقل سے سوچو۔ جو ساس تمہارے گن گایا کرتی تھی وہ تمہارے خلاف بیان دے چکی ہے۔ ماریہ کا وکیل ثابت کر رہا ہے کہ تم اپنی بیوی کے دل کے بدلے ماریہ کی دولت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے تمہاری ساس اور بیرسٹر کو خرید لیا ہے۔ ان حالات میں تمہیں سمجھانے آیا ہوں کہ مکاری کا جواب مکاریوں سے دو۔"

"فادر! آپ ایک مذہبی پیشوا ہو کر ایسا کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ ایسا مذہبی پیشوا کو کہنا چاہیے کہ اسلحے کے تاجروں سے انسانیت دم توڑ رہی ہو تو ان ظالموں کو بے نقاب کرو۔ اگر انہیں ختم نہیں کر سکتے تو ان کی تجارت کو ناکام بناؤ۔ جیل کے باہر بے شمار دل کے مریض تمہارے منتظر ہیں۔ تم ان سب کو زندگی نہ دے کر خود کو پھانسی کے تختے تک پہنچو گے تو یہ سچائی اور انسانیت سے منہ موڑنے والا عمل ہو گا۔ کیا تم فادر سے یہ توقع کرتے ہو کہ تمہیں انسانیت سے منہ موڑنے والا درس دے گا؟ ذرا غور کرو۔ اگر تم کسی طرح جیل سے فرار ہو کر خود کو بے قصور اور مجرم کو مجرم ثابت کرو گے تو یہ قانون کی مدد ہو گی یا قانون سے دشمنی؟"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ اصلی مجرموں کو عدالت میں پیش کیا جانا چاہئے لیکن میں انہیں پہچانتا نہیں ہوں اور نہ ہی جیل سے باہر نکل کر انہیں تلاش کر سکتا ہوں۔"

"میں تمہیں جیل سے باہر نکالوں گا۔ تم صرف اتنے عرصے تک مفرور کہلاؤ گے' جب تک اصلی مجرم گرفتار نہیں ہوں گے۔ میں تمہاری سلامتی مانگنے آیا ہوں۔ تمہیں میرا مانگنا برا لگتا ہے تو پھر میں حکم دیتا ہوں۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن آپ ایک بات نہیں جانتے۔ عدالت سے یہ اجازت نامہ حاصل ہو گیا ہے کہ میں تبدیلی قلب کا آپریشن کرنے کے لئے جیل سے اسپتال جا سکتا ہوں۔ کیا اس طرح انسانیت کی خدمت نہیں ہو گی؟"

”صرف انسانیت کی خدمت ہو گی لیکن تمہاری بے گناہی ثابت نہیں ہو گی۔ تم میری ہدایت پر عمل کرو گے تو خود کو بے گناہ بھی ثابت کر سکو گے اور اپنے اسپتال کے ہر مریض کا علاج بھی کرتے رہو گے۔“

کامران نے حیرانی سے پوچھا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ جیل سے فرار ہو کر میں اپنے ملک کے کسی اسپتال میں کسی بھی مریض کا آپریشن نہیں کر سکوں گا۔ اس سے پہلے ہی پولیس گرفتار کر لے گی۔“

”بیٹے! میں بہت سوچ سمجھ کر ایک ٹھوس منصوبے پر عمل کرنے آیا ہوں۔ تم صرف اتنا وعدہ کرو جب بھی تمہیں فرار ہونے کا موقع دیا جائے گا‘ تم انکار نہیں کرو گے۔ تمہاری یہ بہن رائمہ جیسا تمہیں کہے گی ویسا ہی عمل کرو گے۔“

کامران نے رائمہ کو دیکھا‘ وہ بولی۔ ”بھائی جان! آپ کو ایک چھوٹی سی قانون شکنی کے بعد قانون کا بول بالا کرنا ہے۔ آپ فادر کی ہدایت پر سر جھکا لیں۔“

ڈاکٹر کامران نے سوچنے کے انداز میں سر جھکا لیا۔

☆------☆------☆

پولیس اور انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ والے چوکس ہو گئے۔ اسپتال والوں کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی کہ وہ شکاگو کے ایک ڈاکٹر حیات محمد خان ہارٹ سرجری کے ماہر کی خدمات حاصل کر رہے ہیں۔ مذکورہ ڈاکٹر ایک آدھ ہفتے میں آنے والا ہے۔

اس ڈاکٹر کی تصاویر اور سرجری کے سلسلے میں مہارت کے سرٹیفکیٹ وغیرہ پولیس اور انٹیلی جنس والوں اور ڈپٹی کمشنر وغیرہ کے دفاتر میں بھیجے گئے تھے۔ اس تصویر نے سب کو چونکا دیا تھا اور شبے میں مبتلا کیا تھا کیونکہ وہ آنے والا ڈاکٹر ہو بہو کامران کا ہم شکل تھا۔

اس سلسلے میں اسپتال کی انتظامیہ سے طرح طرح کے سوالات کئے جا رہے تھے۔ انتظامیہ کے عہدے داروں کا جواب تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر حیات محمد خان کو ڈاکٹر کامران کا ہم شکل بنا کر پیدا نہیں کیا ہے۔ اس کی تصویریں اسی لئے قانون کے محافظوں کے پاس بھیجی گئی ہیں کہ وہ ڈاکٹر حیات محمد خان کی آمد سے پہلے اچھی طرح تحقیقات کر لیں۔

انہوں نے یہی کیا۔ شکاگو کی انٹیلی جنس والوں سے رابطہ کیا۔ اپنے جاسوس بھی وہاں روانہ کئے تاکہ وہ خود ڈاکٹر حیات محمد خان سے ملاقات کریں۔ ویسے وہ لوگ جتنی بھی تحقیقات کرتے۔ منصوبہ پہلے سے مکمل تھا۔ شکاگو میڈیکل یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹ سے

اور وہاں کے وائس چانسلر کی طرف سے ہونے والی تصدیق سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آل ورلڈ میڈیکل ایسوسی ایشن کے اعلیٰ عہدے داروں نے یہ اعزازی سرٹیفکیٹ دیا تھا کہ ڈاکٹر حیات نے بین الاقوامی شہرت یافتہ ہارٹ پلانٹیشن کے ماہرین کے ساتھ رہ کر بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

چند سراغ رسانوں نے محدب شیشے کے ذریعے ڈاکٹر حیات کے چہرے اور گردن کا معائنہ کیا تاکہ پلاسٹک سرجری کا سراغ لگ سکے۔ پہلے پلاسٹک کے ریشوں سے سرجری کی جاتی تھی لیکن اب میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ انسانی گوشت کے ریشوں سے سرجری ہونے لگی تھی۔ اس لئے محدب شیشہ بھی ان کے کام نہ آ سکا۔ انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ڈاکٹر حیات پیدائشی طور پر ڈاکٹر کامران کا ہم شکل ہے پھر یوں بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جس صورت کو وہ شکاگو میں دیکھ رہے تھے‘ اس صورت والا پاکستان کی جیل میں مقید تھا۔

وہ پاکستانی سراغ رساں ڈاکٹر حیات کی دس انگلیوں کے نشانات لے کر واپس آ گئے۔ ادھر ڈاکٹر کامران کی دس انگلیوں کے نشانات انٹیلی جنس والوں کے ریکارڈ میں تھے۔ فنگر پرنٹس کے ماہرین نے دونوں کا موازنہ کیا۔ وہ دونوں نشانات مختلف تھے۔ اب کسی پہلو سے شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دنیا میں بے شمار لوگ ہم شکل ہوتے ہیں اور ہم پیشہ ہوتے ہیں۔ اسے ایک اتفاق سمجھا گیا کہ حیات محمد خان اور کامران ہم پیشہ سرجن ہونے کے علاوہ ہم شکل بھی ہیں۔

☆------☆------☆

ایسی ہی تحقیقات کے دنوں میں ایک ایمرجنسی آپریشن کی نوبت آئی۔ عدالت کے حکم نامے کے مطابق ڈاکٹر کامران کو ہتھکڑیاں لگا کر ایک درجن پولیس والوں کی نگرانی میں اسپتال لایا گیا۔ اسپتال کے پورے عملے نے بڑی عقیدت سے اس کا استقبال کیا۔ آپریشن تھیٹر کے دروازے پر پہنچ کر پولیس افسر نے کہا۔ ”آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ یہاں بھیڑ نہ لگائیں۔ آپریشن تھیٹر کے اگلے اور پچھلے دروازے پر صرف ہم پولیس والے رہیں گے۔ کسی غیر ضروری فرد کو اندر جانے نہیں دیا جائے گا اور اندر سے آنے والوں کی شناخت کی جائے گی کہ وہ آپریشن کے دوران اندر موجود تھے یا نہیں؟“

ڈاکٹر کامران نے اپنی ٹیم کے مخصوص ڈاکٹروں اور نرسوں کی شناخت کرائی۔ وہ

سب ایک ایک کر کے اندر چلے گئے پھر افسر نے کامران کی ہتھکڑیاں کھول دیں پھر کہا "ہمیں معلوم ہے کہ آپریشن تھیٹر کے اندر کسی کو جانے نہیں دیا جاتا ہے۔ ہم بھی نہیں جائیں گے لیکن تم آپریشن کے فوراً بعد باہر آ کر خود کو ہمارے حوالے کر دو گے۔ ہم جس طرح لائے ہیں' اسی طرح تمہیں لے جا کر جیل حکام کے حوالے کر دیں گے۔"

کامران اپنی کلائیوں کو سہلاتا ہوا دروازہ کھول کر گیا پھر اس آپریشن تھیٹر کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا گیا۔ اس کے اگلے اور پچھلے دروازے پر مسلح سپاہی مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ دو افسران بھی دو دروازوں کی طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ ہارٹ پلانٹیشن کا آپریشن بڑا ہی دقت طلب اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس میں کئی گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ پولیس والوں کے لئے یہ انتظار بڑا صبر آزما تھا لیکن ڈیوٹی پھر ڈیوٹی ہوتی ہے۔ جس قیدی کو لایا گیا تھا' اسے جیل کے اندر پہنچانے کی ذمے داری دو افسران اور درجن بھر سپاہیوں کی تھی۔

تقریباً چار گھنٹے کے بعد وہ دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر کامران ایک ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ باہر آتے ہوئے بولا۔ "مریض کے پاس مزید ایک گھنٹے تک رہو۔ بلڈ پمپنگ اور سرکولیشن پر خاص توجہ دو۔"

دونوں افسران اور مسلح سپاہی اس کے قریب آ گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا "مجھے امید ہے' مریض بریدنگ کے لئے ایزی فیل کرے گا۔ خدانخواستہ اگر معاملہ پیچیدہ ہو جائے تو فوراً مجھے جیل میں فون کیا جائے۔ میرے یہاں سے روانہ ہوتے ہی جیل حکام کو پہلے سے کہہ دیا جائے کہ ایمرجنسی کے وقت پھر مجھے یہاں آنے کی اجازت دی جائے۔"

جب اس نے تمام متعلقہ ڈاکٹروں کو ہدایات دے دیں تو پھر اپنے ہاتھ افسر کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ افسر ہتھکڑی پہناتے ہوئے بولا۔ "ہم قانونی طور پر اپنے فرائض سے مجبور ہیں۔ ورنہ یہ بڑی ندامت کا مقام ہے کہ آپ کسی کو ایک نئی زندگی دے کر آ رہے ہیں اور ہم آپ کو جیل پہنچانے جا رہے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "آپ ندامت محسوس نہ کریں۔ ہو سکتا ہے آئندہ مجھے یہاں نہ آنا پڑے۔ سنا ہے کہ ایک بہت ہی باصلاحیت ڈاکٹر اس اسپتال میں آنے والا ہے۔"

وہ سپاہیوں کے درمیان اسپتال کی عمارت کے مختلف حصوں سے گزرنے لگا۔ وہاں کے دوسرے تمام ڈاکٹر' نرسیں اور وارڈ بوائز اپنا کام چھوڑ کر آگے پیچھے چلتے ہوئے احتجاجاً

کہہ رہے تھے۔ "ہمارے ملک کے قانون کو اندھا بنا دیا گیا ہے۔ جو ڈاکٹر بے شمار مریضوں کو زندگیاں دیتا ہے اسے ایک ایسے قتل کے الزام میں پھنسایا گیا ہے' جو اس نے نہیں کیا۔ پھر ایک معزز ڈاکٹر کو ہتھکڑیاں پہنائی گئی ہیں اور قیدی کا لباس پہنا کر لایا گیا ہے۔ قانون کے محافظوں کو شرم آنی چاہئے۔ شرم' شرم' شرم.......... شیم.......... شیم.........."

وہ سب بلند آواز میں بولتے ہوئے عمارت کے باہر آئے۔ قیدیوں کو لے جانے والی ایک چھوٹی گاڑی میں ڈاکٹر کو بٹھایا گیا۔ اس کے آس پاس مسلح سپاہی بیٹھ گئے۔ اگلی سیٹ پر ایک افسر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوسری گاڑی میں ان کا بڑا افسر چند سپاہیوں کے ساتھ تھا۔ اسپتال والوں کے احتجاجی نعرے گونجتے رہے۔ پولیس والوں پر نعرے بازیوں کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی گاڑیوں میں اسپتال کے احاطے سے باہر آئے پھر وہ دونوں گاڑیاں تیز رفتاری سے جانے لگیں۔ اس مصروف شاہراہ سے دوسرے راستے پر وہ گاڑیاں مڑ گئیں۔ اس وقت قیدیوں والی گاڑی کے افسر کے موبائل فون سے اشارہ موصول ہوا۔ اس نے اسے آن کر کے پوچھا۔ "ہیلو' میں ڈی ایس پی بول رہا ہوں۔ فرمایئے؟"

"فرمانا کیا ہے؟ یہاں کے بڑے نامور ڈاکٹر مقدمے کو طول دیتے جائیں گے اور قیدی کامران کے بچاؤ کا یہ راستہ نکالیں گے کہ وہ جیل میں رہ کر بھی دل کے مریضوں کو نئی زندگیاں دے رہا ہے۔ لہٰذا اس کا ایک قتل معاف کیا جائے یا سزا میں کمی کی جائے۔"

"اچھا' آپ مسٹر کیو ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کامران کو جیل سے باہر نہیں لایا جائے گا کیونکہ اس کی طرح ایک بہت ہی باصلاحیت ڈاکٹر آ رہا ہے۔"

"یہ بچوں کو بہلانے کی باتیں ہیں۔ یہاں کوئی نیا ڈاکٹر آئے گا تو کسی دوسرے بڑے شہر کے اسپتال میں ڈاکٹر کامران کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔"

"مسٹر کیو! اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ وہ جیل میں رہتا ہے۔ اسے آپ سے دور کر دیا گیا ہے۔ کبھی آپ سے نہ سامنا ہو گا اور نہ ہی وہ آپ کے خلاف کہہ سکے گا کہ آپ نے اسپتال کے بیسمنٹ میں اسلحے کا گودام بنایا تھا۔"

"بس تم لوگ اسے مجھ سے دور رکھ سکتے ہو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا میں نے کچھ کرنے کا انتظام کر لیا ہے۔ تمہاری اس گاڑی کے نیچے ٹائم بم لگا دیا گیا ہے۔ میری گھڑی کے مطابق پانچ منٹ میں یہ گاڑی بلاسٹ ہو جائے گی۔"

یہ سنتے ہی افسر نے ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی روکو۔"

فون پر آواز آئی۔ "اس گاڑی سے نکلتے وقت صرف قیدی کو اندر چھوڑ دیا جائے۔ باقی اپنے سپاہیوں کو لے کر دور چلے جاؤ۔"

آگے گاڑی رکی تو پیچھے والے افسر کی بھی گاڑی رک گئی۔ اس افسر نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ "بھاگو۔ دور بھاگو' اس گاڑی میں ٹائم بم ہے۔"

اس نے گاڑی کے پچھلے مقفل دروازے کو کھولا۔ دوسرے افسر نے ایک سپاہی سے کہا۔ "نیچے جھک کر دیکھو۔ کیا ٹائم بم نظر آرہا ہے؟"

ایک سپاہی دیکھنے لگا۔ اس افسر نے دوسرے افسر سے کہا۔ "سر! صرف پانچ منٹ کا وقت بتایا گیا ہے اور ایک منٹ گزر چکا ہے۔"

سپاہی نے زمین سے اٹھ کر کہا۔ "سر! واقعی بڑے سائز کا بم ہے اور گھڑی کا کانٹا حرکت کر رہا ہے۔"

وہ بولتے ہوئے وہاں سے بھاگنے لگا۔ دوسرے سپاہی اور افسران بھی دونوں ہاتھ اٹھا کر آنے والی گاڑیوں کو اشارہ کرتے ہوئے اور بھاگتے ہوئے چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ "رک جاؤ۔ واپس جاؤ۔ یہاں خطرہ ہے۔ گو بیک پلیز' گو بیک۔"

پولیس والوں کو اس طرح بدحواسی میں بھاگتے دیکھ کر راہ گیر اور گاڑیوں والے رک گئے تھے اور اپنی گاڑیاں ریورس گیئر میں لے جاتے ہوئے واپسی کے لئے موڑ رہے تھے۔ اگلی گاڑی میں ڈاکٹر کامران کو چھوڑ کر پچھلا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

وہ سب جتنی دور جا سکتے تھے' جاتے رہے پھر رک گئے۔ چار منٹ گزر گئے تھے۔ پانچویں منٹ میں گاڑی کے ساتھ ڈاکٹر کامران کے چیتھڑے اڑنے والے تھے مگر انہوں نے بے یقینی سے دیکھا' وہ گاڑی حرکت میں آگئی تھی اور تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے پولیس والوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ ایک افسر نے پوچھا۔ "قیدی تو پچھلے حصے میں ہے۔ وہ گاڑی کیسے چل رہی ہے؟ اسے کون چلا رہا ہے۔"

دوسرے افسر نے کہا۔ "پانچ منٹ گزر چکے ہیں۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ کم آن' اس گاڑی کا تعاقب کرو۔"

اب ان کے پاس ایک ہی گاڑی رہ گئی تھی۔ ان کا مقدر اچھا تھا کہ وہ دوسری گاڑی ان سے بہت دور تھی۔ ان کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ پھر اس دوسری گاڑی کے چیتھڑے اڑ گئے۔ وہ سب جہاں تھے' وہیں سڑک پر اوندھے منہ گر

پڑے۔ راہ گیر چیختے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ ایک افسر نے چیخ کر سپاہیوں سے کہا۔ "اٹھ کر پیچھے جاؤ اور دو چار گاڑیوں والوں سے لفٹ لے کر اس جیل کی گاڑی کا پیچھا کرو۔"

ابھی گاڑی کے ٹکڑے فضا میں اڑ رہے تھے اور شعلوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گر رہے تھے۔ ایک سپاہی نے کہا۔ "جناب! آپ افسر ہیں۔ گاڑیوں والے آپ کے حکم سے لفٹ دیں گے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

افسر نے گھور کر سپاہی سے کہا۔ "آرڈر از آرڈر۔ جو کہتا ہوں' وہ کرو۔"

دور تک لیٹے ہوئے سپاہیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گاڑی کے ٹکڑے بکھر رہے تھے۔ کسی میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ دوسرے جونیئر افسر نے کہا۔ "اٹھو۔ میرے ساتھ چلو۔ ہمیں دوسری گاڑیوں میں اس کا پیچھا کرنا ہوگا۔"

ایک افسر کے حوصلہ کرنے سے سپاہی اٹھنے لگے لیکن پھر اوندھے منہ گر پڑے۔ ان سے بہت دور کہیں زبردست دھماکا سنائی دیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بہت آگے جا کر سڑک دوسری طرف مڑ گئی تھی۔ اسی موڑ کے قریب ہی شعلے اٹھ رہے تھے۔ ایک افسر نے دوسرے افسر کو دیکھا۔ دونوں کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا وہ قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی بھی تباہ ہو چکی ہے؟

ایک افسر نے دوسرے افسر کے قریب سڑک کے کنارے آ کر موبائل فون سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "ہیلو مسٹر کیو! میں ڈی ایس پی بول رہا ہوں۔ یہ تم نے جو کچھ کیا۔ اچھا نہیں کیا۔ ہماری نوکریاں چلی جائیں گی۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے کہ آپ کی نوکریاں جانے والی ہیں؟"

"تعجب ہے۔ انجان بن کر پوچھ رہے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ صرف قیدی والی گاڑی میں ٹائم بم ہے لیکن ہمارے ایس پی صاحب کی گاڑی بھی بم کے دھماکے سے تباہ ہو گئی ہے اور شاید وہ قیدیوں والی گاڑی بھی۔ کیونکہ وہ ہمیں نظر نہیں آرہی ہے لیکن شعلے دکھائی دے رہے ہیں۔"

"ڈی ایس پی صاحب! میں آپ کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آخر میں نے کب کہا تھا کہ کسی گاڑی میں ٹائم بم ہے۔ آج آپ سے میری ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی میں نے فون پر رابطہ کیا تھا۔ آپ کہاں ہیں؟ میں ابھی آؤں گا۔"

ایس پی نے موبائل فون لے کر کہا۔ "جب تم نے فون نہیں کیا تھا تو پھر ہم سے دور رہو۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ کسی نے قیدی کامران کو فرار کرایا ہے۔"

"اوہ گاڈ! وہ فرار ہوگا تو پہلے مجھے تلاش کرے گا۔ پلیز آپ اس کے فرار ہونے کی تصدیق کریں۔ تب تک میں روپوش رہوں گا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ ایس پی نے اپنے جونیئر افسر کو موبائل ٹیلی فون دے کر پوچھا۔ "کیا تم نے فون پر مسٹر کیو کی آواز پہچانی تھی؟"

"سر! آپ ابھی خود باتیں کر رہے تھے۔ فون کے اسپیکر میں کچھ خرابی ہے۔ کسی حد تک باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن اسپیکر سے گھرر گھرر کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ جب مسٹر کیو انکار کررہا ہے تو پھر کسی نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔"

☆---------☆---------☆

اسپتال کے ایک چیمبر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ مسٹر کیو یعنی ڈاکٹر قیوم نے موبائل فون کو بند کرکے بند دروازے اور کھڑکیوں کو دیکھا پھر اس نے اٹھ کر پارٹیشن کے پیچھے دیکھا۔ اس پر خوف طاری ہوگیا تھا۔ یہ بات دماغ میں گونج رہی تھی کہ جس کسی نے مسٹر کیو بن کر اس افسر کو فون کیا ہے۔ وہ شخص یقیناً ڈاکٹر قیوم سے ان افسران کے رابطے کے متعلق جانتا ہوگا۔

وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ جس نے بھی ڈی ایس پی کو فون پر ٹائم بم کے متعلق بتایا تھا۔ اس نے پہلے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ خود ڈی ایس پی نے کہا تھا کہ اچھا آپ مسٹر کیو ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کامران کو..........

اس طرح اجنبی فون کرنے والے کو معلوم ہوگیا تھا کہ کسی مسٹر کیو سے ان افسران کی واقفیت ہے۔ وہ اجنبی صرف ٹائم بم کی اطلاع دے کر پولیس والوں کو حواس باختہ کرکے قیدی کی گاڑی وہاں سے لے جانا چاہتا تھا۔ ایسا کرنے سے اس اجنبی کو مسٹر کیو کا کوڈ نیم معلوم ہوگیا تھا۔

اب ڈاکٹر قیوم سوچ رہا تھا کہ فرار ہونے والے ڈاکٹر کامران کے حمایتی صرف ملک کے بڑے معروف ڈاکٹر ہی نہیں' بلکہ کچھ ایسے جرائم پیشہ لوگ بھی ہیں' جو اتنی چالاکی سے کامران کو کہیں لے گئے ہیں اور مسٹر کیو کے کوڈ نیم کو بھی جانتے ہیں۔ وہ فوراً ہی اپنے چیمبر کا دروازہ کھول کر نکلا تو ایک دم سے گھبرا گیا۔ کھلے ہوئے دروازے کے سامنے

ڈاکٹر کامران کی بہن رائمہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولی "سر! آر یو آل رائٹ؟ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟"

"آں' وہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ گھر سے فون آیا تھا۔ بچے کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ میں گھر جارہا ہوں۔"

وہ تیزی سے رائمہ کے قریب سے گزرتا ہوا عمارت کے باہر آیا۔ بیسمنٹ میں جاکر اپنی کار میں بیٹھا۔ پھر اسے ڈرائیو کرتے ہوئے پہلے بیسمنٹ سے پھر اسپتال کے احاطے سے باہر شاہراہ پر آگیا۔ خوف کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر کامران نے اپنے آدمیوں کو اس کے متعلق بتایا ہوگا۔ لہٰذا کوئی دشمن تعاقب کررہا ہوگا۔ اسے گھر کی طرف نہیں جانا چاہئے۔

اس نے دوسری سڑک پر آکر ایک کنارے گاڑی روکی پھر فون کے ذریعے ایجنسی کے باس سے رابطہ کیا اور کہا۔ "باس! بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ وہ کامران.........."

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "جانتا ہوں۔ ابھی اطلاع ملی ہے۔ اس نے تمہارے خلاف بیان دیا تھا کہ تم اسلحے سے بھری ہوئی ایمبولینس اسپتال کے بیسمنٹ میں لے گئے تھے۔ اب فرار ہونے کے بعد وہ تمہیں نہیں چھوڑے گا۔"

"باس! پلیز کچھ کریں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"ہم تمہیں ایسی جگہ چھپا دیں گے جہاں کامران کا باپ بھی نہیں آسکے گا۔ تم ابھی کہاں ہو؟"

اس نے جگہ کی نشاندہی کی۔ باس نے کہا۔ "وہیں انتظار کرو۔ ہمارے آدمی آئیں گے تو اپنی گاڑی وہیں چھوڑ کر ان کے ساتھ ہمارے پاس چلے آنا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ ایسی دہشت طاری تھی کہ وہ بار بار آگے پیچھے' دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے لئے اسلحہ فروخت کرنے والی ایجنسی سے رابطہ کیا تھا۔ ایجنسی کے باس نے اس کی خدمات اس لئے حاصل کی تھیں کہ وہ اسپتال کے بیسمنٹ میں دواؤں کے گودام کا انچارج تھا۔ بیسمنٹ کی چابیاں اس کے اور اسسٹنٹ کے پاس رہا کرتی تھیں۔ وہ اسسٹنٹ بھی اس کا ہم راز تھا۔ وہاں عارضی طور پر ہتھیار چھپا کر ایک دو دنوں میں وہاں سے دوسری جگہ پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس طرح کسی کو شبہ نہیں ہوتا تھا۔

انتظار کی کوفت ختم ہوئی۔ ایک گاڑی ڈاکٹر قیوم کی کار سے ذرا آگے جاکر رکی۔ اس

میں سے ایک شخص نے نکل کر آواز دی۔ "ڈاکٹر کم آن۔ اپنی گاڑی چھوڑ دو۔"

وہ اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر آیا پھر ایک قدم آگے بڑھا۔ آگے والی گاڑی سے اترنے والے شخص نے کہا۔ "ذرا ٹھہرو۔ باس کا پیغام سن لو۔ کامران نے تمہارے خلاف تحریری بیان دیا ہے۔ اس کے فرار ہونے کے بعد تم مرجاؤ گے تو کامران پر تمہارے قتل کا الزام آئے گا۔ کم آن شوٹ ہم............"

یہ کہتے ہی پیچھے ڈکی کا حصہ اوپر اٹھا۔ وہاں دو گن مین اوندھے لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے تڑا تڑ فائرنگ کی۔ ڈاکٹر کو گولیوں سے چھلنی ہوتا ہوا گرا۔ اگلی کار والا اندر بیٹھ چکا تھا۔ ڈکی پھر بند ہوگئی تھی۔ وہ کار اسٹارٹ ہوکر تیز رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆------☆------☆

جس طرح ایک برائی سے دوسری برائی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح ایک نیکی سے دوسری نیکی روشن ہوتی ہے۔ ایک ڈاکٹر یہ نہیں جانتا کہ اس کی زندگی میں کتنے مریض آچکے ہیں۔ کبھی کسی غلطی سے بدقسمتی سے کوئی مریض مرجاتا ہے لیکن بیشتر مریض شفا پاتے ہیں اور نئی زندگی پاکر ڈاکٹر کو یاد بھی کرتے ہیں اور اسے لمبی عمر کی دعائیں بھی دیتے ہیں۔

ایسے ہی ایک نوجوان لڑکے کا باپ راشد محمود ایک ایجنسی سے تعلق رکھتا تھا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اسلحہ سپلائی کرتا تھا۔ ڈاکٹر کامران نے ایک برس پہلے اس کے جوان بیٹے کی اوپن ہارٹ سرجری کی تھی۔ راشد محمود اس کا احسان مند تھا اور اس کے گرفتار ہونے کے بعد پریشان ہوکر سوچتا رہتا تھا کہ وہ اپنے محسن کے لئے کیا کرسکتا ہے۔

پچھلے دنوں ایجنسی کے باس نے اس سے کہا تھا کہ پیرس کے ایک چرچ کا فادر آیا ہے اور وہ ڈاکٹر کامران کے معاملات میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ معلوم کرو کہ اس کے عزائم کیا ہیں؟

راشد محمود نے رائمہ سے ملاقات کی تھی۔ اسے بتایا تھا کہ اس کے بھائی جان نے اس کے بیٹے کا آپریشن کیا تھا آج اس کا بیٹا ایک خوش حال زندگی گزار رہا ہے۔ اگر کامران صاحب کو جھوٹے الزام سے بچانے کے سلسلے میں اس کی ضرورت ہو تو اپنے محسن کے لئے جان بھی حاضر ہے۔

فادر بنجامن نے رائمہ کو نصیحت کی تھی کہ وہ کسی پر بھروسا نہ کرے لہٰذا اس نے کہا

"تمہاری طرح میرے بھائی جان کی زندگی چاہنے والے بے شمار ہیں۔ نوٹرے ڈیم سے ایک فادر بھی بھائی جان کو دعائیں دینے کے لئے آئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے وہاں کے چرچ کی ایک نن کا بھی کامیاب آپریشن کیا تھا۔"

راشد محمود نے یہ رپورٹ باس تک پہنچا دی۔ باس نے کہا۔ "لیکن یہ بات کھٹک رہی ہے کہ کامران کا ایک ہم شکل ڈاکٹر اس اسپتال میں آنے والا ہے۔ مجھے تو یہ کوئی گہری چال معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہم شکل ڈاکٹر یہاں آئے۔ اس ڈاکٹر کامران کو ختم کردو۔ وہ زندہ رہے گا تو مسٹر کیو کے ذریعے مجھ تک پہنچ جائے گا۔"

راشد محمود نے باس کو یہ پلاننگ بتائی کہ وہ تنہا پولیس افسران کو دھوکا دے کر اس وقت کامران کو ہلاک کرے گا جب اسے اسپتال سے واپس جیل لے جایا جائے گا۔ باس نے حکم دیا۔ "یہ کام تنہا نہ کرو۔ ہماری ایجنسی کے کسی ہوشیار بندے کو ساتھ رکھ لو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی لیکن جس بندے کو ساتھ لے گیا۔ اسے قیدیوں کی گاڑیوں کے پچھلے حصے میں لے جاکر گولی مار دی۔ دوسری گولی سے ڈاکٹر کامران کی ہتھکڑی توڑ کر کہا۔ "آپ فوراً اس لاش کے کپڑے پہن لیں اور قیدی کے کپڑے اسے پہنا دیں' پلیز جلدی کریں۔"

کامران نے پھرتی سے کپڑے تبدیل کئے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ فادر بنجامن نے اسے فرار ہونے کے سلسلے میں جو ہدایات دی تھیں ان کے مطابق یہ سب کچھ ہورہا ہے۔ وہ کپڑے تبدیل کرکے گاڑی کے پچھلے حصے سے باہر آیا۔ راشد محمود اس گاڑی کے نیچے اب اصلی ٹائم بم لگا رہا تھا پھر وہ نیچے سے نکل آیا۔ کامران کے ساتھ دوڑتا ہوا دور کھڑی ہوئی ایک کار میں آکر بیٹھ گیا۔ جب وہ کار اسٹارٹ ہوکر تیزی سے آگے بڑھی تو اس قیدیوں والی گاڑی میں زوردار دھماکا ہوا۔ کامران نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہ جس گاڑی میں لایا گیا تھا اس کے ٹکڑے فضا میں شعلوں کے ساتھ اڑ رہے تھے۔ اس نے راشد محمود کو دیکھ کر پوچھا۔ "فادر بنجامن کہاں ہیں؟"

وہ سمجھ گیا کہ اس فادر کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح منصوبہ بنایا گیا ہوگا۔ اس نے کہا "پہلے ہم اپنی ایک پناہ گاہ میں جائیں گے۔ پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ ویسے آپ نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔"

کامران نے غور سے اسے دیکھا' پھر کہا۔ "تمہاری صورت کچھ جانی پہچانی سی ہے

مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔"

"آپ نے ایک برس پہلے مختار محمود نامی ایک نوجوان کا آپریشن کیا تھا آپ کے پاس بے شمار مریض آتے ہیں اسی لئے یاد نہیں ہے۔"

"میں اپنے مریضوں کو نہیں بھولتا۔ مجھے مختار محمود یاد ہے اور آپ شاید اس کے والد ہیں؟"

"جی ہاں۔ میرا نام راشد محمود ہے۔ آپ نے ڈاکٹر قیوم کے خلاف درست بیان دیا ہے لیکن وہ درست بیان انٹیلی جنس والوں تک پہنچنے نہیں دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس زون میں ہتھیاروں کی تجارت کرنے والی ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت ہے۔ اسی نے آپ کی ساس عاصمہ خاتون کو اور بیرسٹر وقار محمود کو بہت بڑا لالچ دے کر خرید لیا ہے۔ آپ کو ایسے زبردست شکنجے میں پھانسا گیا ہے کہ آپ کبھی جائز طریقوں سے اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکیں گے۔ جہاں کی سیاست ننگی اور ناجائز ہو' وہاں کے پُرامن شہری آپ کی طرح بے گناہ مارے جاتے ہیں۔"

کامران نے سر جھکا لیا۔ سلمیٰ یاد آرہی تھی' جو بے چاری بے گناہ ماری گئی تھی۔

راشد محمود نے ایک جگہ کار روک دی پھر وہ دونوں وہاں سے پیدل جانے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف علاقوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی کوٹھی میں آئے۔ وہ ڈی آئی جی ریاض احمد کی کوٹھی تھی۔ کامران نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا کیونکہ اس نے ڈی آئی جی کے داماد کا بھی اپریشن کیا تھا۔ نصیب بدل رہے تھے اور نیکیاں قدم قدم پر کام آرہی تھیں۔

ریاض احمد نے کامران سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ "پولیس والے اور اسلحے کے تاجر پورے شہر میں آپ کو تلاش کریں گے لیکن مجھ جیسے ڈی آئی جی کی کوٹھی کے احاطے میں قدم بھی نہیں رکھیں گے۔ آپ اپنی بے گناہی ثابت ہونے تک یہاں آرام سے رہیں۔"

کامران نے کہا۔ "میری بہن کو یہ معلوم ہو گا کہ میں قیدیوں کی گاڑی میں مارا گیا ہوں تو وہ رو رو کر جان دے دے گی۔"

ڈی آئی جی نے کہا۔ "فکر نہ کریں' آپ کی بہن کو کسی طرح رازداری سے آپ کے زندہ رہنے کا یقین دلایا جائے گا۔"

اتنی دیر میں کامران نے سمجھ لیا کہ راشد محمود اور ڈی آئی جی کا تعلق فادر بنجامن

سے نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو وہ ضرور کہتے کہ فادر کے ذریعے اس کی بہن رائمہ کو مطمئن کر دیا جائے گا۔

راشد محمود نے پوچھا۔ "کامران صاحب! آپ راستے میں فادر بنجامن کے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے۔"

"ہاں۔ میں نے ان کے چرچ کی ایک نن کا آپریشن کیا تھا وہ اتنے نیک دل انسان ہیں کہ اخبارات میں میرے متعلق پڑھ کر مجھ سے ملاقات کرنے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے دعائیں دیں اور یہ پیش گوئی کہ مجھے قدرت کی طرف سے کوئی مدد ملے گی اور خدا نے چاہا تو میں اپنی بے گناہی ثابت کر سکوں گا۔ اب تو شاید وہ واپس نوٹرے ڈیم چلے گئے ہیں۔"

ڈی آئی جی ریاض احمد نے کہا۔ "ایک بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ آپ کا ایک ہم شکل ڈاکٹر یہاں آرہا ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کل صبح کی ایک فلائٹ سے آرہا ہے۔ آئی جی نے حکم دیا ہے کہ ائرپورٹ سے اس ڈاکٹر کی نگرانی کی جائے۔ کل ائرپورٹ پر پولیس والوں کا سخت پہرا رہے گا۔"

راشد محمود نے کہا۔ "سر! میں نے آپ کے اور اپنے محسن کو آپ تک پہنچا دیا ہے۔ اب میں جا رہا ہوں۔"

"کیا تم مطمئن ہو کہ وہ باس تم پر شبہ نہیں کرے گا؟"

"سر! میں نے پولیس کی ایک گاڑی کو دوسری گاڑی سے بہت .... دور لے جا کر تباہ کیا ہے۔ یہ بات اسے شبہے میں مبتلا کرے گی بہرحال میں اس سے نمٹ لوں گا۔ اور سچ تو یہ ہے سر! اتنی بڑی سیاسی شخصیت کو آپ تمام پولیس والے جانتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتے۔ ایسے شخص سے میں نمٹ لوں گا۔"

وہ سلام کر کے وہاں سے پیدل چلتا ہوا کچھ دور ایک درخت کے سائے میں آیا۔ پھر اسپتال کے فون پر رائمہ کو کال کیا۔ ایک نرس نے کہا۔ "وہ بات نہیں کر سکیں گی۔ ابھی اطلاع ملی ہے کہ ڈاکٹر کامران کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر رائمہ صدمے سے نڈھال ہیں' وہ رو رہی ہیں۔"

راشد نے کہا۔ "آپ ان سے صرف اتنا کہہ دیں کہ میں فادر کا نائب ہوں۔"

اسے انتظار کرنے کے لئے کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آواز آئی۔ "ہیلو۔ میں رائمہ بول

رہی ہوں۔"

"بیٹی! ایک اہم اطلاع ہے۔ پہلے یہ بتاؤ' اس فون کے ساتھ کوئی دوسرا فون کنکٹ ہے؟"

"جی نہیں۔ آپ کی بات کوئی نہیں سنے گا۔"

"تو پھر اپنے چہرے سے خوشی ظاہر نہ ہونے دو۔ تمہارے بھائی جان زندہ ہیں۔"

وہ بے یقینی سے مگر خوشی سے بولی۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"دیکھو تمہارے لہجے سے خوشی ظاہر ہو رہی ہے۔ اگر بھائی کو بے قصور ثابت کرنا چاہتی ہو تو دنیا والوں کے سامنے غمزدہ رہو۔"

"آپ جیسا کہہ رہے ہیں۔ میں ویسا ہی کروں گی۔ اتنا بتا دیں' وہ کہاں ہیں؟"

"جہاں بھی ہیں' تم سے رابطہ کریں گے تو بھید کھل جائے گا۔ تمہارے بھائی جان کی خواہش کے مطابق تمہیں رازدار بنایا جا رہا ہے' اچھا پھر کبھی رابطہ ہو گا۔"

فون بند ہو گیا۔ رائمہ اپنے چہرے کو دوپٹے سے ڈھانپ کر چھپانے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ کمرے کے باہر لوگوں کے سامنے ماتمی صورت بنا کر جانا تھا لیکن بھائی کی سلامتی کی خبر ایسی تھی کہ خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔ پھر اسے ماریہ کا خیال آیا۔ کامران کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی۔ رائمہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے سینے میں سلمٰی بھابی کا جو دل ہے۔ اسے صدمہ پہنچے اور اس کے علاج کے سلسلے میں پھر کوئی پرابلم پیدا ہو جائے۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ماریہ کے کمرے میں آئی۔ وہ رو رہی تھی اور ایک لیڈی ڈاکٹر اسے تسلیاں دے رہی تھی۔ رائمہ نے لیڈی ڈاکٹر سے جانے کے لئے کہا پھر اس کے جانے کے بعد دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ تیزی سے ماریہ کے پاس آئی۔ وہ رائمہ سے لپٹ کر رونے لگی۔ رائمہ نے کہا۔ "آپ دل کو کمزور بنا کر میرے بھائی جان سے محبت نہیں کر سکیں گی۔ کیا یہی محبت ہے کہ میرے بھائی نے آپ کو جو دل دیا ہے۔ اسے آپ صدمات سے نڈھال کر رہی ہیں؟"

وہ روتی ہوئی بولی۔ "وہ دل کا تحفہ دینے والا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ میں اس دل کو لے کر کیا کروں؟"

"کیا تحفہ دینے والا نہ رہے تو تحفے کو بھی خاک میں ملا دیا جاتا ہے۔ یا اس تحفے کی

اور زیادہ قدر کی جاتی اور حفاظت کی جاتی ہے؟"

وہ آنسو پونچھ کر اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ "تم کیسی بہن ہو؟ تمہارے چہرے سے صدمہ ظاہر نہیں ہو رہا ہے۔ کیا تمہیں بھائی کی موت کا افسوس نہیں ہے؟"

"یہی مشکل کام ہے۔ کسی صدمے پر خوشی غالب آ جائے تو پھر لاکھ کوششوں کے باوجود چہرے سے صدمہ ظاہر نہیں ہوتا۔"

ماریہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم پر ایسی کون سی خوشی غالب آ رہی ہے؟"

"آپ بھائی جان کو دل و جان سے چاہتی ہیں۔ ان کے دیئے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کریں کہ میری رازدار رہیں گی۔"

"میں صدمات کے باعث بے حد کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ مجھ سے اپنے بھائی کے سوا اور کوئی بات نہ کرو۔"

"میں صرف بھائی جان کی بات کر رہی ہوں۔ کیا ان کا راز اپنے سینے میں چھپائیں گی؟"

"میرے کامران کا کوئی راز کبھی اس سینے سے باہر نہیں آئے گا۔"

"تو پھر دل کو سنبھالو۔ میرے بھائی جان اور تمہارے مسیحا زندہ ہیں۔"

"کیا؟" اس نے چونک کر حیرانی سے پوچھا۔

رائمہ نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "دیکھیں' میری بھابی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ہے۔ پلیز آپ خود کو سنبھالیں۔"

"میں خود کو سنبھال رہی ہوں۔ میں بالکل نارمل رہوں گی۔ سچ بتاؤ' کیا سچ مچ وہ زندہ ہیں؟"

"ہاں اسی لئے میں صدمہ نہیں کر رہی ہوں حالانکہ ہم دونوں کو کبھی کبھی رونا اور ماتمی صورت بنا کر رہنا چاہئے۔ ابھی کسی کو یہ حقیقت نہ معلوم ہو تو بھائی جان کے لئے بہتر ہو گا۔"

وہ رائمہ کو گلے سے لگا کر بولی۔ "واقعی خوشی غالب آ جائے گا تو آنکھوں میں آنسو لانا مشکل ہوتا ہے۔"

"میں ابھی ڈسپنسری میں جاتی ہوں۔ وہاں سے گلیسرین کی چھوٹی شیشی لا کر دوں گی۔ تم اس کا ایک ایک ننھا سا قطرہ آنکھوں میں لگاؤ گی تو بے اختیار آنسو نکلنے لگیں گے۔

فلموں میں اکثر ماتمی سین گلیسرین کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔"

وہ اٹھ کر کمرے سے گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد آگئی۔ اس کے ہاتھ میں گلیسرین کی ایک شیشی تھی۔ دونوں نے اس میں سے ایک ایک قطرہ لے کر آنکھوں میں لگایا۔ آنکھوں میں ہلکی سی جلن ہوئی پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ دونوں دھاروں آنسو بہاتی ہوئی مسکرانے لگیں۔

ماریہ نے کہا۔ "تمہارے آنے سے پہلے میں سوچ رہی تھی کہ تمہارے بھائی کی ساس کو گولی مار دوں۔ اس کی غلط بیانی کے باعث کامران پر اتنی مصیبتیں آرہی ہیں۔"

"جب کوئی مظلوم بے بسی سے سوچتا ہے تو خیالوں میں ظالم کو گولیاں مارتا رہتا ہے مگر اس طرح بھائی جان پر ہونے والا ظلم ختم نہیں ہوگا۔ کل ڈاکٹر حیات محمد خان آرہے ہیں۔ شاید وہ کوئی ایسی تدبیر کریں کہ میرے بھائی جان کی بے گناہی ثابت ہو جائے۔"

☆------☆------☆

ڈاکٹر کامران کے ہم شکل ڈاکٹر کی آمد کا پولیس والوں کو بھی بے چینی سے انتظار تھا۔ انسپکٹر جنرل آف پولیس کے دفتر میں بڑے بڑے افسران کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ اس میٹنگ میں ایک افسر نے کہا۔ "یہ بڑی سوچی سمجھی پلاننگ ہے۔ آج دوپہر کو ڈاکٹر کامران فرار ہوا ہے۔ اگرچہ یہ کہا جارہا ہے کہ وہ مرچکا ہے۔ اس جیل کی گاڑی اور اس لاش کے ٹکڑے دور تک پائے گئے لیکن .... شواہد بتا رہے ہیں کہ .... جیل کی گاڑی میں مرنے والا کوئی اور تھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود کو مردہ ثابت کر رہا ہے۔ جب اس کا ہم شکل یہاں آئے گا تو وہ دراصل ہم شکل نہیں ہوگا۔ خود ڈاکٹر کامران ہوگا۔"

ایک افسر نے پوچھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ شکاگو سے آرہا ہے اور ڈاکٹر کامران آج شام کو پاکستان سے فرار ہو کر کل صبح کی فلائٹ سے اتنا طویل سفر کر کے کیسے پہنچے گا؟"

انٹیلی جنس کے ایک افسر نے کہا۔ "ہمارے جاسوس ڈاکٹر حیات محمد خان کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر حیات کل ہی ایک فلائٹ سے چل پڑا تھا۔ ابھی دوبئی میں ہے۔ کل دوبئی سے یہاں آئے گا۔"

"پھر تو وہی شبہ ہونا چاہئے کہ ڈاکٹر کامران خفیہ ذرائع سے آج رات دبئی پہنچے گا اور ڈاکٹر حیات محمد خان کا پاسپورٹ اور ویزا لے کر یہاں آئے گا۔"

آئی جی نے کہا۔ "آپ تمام افسران کو کل ایئرپورٹ پر بہت محتاط رہنا ہوگا۔ جو ڈاکٹر حیات آرہا ہے۔ اسے ہر پہلو سے چیک کیا جائے گا۔ ایک بڑی سیاسی شخصیت ہماری کارکردگی دیکھنے کے لئے وہاں موجود رہے گی۔"

راشد محمود نے اپنی ایجنسی کے ایک بندے کو مار کر اسے قیدی کا لباس پہنا دیا تھا۔ ڈاکٹر کامران کو بچا کر لے گیا تھا۔ اور یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایجنسی کا جو بندہ ہلاک ہوا تھا' وہ باس کے پاس زندہ نہیں پہنچے گا تو راشد محمود ایجنسی کا غدار کہلائے گا۔ باس اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے وہ چھپتا پھر رہا تھا۔

☆------☆------☆

دوسری صبح ایئرپورٹ پر پولیس کے علاوہ اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز بھی موجود تھے۔ آنے جانے والے مسافروں کو چیک کیا جارہا تھا۔ راشد محمود بھی ایک اخبار کا جعلی اجازت نامہ لے کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

دبئی سے آنے والے طیارے میں ڈاکٹر حیات محمد خان موجود تھا۔ وہ طیارے سے اتر کر بیگیج ہال سے سامان لے کر نکلا تو پولیس والے اسے گھیر کر ایک کمرے میں لے گئے۔ اسے اچھی طرح چیک کیا۔ اس کی دس انگلیوں کے نشانات دوبارہ لئے گئے۔

اخباری رپورٹروں سے کہا گیا کہ وی آئی پی ہال میں جمع ہو جائیں۔ انہیں پولیس کی تمام احتیاطی کارروائیوں کے متعلق بتایا جائے گا۔ اس وی آئی پی ہال میں وہ سیاسی شخصیت بھی موجود تھی۔ جب پریس کانفرنس شروع ہوئی تو ڈاکٹر حیات محمد خان نے مائیک کے سامنے آکر کہا۔ "مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس ملک کی پولیس بڑی فرض شناس ہے۔ آپ حضرات کو کچھ انتظار کرنا پڑا لیکن اتنی دیر میں فنگر پرنٹس کی رپورٹ آگئی ہے کہ میری تمام انگلیوں کے نشانات ڈاکٹر کامران سے مختلف ہیں۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں پولیس والوں کو زحمت سے بچانے کے لئے اپنا چہرہ بھی ڈاکٹر کامران سے مختلف بنا لیتا مگر افسوس کہ یہ پیدائشی چہرہ ہے۔"

چہرہ بدلنے کی بات پر سب لوگ ہنسنے لگے۔ ڈاکٹر حیات نے کہا۔ "میں نے آج صبح کے اخبار میں پڑھا ہے کہ ڈاکٹر کامران پولیس کسٹڈی سے نکل بھاگا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ درجنوں مریضوں کو نئی زندگیاں دینے والے ڈاکٹر کو بھاگنا نہیں چاہئے۔ قاتل حضرات جان لے کر سزائے موت پاتے ہیں۔ ڈاکٹر کو نئی زندگیاں دینے کے الزام

میں پھانسی پر چڑھ جانا چاہئے۔"

اس کی بات پر پھر اخبارات والے ہنسنے لگے۔ ڈاکٹر حیات نے کہا۔ "میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ ڈاکٹر کامران کے تحریری بیان کے بہت سے حصوں کو چھپایا جارہا ہے۔ اخبارات والوں کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھا جارہا ہے کیونکہ اصل حقیقت سامنے آنے سے اسلحے کی تجارت کرنے والی ایک اہم سیاسی شخصیت کا چہرہ بے نقاب ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ میں نے اخبارات میں پڑھا ہے۔ آپ حضرات اس ملک کے رہنے والے ہیں۔ آپ اخبارات والوں کو اور پولیس والوں کو ضرور اس شخصیت سے واقف ہونا چاہئے۔"

وہ شخصیت وہاں موجود تھی اور زیرلب مسکرا رہی تھی۔ کیونکہ اس کی اصلیت جاننے کے باوجود کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس سیاسی لیڈر نے کہا۔ "ہمارے ملک میں آنے والے نئے ڈاکٹر حیات محمد خان نے درست کہا ہے کہ مجرم خواہ کتنا ہی بااختیار ہو۔ اسے بے نقاب کرکے اسے قرار واقعی سزا دینی چاہئے۔ ہمارے ملک میں اسلحے کی بھرمار ہورہی ہے۔ میں عوام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ قانون کے محافظوں سے تعاون کریں اور مجرموں کی نشاندہی کریں۔ ہم انہیں تحفظ فراہم کریں گے۔"

راشد محمود اخباری رپورٹرز کے درمیان سے چلتا ہوا آکر سیاسی لیڈر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ان کے درمیان ایک بڑی سی میز تھی۔ باڈی گارڈ نے کہا۔ "جو کہنا ہے۔ ذرا دور جاکر کہو۔"

راشد محمود نے ریوالور نکال کر اس سیاسی لیڈر کو نشانے پر رکھتے ہوئے باڈی گارڈ سے کہا۔ "تم مجھے گولی مارو گے، میں اسے مار ڈالوں گا۔"

ہال میں کھلبلی سی مچ گئی۔ سب لوگ کچھ نہ کچھ زیرلب کہنے لگے۔ وہ چیخ کر بولا۔ "آپ حضرات خاموش ہوجائیں۔ ابھی اس لیڈر نے کہا تھا کہ مجرموں کو بے نقاب کیا جائے۔ میں تمام اخبارات والوں کے سامنے اسے بے نقاب کررہا ہوں۔ اسلحے کی تجارت کرنے والا باس میرے نشانے پر ہے۔ میں اس کا کارندہ ہوں۔ ڈاکٹر کامران نے اسپتال کے ڈاکٹر قیوم کو بیسمنٹ میں اسلحہ چھپاتے دیکھ لیا تھا۔ اس لئے اس کی بیوی سلمیٰ کو گولی ماردی گئی اور اس قتل کے الزام میں ڈاکٹر کامران کو پھانس لیا گیا۔ اس مکار لیڈر نے راز فاش ہونے کے اندیشے سے ڈاکٹر قیوم کو بھی ہلاک کرادیا اور مجھ سے کہا تھا کہ جب ڈاکٹر

کامران کو اسپتال سے جیل لے جایا جائے تو میں اس ڈاکٹر کو بھی قتل کردوں۔ ہم میں سے کسی کے پاس اس لیڈر کے خلاف ثبوت نہیں ہے۔ ایسی شخصیتوں کے سامنے پولیس والے بھی مجبور ہوجاتے ہیں لیکن میں مجبور نہیں ہوں اور میری طرح عوام بھی مجبور نہیں ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو سچا پاکستانی کہتا ہوں، جو کرپٹ لیڈر کو پہچان لیتے ہیں اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ عدالت بھی انہیں سزا نہیں دے سکے گی تو پھر ہمارا آپ کا فرض ہے کہ اسے سزا دیں۔ لہٰذا میں اس فرض کی ابتدا کررہا ہوں۔ میں مرجاؤں تو میرے بعد آپ حضرات اس عوامی عدالت کو قائم رکھیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے لیڈر کو گولی ماردی۔ دوسری طرف سے باڈی گارڈ نے راشد محمود کو گولی ماردی۔ اس کے ساتھ ہی چند لمحوں کے لئے خاموشی چھاگئی پھر ڈاکٹر حیات نے تالی بجائی۔ اس کی تالیوں سے سناٹا مجروح ہوا تو اس کے ساتھ تمام رپورٹرز اور فوٹو گرافر تالیاں بجانے لگے اور تصاویر اتارنے لگے۔

ایسا کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ فوراً ہی شام کو شائع ہونے والے اخبارات پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔ ان پر الزام عائد کیا گیا کہ یہ اخبارات جھوٹی سنسنی خیز خبریں شائع کرتے ہیں۔ ایک دہشت گرد نے ایک محب وطن لیڈر کو گولی ماردی تھی اور اخبارات اس دہشت گرد کو ہیرو بنا کر پیش کررہے ہیں۔

ڈاکٹر حیات نے اسپتال کے بڑے عہدے داروں کے ساتھ ایک بڑی سی وین میں جاتے ہوئے کہا۔ "یہاں بڑے کمال کے سیاست داں ہیں۔ بڑی چالاکی سے ہیرو کو زیرو اور ملک دشمن شخص کو محب وطن بنا دیتے ہیں۔ ہم سب کا فرض ہے کہ عدالت سے انصاف نہ ملے اور قانون کمزور پڑ جائے تو ہم راشد محمود کی طرح خود قانون اور خود عدالت بن جائیں۔ میں نے یہاں آتے ہی سمجھ لیا ہے کہ ڈاکٹر کامران بے قصور ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے بے گناہ ثابت کریں۔"

اسپتال کی انتظامیہ کے سیکریٹری نے کہا۔ "اسلحہ فروشوں کا سب سے بڑا سرغنہ مرچکا ہے۔ ڈاکٹر کامران کی راہ میں اب کوئی بڑا پتھر نہیں رہے گا۔"

"یہ خوش فہمی ہے۔ شیطان اپنی موت سے پہلے دوسرا شیطان رکھ چھوڑتا ہے۔ اسی لئے صاف ستھری تہذیب کے ساتھ شیطانیت قیامت تک رہے گی۔ منشیات کا فروغ اور اسلحے کی سپلائی ختم نہیں ہوگی۔ انہیں ختم کرنے اور جڑ سے اکھاڑ پھینکنے والی بڑی بڑی

ہستیاں ہی اس تجارت کو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری رکھتی ہیں۔ وہ سیاسی لیڈر مرچکا ہے۔ اس کی جگہ کوئی دوسری بہت بڑی شخصیت آجائے گی۔"

اسپتال پہنچنے پر ڈاکٹر حیات کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ سب لوگ اسے ایسی محبت اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے جیسے اپنے محبوب ڈاکٹر کامران کو دیکھ رہے ہوں۔ وہاں سب کے ساتھ کھانے پینے کا اہتمام تھا۔ رائمہ ڈاکٹر حیات کے ساتھ ساتھ رہی۔ اس نے ماریہ سے اس کا تعارف کرایا۔ کامران کے ہم شکل کو دیکھ کر ماریہ کو بھی یوں لگا جیسے وہ اپنے محبوب کو دیکھ رہی ہو۔ اس کے بند کمرے میں ڈاکٹر حیات نے کہا۔ "رائمہ! فادر بنجامن سے تمہاری جو باتیں ہوئی ہیں' فادر نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہاں آتے ہی ایئرپورٹ پر ایک کانٹا صاف ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر کامران کے خلاف دوسرا سخت بیان اس کی ساس عاصمہ خاتون کا ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سلمٰی بھابی کے ہلاک ہوتے ہی اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھے بغیر بھائی جان کے خلاف کیوں ہوگئی ہیں؟"

ماریہ نے کہا۔ "بس اتنا ہی سمجھ میں آتا ہے کہ اسلحہ سپلائی کرنے والی ایجنسی کے باس نے عاصمہ خاتون کو اور میرے بیرسٹر وقار احمد کو بھاری قیمت پر خرید لیا ہے۔"

ڈاکٹر حیات نے کہا۔ "یہ تو عاصمہ ہی بتا سکتی ہے کہ اس نے اپنے داماد کامران کے خلاف بیان کیوں دیا ہے؟"

رائمہ نے کہا۔"وہ کبھی نہیں بتائے گی۔ وہ بہت ہی چالاک ہے۔"

"مجھے بھی اپنے متعلق شبہ ہے کہ میں چالاک ہوں۔ جیسا کہ تم جانتی ہو' میں ڈاکٹری کی اے بی سی سے بھی واقف نہیں ہوں لیکن چالاکی سے ڈاکٹر بن گیا۔ اب تم بہن کی حیثیت سے اور ایک اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر کی حیثیت سے قدم قدم پر میری رہنمائی کرو گی۔ اس سے پہلے کہ میرا فراڈ کھل جائے' ہمیں ایک اہم کام کر گزرنا چاہئے۔"

رائمہ نے پوچھا۔ "کون سا کام؟ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "یہاں ایسی کوئی دوا تو ہوگی جس کے استعمال کرنے سے دل پر منفی اثر پڑتا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ ایسی دوا بھی ہے اور انجکشن بھی۔"

"پھر تو کام بن جائے گا۔ عاصمہ خاتون یہاں اسپتال کی چھوٹی سی تقریب میں آئی ہوئی ہے۔ تم کسی کھانے پینے کی چیز میں ایسی ایک دوا ملا کر اس کے حلق سے اتار دو۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ رائمہ نے آگے بڑھ کر اسے کھولا۔ ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "ڈاکٹر حیات' باہر مہمان آپ سے ملنے کے متمنی ہیں۔ آپ نے یہاں آتے ہی مریضوں کی مزاج پرسی شروع کردی۔"

حیات محمد خان نے کہا۔ "مس ماریہ کا ڈاکٹر کامران سے خاص تعلق ہے۔ اس لئے میں ملنے چلا آیا' آیئے۔"

وہ ڈاکٹر کے ساتھ چلا گیا۔ اسپتال کے احاطے میں کھانے پینے کے لئے میزیں لگائی گئی تھیں۔ پرہیزی کھانے والے مریضوں کے لئے بھی الگ انتظام کیا گیا تھا۔ پولیس کے چند اہم افسران اور سپاہی بھی تھے۔ عاصمہ نے اس کے قریب آکر کہا۔ "ڈاکٹر! میں کبھی دور سے اور کبھی قریب سے تمہیں دیکھ رہی ہوں اور حیران ہو رہی ہوں کہ قدرت نے آپ کو بالکل میرے داماد جیسا بنایا ہے۔"

وہ بولا۔ "ابھی تو آپ کچھ نہیں دیکھ رہی ہیں۔ کسی دن کسی مریض کی ہارٹ سرجری کروں گا تو آپ مجھے مکمل طور پر اپنا داماد تسلیم کرلیں گی۔"

پھر وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "مگر افسوس' اب تو آپ کے پاس کوئی بیٹی نہیں رہی۔ میں کامران کی طرح بڑا ڈاکٹر خود کو ثابت کرسکتا ہوں مگر داماد نہیں بن سکتا۔"

عاصمہ ہنسنے لگی پھر اچانک سنجیدہ ہو کر بولی۔ "میری ایک ہی بیٹی تھی میں نے اس کے قتل کے سلسلے میں سچا بیان دیا تو کامران مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگا تھا۔"

"آپ سچی ہیں اور سچی باتیں کڑوی لگتی ہیں۔ وہ جو اس کی بہن رائمہ ہے' وہ خواہ مخواہ مجھ سے ایسے لگی رہی جیسے میں اس کا سگا بھائی ہوں۔"

دور کھڑے ہوئے آئی جی نے ڈی آئی جی ریاض احمد سے کہا۔ "وہ دیکھو ڈاکٹر حیات اور عاصمہ خاتون ایک دوسرے سے کس طرح گھل مل کر باتیں کر رہے ہیں۔ بالکل سچ مچ کے ساس اور داماد لگ رہے ہیں۔"

ڈی آئی جی ریاض احمد نے کہا۔ "جی ہاں اگرچہ فنگر پرنٹس کے ذریعے یہ ڈاکٹر کامران سے مختلف ہے پھر بھی دل کہتا ہے کہ کوئی چال چلی جا رہی ہے۔ سر! اگر آپ مشورہ دیں تو میں ڈاکٹر حیات سے دوستی بڑھاؤں اور کل اسے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دوں۔ چند روز تک ملاقاتیں رہیں گی تو میں کچھ سمجھ پاؤں گا۔"

"ضرور۔ یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ اس ڈاکٹر حیات سے کسی طرح بے تکلف ہو جاؤ۔ ایک ہم شکل کا غائب ہونا اور دوسرے کا نمودار ہونا عجیب سی بات ہے۔ یہ بات حلق سے نہیں اتر رہی ہے۔"

تمام مہمان مختلف میزوں کے اطراف کھا پی رہے تھے اور آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ ان میں اسپتال کے عملے کے علاوہ مریض وغیرہ بھی تھے۔ ایسے ہی وقت عاصمہ خاتون کھانا چھوڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک نرس نے فوراً ہی اس کھانے کی جھوٹی پلیٹ اٹھا کر دوسری جھوٹی پلیٹ رکھ دی اور پہلی پلیٹ اٹھا کر لے گئی۔ کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ اس وقت دو چار مہمان عاصمہ کی طرف متوجہ تھے۔ ایک نے پوچھا۔ "میڈم! آپ کچھ پریشان ہیں؟"

"جی ہاں۔ پلیز کسی ڈاکٹر کو بلائیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ایسا پہلی بار ہوا ہے؟"

"جی ہاں۔ مجھے بلڈ پریشر رہتا ہے۔ ایسے میں دل بھی گھبراتا ہے۔ مجھے ایسا مرغن کھانا نہیں کھانا چاہئے تھا۔ بلکہ پانی بھی نہیں پینا چاہئے تھا۔ میرے داماد کی بہن لیڈی ڈاکٹر رائمہ میری دشمن ہے۔"

وہاں کچھ لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔ "پلیز آپ کسی بھی ڈاکٹر پر شبہ نہ کریں۔ آپ وہی کھا رہی تھیں جو سب کھا رہے ہیں۔ آپ کی پلیٹ کہاں ہے؟"

عاصمہ نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "وہ سامنے رکھی ہوئی ہے۔"

وہاں آئی جی پہنچا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "ڈاکٹر! میں چاہوں گا کہ ابھی میرے ایک افسر کی موجودگی میں اس پلیٹ کے کھانے کو لیبارٹری میں چیک کیا جائے۔"

آئی جی کے حکم کی تعمیل ہونے لگی۔ عاصمہ کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ اسے اسپتال کے ایک کمرے میں لٹایا گیا۔ ایک سینئر لیڈی ڈاکٹر اسے چیک کرنے لگی۔ اس نے اس کے لئے دوائیں تجویز کیں۔ ایک انجکشن اسے لگایا گیا۔ دو چار گولیاں کھلائی گئیں پھر لیڈی ڈاکٹر نے نرس کو جانے کے لئے کہا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کر کے عاصمہ کے قریب آئی۔ پھر بولی۔ "میڈم! آپ کی عمر کیا ہے؟"

"ابھی چالیس برس پورے نہیں ہوئے ہیں۔ دراصل میری شادی چودہ برس کی عمر

میں ہو گئی تھی۔ سولہ برس کی عمر میں سلمٰی کو جنم دیا تھا۔ میں اپنی صحت کا ایسا خیال رکھتی ہوں کہ صحیح عمر کا پتا ہی نہیں چلتا۔ کتنی ہی تقریبات میں عورتیں یہ سمجھتی تھیں کہ میں سلمٰی کی بڑی بہن ہوں۔ مرد حضرات تو کبھی یقین ہی نہیں کرتے تھے کہ میں سلمٰی کی ماں ہوں۔ آہ! میری بچی کو کس بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔"

"میں نے ایک چھوٹی سی بات پوچھی اور آپ نے اتنا لمبا جواب دے دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ چالیس برس کی نہیں ہوئی ہیں۔ کیا آپ نے دوسری شادی کی ہے؟"

"نہیں! مجھے سلمٰی سے اور اپنے مرحوم شوہر سے اتنی محبت تھی کہ میں نے اپنے لئے کتنے ہی رشتوں کو ٹھکرا دیا۔"

"دیکھیں میڈم! میں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا ہے۔ تاکہ ہماری گفتگو کوئی نہ سن سکے اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ آپ ماں بننے والی ہیں۔"

عاصمہ نے ایک دم سے چونک کر اور گھبرا کر اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ "دائی سے پیٹ نہیں چھپتا' آپ پریشان نہ ہوں۔ میں دو نمبر کا کام بھی رازداری سے کرتی ہوں۔"

عاصمہ نے فوراً لیڈی ڈاکٹر کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ میں ایک دائی سے معاملہ طے کر چکی تھی۔ کیا میں آپ پر بھروسا کروں؟"

"آپ خوش قسمت ہیں کہ میں آپ کو اس کمرے میں لے آئی اگر لیڈی ڈاکٹر رائمہ آپ کو چیک کرتی تو ابھی اپنے بھائی کا انتقام لینا شروع کر دیتی۔"

"آپ درست کہہ رہی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ میری کوٹھی میں آ کر اس بدنامی کو مٹا دیں۔"

"ضرور ہو سکتا ہے لیکن آپ کا دل ابھی بہت کمزور ہے۔ ایسی حالت میں بدنامی کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہو گا۔"

"آپ مجھے دل کی توانائی کے لئے کوئی ٹانک وغیرہ لکھ دیں۔"

"صرف ٹانک سے بات نہیں بنے گی۔ آپ کو بلڈ پریشر بھی ہے اور دل بھی کمزور ہے۔ آپ کے مختلف ٹیسٹ لئے جائیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر بستر پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "میں کسی دوسرے اسپتال میں تمام ٹیسٹ کراؤں گی۔ یہاں آپ ڈیوٹی پر نہیں رہیں گی تو میری وہ دشمن رائمہ ٹریٹمنٹ کے لئے آئے گی۔"

"آپ کچھ بدحواس ہوگئی ہیں۔ کیا دوسرے اسپتال میں ٹیسٹ کے دوران دوسرے ڈاکٹروں کو معلوم نہیں ہوگا کہ آپ حمل کے ایڈوانس اسٹیج میں ہیں۔ یہاں میرا ایک ساتھی ڈاکٹر ہے' جو رائمہ اور کامران کا ہمیشہ سے مخالف رہا ہے۔ میرے اور اس ڈاکٹر کے سوا کوئی آپ کا ٹریٹمنٹ نہیں کرے گا۔ آپ اسپتال کی انتظامیہ کو یہ لکھ کر دے دیں کہ آپ کی بیٹی کے قاتل کامران کا مقدمہ عدالت میں ہے' اس کی بہن لیڈی ڈاکٹر رائمہ آپ سے عداوت رکھتی ہے لہذا آپ صرف مجھ سے اور ڈاکٹر انعام الحق سے علاج کرائیں گی۔ ورنہ دوسرے اسپتال چلی جائیں گی۔ میں آپ کی یہ تحریری درخواست منظور کرا لوں گی۔"

عاصمہ نے پھر ایک بار اس کا ہاتھ عقیدت سے پکڑ کر کہا۔ "آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا۔ صرف بدنامی مٹانے کی بات ہوتی تو کسی بھی وقت یہ معاملہ ختم کر دیتی۔ مگر بلڈ پریشر اور دل کی کمزوری کا تقاضا ہے کہ مجھے کسی نہ کسی اسپتال میں انڈر ٹریٹمنٹ رہنا ہوگا۔ میں آپ کو بہن سمجھ کر بھروسا کرتی ہوں اور اس کے عوض آپ کو منہ مانگا معاوضہ دوں گی۔"

"یہی عورت کی کمزوری ہے۔ آپ کیوں معاوضہ دیں گی۔ اس جرم کی سزا مرد کو ملنی چاہیے۔ یہ مرد عیاشی کرتے ہیں اور عورتوں کو ایسی مصیبتوں میں ڈال کر الگ ہو جاتے ہیں۔ جس نے آپ کو مصیبت میں ڈالا ہے اس سے میں ایسا زبردست معاوضہ لوں گی کہ اس کے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"ہم آپ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ اگر رہتا بھی تو یہ الزام اسے دینے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ مجھے قتل کرا دیتا۔ اچھا ہوا کہ اس کے ہی کارندے نے اسے قتل کر دیا۔"

"کیا آپ اس سیاسی لیڈر کی بات کر رہی ہیں جو آج پریس کانفرنس میں قتل کیا گیا ہے؟"

"ہاں اس نے مجھے یہ مصیبت تو دی ہے لیکن کروڑوں روپے حاصل کرنے کی تدبیر بھی بتا گیا ہے۔ میں وقار احمد بیرسٹر کے ذریعے اس تدبیر پر عمل کروں گی۔"

وہ ایسا کہتے ہوئے کراہنے لگی اور کہنے لگی۔ "میرے دل میں ہلکا ہلکا سا درد ہو رہا ہے۔"

"ذرا حوصلہ کرو۔ میں ڈاکٹر انعام الحق کو بلا کر لاتی ہوں۔ تمہارے دل کا ایکسرے لیا جائے گا۔ جب تمہاری طبیعت سنبھل جائے تو تم لیڈی ڈاکٹر رائمہ کے خلاف ایک درخواست لکھ دینا۔ اس طرح کبھی میں اور کبھی ڈاکٹر انعام الحق تمہیں اٹینڈ کرتے رہیں گے۔"

ان دونوں کے درمیان سمجھوتا بھی ہوگیا اور دوستی بھی ہوگئی۔ وہ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر انعام الحق کو لے کر آئی۔ اس نے بھی اس کا معائنہ کیا پھر کسی دوا کے چند قطرے پانی میں ملا کر دیئے۔ اسے پانچ منٹ کے بعد ہی آرام آگیا۔ وہ مطمئن ہو کر بولی۔ "آپ باکمال ڈاکٹر ہیں۔ اب میں بہت سکون محسوس کر رہی ہوں۔"

اس نے کہا۔ "اس اسپتال کے دوسرے مریض بھی میری تعریفیں کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر کامران نے اسپتال کی انتظامیہ کو اس طرح مٹھی میں رکھا ہے کہ کبھی مجھے سینئر ڈاکٹر بننے نہیں دیا۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "میں نے ڈاکٹر کو تمہارے مختصر حالات بتا دیئے ہیں۔ ان کا بھی یہی مشورہ ہے کہ تم رائمہ کے خلاف درخواست لکھو۔ ہم اسے منظور کرا لیں گے۔ اس کے بعد رائمہ اور ڈاکٹر کامران کے خاص اسسٹنٹ ڈاکٹر کبھی تمہارے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھیں گے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا۔ کھلے ہوئے دروازے پر رائمہ اور ڈاکٹر حیات کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اندر آتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "میڈم کی طبیعت کیسی ہے؟"

"یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ ویسے ڈاکٹر رائمہ آپ میڈم کو اٹینڈ کرنے نہ آئیں تو بہتر ہوگا۔ آپ کے بھائی کا کیس عدالت میں ہے اور میڈم نے ان کے خلاف بیان دیا ہے۔ ان حالات میں آپ سمجھ دار ہیں' کیا آگے مجھے کچھ کہنا چاہیے۔"

رائمہ نے کہا۔ "میں انسانی ہمدردی کے تحت آئی تھی۔ آپ کی باتیں سمجھ لینے کے بعد نہیں آؤں گی۔"

ڈاکٹر حیات نے کہا۔ "بات معقول ہے۔ مگر میرے متعلق کیا خیال ہے' میں آپ کی بیٹی کے قاتل کا ہم شکل ہوں؟"

عاصمہ نے کہا۔ "میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گی لیکن آپ کی صورت دیکھ کر

خواہ مخواہ اندیشے پیدا ہوتے رہیں گے۔"

"آپ درست کہتی ہیں۔ میں اپنی صورت کے باعث آپ کے لئے نفسیاتی مسئلہ بن جاؤں گا۔ اور اس اسپتال میں آتے ہی میں کسی بھی مریض کے لئے مسئلہ بننا نہیں چاہوں گا" چلو رائمہ۔"

وہ دونوں پلٹ کر چلے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ اچھا ہوا کہ ہم نے ان کے منہ پر صاف صاف کہہ دیا۔ اس کے باوجود آپ یہاں کی انتظامیہ کو لکھ دیں کہ صرف ہم دونوں سے اپنا علاج کرائیں گی۔"

☆------☆------☆

دو دنوں کے بعد عدالت میں پیشی تھی۔ جس کے خلاف مقدمہ تھا' وہ مفرور تھا۔ صرف اس کی بہن رائمہ اپنے بھائی کے وکیل کے ساتھ آئی تھی۔ بیرسٹر وقار احمد بھی موجود تھا اس نے کہا۔ "یہ ایک اتفاق ہے کہ میری مؤکلہ بھی غیر حاضر ہے۔ وہ اسپتال میں زیر علاج ہے۔ قاتل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جیل کی گاڑی میں ہونے والے دھماکے میں ہلاک ہو گیا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مفرور ہے۔ زندہ ہے اور زندہ رہ کر قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ ان حالات میں' میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ مزید تاریخیں دے کر مقدمے کو خواہ مخواہ طول نہ دیا جائے۔ اگر اسلامی قانون کے مطابق قاتل یا اس کے عزیز' مقتول کے ورثا کو خوں بہا ادا کرنے کے لئے تیار ہوں تو یہ کیس آئندہ پیشی پر ختم ہو سکتا ہے۔"

جج نے کہا۔ "بات معقول ہے۔ قاتل زندہ ہے یا مُردہ اس کے متعلق تحقیقات ہو رہی ہیں۔ اور پتا نہیں کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا اگر قاتل کے عزیز خوں بہا دینے کے لئے راضی ہوں اور مقتول کے ورثہ خون بہا لینے پر آمادہ ہوں تو وہ آپس میں سمجھوتا کر لیں اور آئندہ پیشی پر راضی نامہ پیش کر دیں۔"

رائمہ اور اس کے وکیل نے بھی آپس میں مشورہ کیا پھر بات آئندہ پیشی پر ٹل گئی۔ دوسرے دن بیرسٹر وقار احمد' ماریہ کے پاس آیا اور کہا۔ "مس رائمہ نے تمہیں بتایا ہو گا کہ تمہارے محبوب کی سزا معاف ہو سکتی ہے؟"

ماریہ نے کہا۔ "ہاں اسی لئے میں نے تمہیں کمرے میں آنے کی اجازت دی ہے۔ تم نے پہلے دشمنی کی لیکن اب کامران کو سزا سے بچانے کا راستہ نکال کر احسان کر رہے

ہو۔ کیا عاصمہ خاتون خوں بہا لینے پر آمادہ ہے؟"

"جی ہاں' لیکن ڈاکٹر کامران اتنا رئیس نہیں ہے کہ عاصمہ خاتون کا مطالبہ پورا کر سکے۔"

"جب تک میں زندہ ہوں' تب تک کبھی میرے سامنے کامران کو کم حیثیت کا شخص نہ سمجھنا۔ مجھے بتاؤ عاصمہ خاتون کا مطالبہ کیا ہے؟"

"تین کروڑ روپے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر کامران خوددار ہے' وہ تمہاری طرف سے دی ہوئی رقم پر اعتراض کرے گا۔"

"میں اور رائمہ کامران کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"اسے راضی نہ کرو تو بہتر ہے۔ بلکہ اسے پتا ہی نہ چلے کہ تم نے مطلوبہ رقم ادا کی ہے۔"

"یہ بات کامران سے کیسے چھپائی جائے گی؟"

"بہت آسان طریقہ ہے۔ عاصمہ خاتون عدالت میں خون بہا کے طور پر صرف ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کرے گی۔ باقی تین کروڑ روپے تم خفیہ طور سے دو گی۔ اس کی خبر نہ عدالت کو ہو گی اور نہ ہی رائمہ اور کامران کو۔"

وہ چند لمحوں تک سوچتی رہی پھر بولی۔ "تم ایک بار مجھے زبردست دھوکا دے چکے ہو۔ اب کیسے بھروسا کروں کہ تین کروڑ روپے لینے کے بعد عاصمہ خاتون سے خوں بہا کے لئے راضی نامہ لکھواؤ گے؟"

"میرے پاس کورٹ پیپر ہے۔ عاصمہ خاتون یہاں پندرہ نمبر کمرے میں ہے۔ وہ ابھی لکھ دے گی کہ ایک لاکھ روپے کے عوض وہ اپنی بیٹی کا خون معاف کر رہی ہے۔"

"میں ایک لاکھ کی نہیں تین کروڑ روپے کی بات کر رہی ہوں۔ کیا تم مجھے اتنا نادان سمجھتے ہو کہ کسی رسید یا تحریر کے بغیر تین کروڑ روپے دے دوں گی؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ "تین کروڑ روپے کی رسید لکھوا کر کیا کرو گی۔ کامران کو معلوم ہو گا تو وہ تم سے ناراض ہو گا۔ اپنی توہین سمجھے گا۔"

"وہ کچھ بھی سمجھے۔ میرے متعلق جو بھی رائے قائم کرے۔ میں اتنی بڑی رقم اسی

شرط پر دوں گی کہ تم اور عاصمہ خاتون پکے کاغذ پر صاف لفظوں میں لکھو گے کہ ایک ماں نے تین کروڑ روپے لے کر بیٹی کا خون معاف کیا ہے لیکن اس تین کروڑ کا ذکر عدالت میں نہیں کیا جائے گا۔ صرف ایک لاکھ روپے والا راضی نامہ عدالت میں پیش کیا جائے گا۔"

ماریہ نے اپنی اٹیچی سے ایک چیک بک نکال کر تین کروڑ روپے کی رقم لکھی پھر اس پر دستخط کرنے کے بعد کہا۔ "یہ چیک نمبر نوٹ کر لو اور عاصمہ کو یہاں بلا کر میرے سامنے پکا کاغذ لکھواؤ۔"

وہ اس چیک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اتنی بڑی رقم اس نے خواب میں دیکھی ہو گی۔ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی عاصمہ خاتون کو بلا کر لا رہا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ تین کروڑ ایک لاکھ روپے حاصل کرنے کا معاملہ تھا۔ اس نیک کام میں دیر نہیں لگی۔ عاصمہ خاتون نے ایک کاغذ تین کروڑ کا اور دوسرا کاغذ ایک لاکھ روپے کا لکھ دیا۔ بیرسٹر وقار احمد نے ایک لاکھ روپے والا راضی نامہ اپنے پاس رکھ لیا کیونکہ آئندہ پیشی پر اسے عدالت میں پیش کر کے اس مقدمے کو ختم کرنا تھا۔ اور ان دونوں میں رازداری سے یہ طے پایا تھا کہ بیرسٹر وقار احمد پچاس لاکھ لے گا اور عاصمہ خاتون دو کروڑ اکاون لاکھ روپے حاصل کرے گی۔ اس قتل ہونے والے سیاسی لیڈر نے عاصمہ کو کروڑوں روپے حاصل کرنے کی یہی تدبیر بتائی تھی۔

ڈاکٹر حیات محمد خان نے کمرے میں آ کر کہا۔ "بڑے پکے پکے کاغذات لکھے جا رہے ہیں۔ کیا راضی نامہ ہو رہا ہے؟"

وقار احمد نے کہا۔ "جی ہاں۔ آئندہ پیشی کے بعد مقدمہ بازی کی جھنجھٹ ختم ہو جائے گی لیکن آپ یہاں کیسے؟ ہم نے تو سنا ہے کہ تبدیلی قلب کا آپریشن ہو رہا ہے۔"

"جی ہاں۔ ہو رہا ہے۔ بس اب ختم ہونے والا ہے۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔ اگر آپریشن ہو رہا ہے تو آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟"

"بھئی میں کیا کروں گا۔ ایسے پیچیدہ آپریشن تو ڈاکٹر کامران کرتے ہیں اس لئے وہی کر رہے ہیں۔"

"کیا؟" عاصمہ نے چونک کر پوچھا۔ "کیا آپریشن تھیٹر میں کامران ہے؟"

"ہاں' یہ حیرانی کی بات ہے۔ وہ زندہ ہو کر آ گئے ہیں اور اب اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔"

بیرسٹر وقار احمد نے پہلے تو پریشان ہو کر سوچا پھر مسکرا کر بولا۔ "چلو اچھا ہے۔ یہ راضی نامہ لکھنے کے بعد سمجھو کہ تمہارا کیس ختم ہو چکا ہے۔"

"میرا نہیں' ڈاکٹر کامران کا کیس ختم ہو چکا ہے۔"

"او' ہاں۔ آپ کی شکل دیکھ کر پہچاننے میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔"

ڈاکٹر کامران نے دروازے پر آ کر پوچھا۔ "اب تو گڑبڑ نہیں ہو گی۔ میں آپریشن تھیٹر سے نکل کر آ رہا ہوں۔ میرے لباس پر خون کے چھینٹے ہیں لیکن کوئی مجھے قاتل نہیں کہے گا۔ میں انسانی لہو سے کھیل کر بھی انسانوں کو زندگیاں دیتا ہوں۔ اور یہ میرا ہم شکل زیرو مسیحا ہے۔ مگر میرے لئے ہیرو مسیحا ہے۔ یہ ڈاکٹر نہیں ہے۔ سرجن بھی نہیں ہے لیکن اس نے مجھ جیسے ایک مسیحا کی جان بچائی ہے۔ یہ بہت کچھ کرنے آیا تھا مگر اس کی پہلی چال نے ہی میرے دشمنوں کو بے نقاب کر دیا۔ رائمہ نے اس کے مشورے پر میڈم عاصمہ صاحبہ کو اعصابی کمزوری کی دوا کھلائی تو بھید کھل گیا کہ میری ساس کا چال چلن کیسا ہے؟ کیا یہ میرے لئے شرم کی بات نہیں ہے؟"

کامران اور رائمہ کے ساتھ وہ لیڈی ڈاکٹر اور ڈاکٹر انعام الحق اور اسپتال کے دوسرے ڈاکٹر اور انتظامیہ کے عہدے دار کمرے کے اندر اور باہر کھڑے تھے۔ ڈاکٹر انعام الحق نے کہا۔ "ڈاکٹر کامران جیسے مسیحا کا یہاں ایک ہی مخالف ڈاکٹر قیوم تھا جو مارا گیا۔ میڈم عاصمہ! تمہاری تمام میڈیکل رپورٹس اور مختلف ٹیسٹ کے نتائج ہمارے پاس ہیں۔ ہم نے مختلف اوقات میں تمہاری گفتگو بھی ریکارڈ کر لی ہے۔"

ماریہ نے کہا۔ "اور میں نے تین کروڑ ایک لاکھ کے راضی نامے میں جو لکھا ہے اس پر میرے علاوہ عاصمہ خاتون اور اس بیرسٹر کے دستخط بھی ہیں۔ یہ چیک بھی موجود ہے۔ خوں بہا لینے کے بہانے جس طرح کامران کے خلاف شکنجہ تیار کیا گیا تھا۔ اس شکنجے میں یہ دونوں خود پھنس گئے ہیں۔"

انتظامیہ کے چیئرمین نے کہا۔ "ہم ابھی تم دونوں کو پولیس کے حوالے کرنے والے تھے لیکن ڈاکٹر کامران نے منع کر دیا ہے۔"

عاصمہ اور بیرسٹر نے سر اٹھا کر کامران کو دیکھا۔ کامران نے کہا۔ "مجھ سے میری سلمیٰ

کہہ رہی ہے کہ میں اس کی ماں کی عزت رکھ لوں' اس بدنامی کو اسپتال سے باہر نہ جانے دوں۔"

پھر وہ ماریہ سے بولا۔ "ماریہ! اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سنو' کیا سلمٰی کے دل کی دھڑکنیں یہی کہہ رہی ہیں؟"

ماریہ نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ دھک دھک کی آوازیں سنیں پھر کہا۔ "ہاں یہ دل کہہ رہا ہے کہ عاصمہ خاتون صرف تمہاری ساس ہی نہیں' میری ماں بھی ہے۔ میری اور سلمٰی کی ماں اور دو بیٹیوں کی ماں کو ہر حال میں بدنامی سے بچانا چاہئے۔"

ڈاکٹر کامران نے کہا۔ "ہم آئندہ پیشی پر خوں بہا کے طور پر راضی نامہ کرلیں گے۔ کہنے والے زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ میں قاتل ہوں اور میں نے خوں بہا کی رقم ادا کرکے اپنی جان بچائی ہے۔ اس جان بچانے کے پیچھے میں اپنی سلمٰی کو پیدا کرنے والی کی عزت بچاؤں گا۔"

عاصمہ خاتون کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ تین کروڑ روپے کے کاغذ کو پھاڑ رہی تھی۔ اسپتال کا ایک ایک ڈاکٹر ایک ایک عہدے دار قسمیں کھا کر کہہ رہا تھا کہ ان سب کے لئے ڈاکٹر کامران سب سے معزز ہے' اس مسیحا کی عزت ہم سب کی عزت ہے اور اس اسپتال سے کوئی بدنامی باہر نہیں جائے گی۔

عاصمہ خاتون تین کروڑ کے چیک کے ٹکڑوں سے آنکھوں کو ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆------☆------☆

وہ ایک بڑا سا ہال تھا۔ اتنا بڑا کہ وہاں سو ڈیڑھ سو افراد بیٹھ سکتے تھے مگر وہ تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھی۔ چھت پر اس کے سر کے ٹھیک اوپر ایک سرخ بلب روشن تھا۔ باقی ہال کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ایسے تاریک ہال میں وہ سرخ روشنی کے باعث سراپا لہو میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے سامنے دس فٹ کے فاصلے پر ایک بڑے سائز کا ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ اس ٹی وی کی اسکرین پر ڈاکٹر زیدی دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پوچھ رہا تھا۔ "کیا تم لہو میں ڈوبی ہوئی ہو؟"

وہ سیدھی بیٹھ کر اپنے ہاتھوں اور پیروں کو دیکھنے لگی پھر بولی۔ "ایسا لگ رہا ہے لیکن یہ لہو نہیں ہے۔ سرخ روشنی ہے۔"

ڈاکٹر زیدی نے گرج دار آواز میں کہا۔ "مگر تمہارے ہاتھوں میں کسی کا لہو ہے۔ اس لہو کو پونچھ دیا گیا ہے۔ چھپا دیا گیا ہے۔ تم ایک ارب پتی باپ کی بیٹی ہو۔ تمہارے ڈیڈی اپنی دولت سے تمہارے ہر عیب کو اور ہر جرم کو چھپا سکتے ہیں لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہو سکتا۔ کیا ہو سکتا ہے؟"

وہ پژمردہ سی آواز میں بولی۔ "نہیں ہو سکتا۔"

"تم مانتی ہو کہ ایک غلطی کو بار بار نہیں دہرانا چاہئے؟"

"ہاں، نہیں دہرانا چاہئے۔"

"اپنے ڈیڈی کو اپنے مسائل میں نہیں الجھانا چاہئے؟"

"میں اپنے ڈیڈی کو کبھی پریشان نہیں کرتی۔ وہ خواہ مخواہ میرے لئے فکر مند رہتے ہیں۔"

"تمہارے ڈیڈی انٹرنیشنل مارکیٹ میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ایک مدبر بزنس مین سمجھے جاتے ہیں۔ کیا وہ اتنے ذہین ہو کر تمہارے لئے خواہ مخواہ فکر مند رہیں گے؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔ ڈیڈی میری ایک غلطی کے بعد بہت محتاط ہو گئے ہیں۔ انہیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا۔ وہ سمجھتے ہیں میں پھر ایسی ہی کوئی غلطی کر سکتی ہوں۔"

"وہ تم پر اعتماد کرتے ہیں لیکن جب تم ایب نارمل ہونے لگتی ہو تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔"

"میں ایب نارمل نہیں ہوں۔ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں عام نارمل انسانوں کی طرح بول رہی ہوں۔ آپ نے مجھے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے دیکھا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے ڈیڈی کے ہیڈ آفس کو سنبھال رہی ہوں۔ کیا یہ میرے نارمل ہونے کا ثبوت نہیں ہے؟"

"بے شک تم نارمل ہو لیکن ہر پہلو سے نہیں۔ تمہاری زندگی کا ایک پہلو ایسا ہے جو ہمارے لئے پریشان کن ہے۔"

وہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "محبت.......... زندگی کے چند اہم پہلوؤں میں ایک محبت بھی ہے۔ یہ محبت زندگی سنوارتی بھی ہے اور اچھی خوشحال زندگی کو ماتمی بھی بنا دیتی ہے۔ آپ تو یہی کہیں گے کہ میری محبت نیگیٹو ہے۔ محبت کے لئے میرا عمل منفی ہے۔"

"جب کوئی بات منفی ہو۔ عقل اور تہذیب کے خلاف ہو تو انسان اندر سے بے چین ہو جاتا ہے۔ تمہیں آرام سے بیٹھنے کے لئے ایزی چیئر دی گئی ہے مگر تم بے چین ہو کر کرسی پر پہلو بدل رہی ہو۔ اس وقت تم کرسی پر نہیں، کانٹوں پر ہو۔ محبت کا کوئی کانٹا تمہیں کھٹک رہا ہے۔"

"میں واجد کو چاہتی ہوں۔ کیا کسی کو چاہنا منفی عمل ہے؟"

"پہلے آرام سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھو۔ اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دو اور صرف واجد کے بارے میں سوچو۔"

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ بیٹھے بیٹھے نیم دراز ہو گئی۔ ٹی وی اسکرین پر ایک بڑی سی موم بتی روشن تھی۔ پورے اسکرین پر وہ سلگتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے ڈاکٹر زیدی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "شیبا! پلکیں جھپکائے بغیر شمع کی لو کو تکتی رہو اور محبت کے بارے میں ایک پل کے لئے بھی رُکے بغیر بولتی رہو۔ کچھ سوچنے کے لئے ایک ساعت کے لئے بھی نہ رکو۔ مسلسل بولتی چلی جاؤ۔"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر شمع کی لو کو تکنے لگی۔ ڈاکٹر زیدی کی آواز سنائی دی۔ "بولو۔ تم بولتی رہو گی۔ میں سنتا رہوں گا۔ یہاں کوئی تیسرا سننے والا نہیں ہے۔ کوئی تمہیں روکنے ٹوکنے والا اور تمہاری غلطیوں پر انگلی اٹھانے والا نہیں ہے۔ کم آن بے بی! اسپیک اَپ۔"

اس کی نظریں شمع کی سلگتی ہوئی لو پر پیوست ہو گئی تھیں۔ وہ بولنے لگی۔ "میں چاہتی ہوں۔ میرا جو آئیڈیل ہو۔ وہ مجھے اپنا آئیڈیل بنا لے۔ مجھے ٹوٹ کر چاہے۔ میں محبت میں سر جھکاؤں تو وہ پیار میں سجدہ کرے۔"

بولتے بولتے اس کی آواز اور لہجے میں استحکام پیدا ہو رہا تھا۔ وہ بڑے عزم سے بول رہی تھی۔ "میں چاہتی ہوں۔ وہ میرے لئے ساری دنیا کو بھلا دے۔ وہ صرف مجھے چاہے کسی اور کو نہ چاہے۔ مجھے دیکھے کسی اور کو نہ دیکھے۔ میری سنے کسی اور کی نہ سنے۔ ایک شہنشاہ نے زمین پر تاج محل بنایا۔ وہ مجھے اپنی نظروں میں تاج محل بنا کر امر کر دے۔"

اس کی پلکیں جھپک گئیں۔ وہ بولتے بولتے رک گئی۔ ڈاکٹر زیدی کی گونجتی اور گرجتی ہوئی آواز ابھری۔ "بولو۔ تسلسل کو نہ توڑو۔"

وہ پھر پلکیں جھپکائے بغیر بولنے لگی۔ "میں نے ارمان کو اپنا پیار دینے میں کبھی کوئی کمی نہیں کی۔ میرے پاس پیار کی دولت بھی تھی اور دنیا کے ہر ملک کی کرنسی بھی تھی۔ دنیا کے ہر بڑے ملک کے بڑے شہروں میں میرے بینک اکاؤنٹس ہیں۔ میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ اس کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ارمان! تمہارے سینے میں میرے لئے دل دھڑک رہا ہے اور اس سینے پر جو جیب ہے اس میں اپنا یہ کریڈٹ کارڈ رکھ رہی ہوں۔ تم دنیا کے جس ملک میں جاؤ گے' اس کارڈ کے ذریعے ہزاروں اور لاکھوں ڈالرز کی شاپنگ کر سکو گے۔ اپنی ہر ضرورت پوری کر سکو گے۔ دنیا کے کسی حصے میں رہ کر کسی کے محتاج نہیں رہو گے۔

"میں نے اس کے لئے کیا نہیں کیا؟ ملکہ حُسن کے قدموں پر شہنشاہ اپنا تاج رکھ دیتے ہیں۔ تخت حکمرانی چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے کل سرمایہ ایک کریڈٹ کارڈ میں سمیٹ کر اسے دے دیا تھا۔"

"اس کے بدلے میں کیا چاہتی تھی؟"

"صرف اس کا پیار۔ اس کا وہ پیار جو صرف میرے لئے ہو۔ اس کا سونا میرے لئے

ہو' اس کا جاگنا میرے لئے ہو۔ میں نے اسے زنجیریں نہیں پہنائی تھیں۔ وہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کہیں بھی جا سکتا تھا۔ بس ایک چھوٹی سی شرط تھی کہ وہ جہاں جائے میرے ساتھ جائے۔ جہاں رہے میرے ساتھ رہے۔"

"یہ شرط ناقابلِ قبول تو نہیں تھی۔ دنیا کے سارے مرد اپنی تمام کمائی اپنی بیویوں کو دیتے ہیں۔ اس کے عوض صرف اتنا چاہتے ہیں کہ بیویاں ان کی پابندیوں میں رہیں۔ اپنا تن' من' دھن سب کچھ دینے کے بعد مجھے اتنا تو حق حاصل ہونا چاہئے کہ میں اپنے محبوب کو اپنی پابندیوں میں رکھوں۔

"پہلے وہ مانتا تھا۔ میری ہر بات مانتا تھا۔ جو کھلاتی تھی وہ کھاتا تھا۔ جو پہناتی تھی وہ پہنتا تھا۔ کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ میری غیر موجودگی میں دیکھتا ہو تو وہ الگ بات ہے۔ کسی مرد سے دوستی نہیں کرتا تھا۔ میں نے بڑی محبت سے سمجھایا تھا کہ جو وقت میرے ساتھ گزار سکتا ہے وہ دوستوں کے ساتھ گزار کر انہیں میری طرح اہمیت نہ دے۔ وہ کسی عزیز رشتے دار کے کسی بچے کو بھی گود میں نہیں اٹھاتا تھا۔ میں بڑے پیار سے کہتی تھی صرف مجھے اٹھایا کرے۔

"کیا میں اس پر جبر کرتی تھی؟ میں تو ارمان سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی۔ یوں پیار کرنے کو جبر کرنا تو نہیں کہتے۔"

"دنیا میں بے شمار مرد ہیں۔ جو کسی دولت مند حسینہ سے شادی کر کے ائرکنڈیشنڈ کار وا اور عالی شان محلوں میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ ساری زندگی عیش و آرام سے گزارنے کے لئے وہ کسی بھی مالدار حسینہ کے اشاروں پر ناچنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ بے چارے مجھ جیسی ارب پتی رئیس زادی کے مجازی خدا بننے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

"ارمان کو اس کے خوابوں کی تعبیر ملی تھی مگر کہتے ہیں کہ چھوٹی مچھلی کو تالاب سے نکال کر سمندر میں چھوڑو تو وہ گہرے اور وسیع سمندر کو برداشت نہیں کرتی۔ اس مچھلی کو اس کی اوقات سے زیادہ ملتا ہے تو وہ خوشی سے مر جاتی ہے۔ وہ کتا' کمینہ' ذلیل ارمان بھی اپنی اوقات بھول گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو مجھ سے زیادہ اہمیت دی۔ میں اپنے بیڈ روم میں اس کے ساتھ باہر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ ایسے وقت ملازم نے آ کر کہا کہ ارمان کی ماں پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ ارمان نے مجھے دیکھا پھر جسٹ اے منٹ کہتا ہوا اپنی

ماں کے کمرے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

"اس نے میری طرف سے اجازت ملنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ یہ بات مجھے ناگوار گزری پھر میں نے سوچا کوئی بات نہیں۔ ابھی آئے گا تو میں اسے تنبیہہ کروں گی۔ آئندہ وہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔

"میں نے ایک بہترین لباس زیب تن کیا۔ سہ طرفہ آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور اپنے کھلتے ہوئے وجود پر مسکرانے لگی۔ دوسرے ہی لمحے میری مسکراہٹ بجھ گئی۔ باہر کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی پھر اس کار کے وہاں سے جانے کی آواز آئی۔ میں نے تیزی سے چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس آکر دیکھا۔ میری کار کوٹھی کے احاطے سے باہر جارہی تھی۔

میں نے غصے سے چیخ کر پوچھا۔ "کون لے گیا ہے میری کار؟"

ملازم نے آکر کہا۔ "ارمان صاحب اپنی والدہ کو اسپتال لے گئے ہیں۔"

"وہ میری کار میں لے گیا ہے۔ یہاں گیراج میں تین کاریں موجود رہتی ہیں۔"

ملازم نے کہا۔ "ارمان صاحب کہہ رہے تھے۔ گیراج سے گاڑی نکالنے میں دیر ہوگی۔ ماں کو جلد سے جلد اسپتال پہنچانا ہے۔ آپ کی کار سامنے تھی۔ وہ اسی میں لے گئے ہیں۔"

"میں ملازم پر برس پڑی' شٹ اَپ! یُو بلڈی۔ تمہارے جیسے چھوٹے لوگ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ گیٹ لوسٹ۔

"ملازم سہم کر چلا گیا۔ میں غصے سے تلملانے لگی۔ وہ مجھے چاہنے والا' میرے پیار کی قسمیں کھانے والا۔ پہلی بار قسم توڑ کر اور مجھے چھوڑ کر اپنی ماں کو لے گیا تھا۔ جب کہ وہ میرے ساتھ جانے والا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ماں کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر کمرے سے باہر کار تک لے گیا تھا۔ یہ بات تو میں کبھی برداشت ہی نہیں کرسکتی تھی۔ جن بازوؤں میں مجھے اٹھاتا رہا تھا۔ اس میں کسی دوسری کو اٹھا کر لے گیا تھا۔

"ماں ہوئی تو کیا ہوا؟ وہ ملازموں کو حکم دیتا۔ ملازم اس بڑھیا کو اٹھا کر گاڑی میں پہنچا دیتے۔ خود اس طرح اٹھا کر لے جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ماں کو بہت چاہتا ہے۔ مجھ سے زیادہ چاہتا ہے اسی لئے جس گاڑی میں میرے ساتھ جانے والا تھا۔ اس گاڑی میں ماں کو لے گیا تھا۔

"ڈاکٹر زیدی آپ نے مجھے سمجھایا تھا کہ ایسے وقت مجھے غصے میں نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہ بڑی ہی ایمرجنسی میں ماں کو لے کر گیا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو ماں کو بروقت طبی امداد نہ پہنچا پاتا۔

"کیسی ایمرجنسی؟ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لئے گھر میں ملازم ہیں' گاڑیاں ہیں۔ وہ تمام ملازم بروقت اسے اسپتال پہنچا سکتے ہیں۔ اسپتال میں مہنگے سے مہنگا علاج کرا سکتے تھے۔ نہ کسی بات کی کمی تھی' نہ کوئی رکاوٹ تھی۔

"جس طرح وہ اپنی ماں کو لے گیا اسی طرح مجھے بھی ساتھ لے جا سکتا تھا لیکن نہیں۔ میں اس کے ساتھ کیسے جاسکتی تھی۔ وہ میرے سامنے اسے بازوؤں میں اٹھا کر لے جاتا اور میں پیدل چلتی؟ یہ تو میں کبھی برداشت ہی نہیں کرسکتی۔

"بعد میں بھی مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے ماں کو اسپتال پہنچاتے ہی وہاں سے فون پر مجھے کہا۔ "شیبا! امی کی حالت بہت ہی تشویش ناک ہے۔ ڈاکٹرز انہیں اٹینڈ کررہے ہیں۔ خدا سے امی کی سلامتی کے لئے دعا کرو۔

"میں نے فون پر چیختے ہوئے کہا۔ "ٹو ہیل وِدھ یور امی۔ تم اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر لے گئے تھے؟ تم نے میری جگہ اس بڑھیا کو دی۔

"شیبا! یہ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ میری امی ہیں۔ انہوں نے مجھے پیدا کیا ہے' مجھے اپنا دودھ پلایا ہے۔

"کتنا دودھ پلایا ہے؟ برس دو برس تک کیا من دو من دودھ پلایا ہے؟ میں تو تمہیں تمام عمر سونے کا نوالہ کھلاتے رہنے کے وعدے پر عمل کررہی ہوں۔

"شیبا! تم میرے لئے جو کررہی ہو' وہ دنیا کی کوئی عورت نہیں کرے گی۔ ماں اپنی جگہ ہے مگر تمہارا مقام کوئی دوسری عورت حاصل نہیں کرسکے گی۔ پلیز' غصہ تھوک دو۔ میں بہت پریشان ہوں۔ امی کی حالت سنبھلتے ہی میں تمہاری کار لے کر آرہا ہوں۔

"اور جب تک تم کار لے کر نہیں آؤ گے' میں تمہارے انتظار میں یہاں بیٹھی رہوں گی۔ کیا میں تمہارے باپ کی ملازمہ ہوں؟

"میں نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ ارمان پچھلے ایک برس سے میرا تابعدار محبوب تھا۔ وہ میرے مزاج کو سمجھتا تھا۔ کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیتا تھا۔ مجھے ہر طرح سے خوش کرتا رہتا تھا۔ تقریباً ایک برس بعد اس نے ایسی حرکت کی تھی جو میری توقع کے

خلاف تھی۔

"ٹھیک ہے کہ اس نے اپنی ماں کو گود میں اٹھایا تھا لیکن اس کی جوانی مجھے گود میں اٹھانے کے لئے تھی۔ ویسے بھی کوئی بڑھاپے کا بوجھ اٹھانا پسند نہیں کرتا ہے۔ گلدان میں تازہ پھول سجائے جاتے ہیں اور جوان بازوؤں میں کھلتی ہوئی جوانی کو سجایا جاتا ہے بڑھاپے کو نہیں۔

"ارے ماں ہوئی تو کیا ہوا۔ ماں کوئی دنیا سے نرالی تو نہیں ہوتی۔ میری ماں تو مجھے دودھ پینے کی عمر میں چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ جب ماں بچے کو چھوڑ سکتی ہے تو کیا بچہ ماں کو نہیں چھوڑ سکتا؟ میری ماں نے مجھے چھوڑ دیا۔ کیا ارمان اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتا؟

"مگر وہ تو مجھے چھوڑ کر ماں کو ساتھ لے گیا تھا۔ پہلی بار مجھے پتا چلا کہ ایک عورت میری محبت کی حصے دار بن گئی ہے۔ ارمان کی گود میں اس کا حصہ ہے۔ وہ میرے ساتھ وقت گزارنے جارہا تھا مگر میرا وہ وقت ایک عورت چھین کر اسپتال لے گئی۔

"ڈاکٹر زیدی! آپ کہتے ہیں کہ میں محبت کو نیگیٹو وے میں لیتی ہوں۔ محبت میں ایب نارمل ہو کر سوچتی ہوں۔ میں تو نارمل ہوں۔ میں تو پہلے ارمان کو اس کے تمام حقوق اور اس کی خوشیاں دیتی ہوں۔ میں نے اس کی ماں کے لئے ملازم رکھے تھے۔ اس کی ماں کے لئے ایک گاڑی بھی رکھی تھی۔ وہ ماں کی خدمت کرنے نہیں جاتا تھا۔ ملازم دن رات اس کی ماں کی خدمت کرتے تھے۔ جب ایسا ہوتا آرہا تھا تو ایمرجنسی کے وقت وہ ماں کو گود میں نہ اٹھاتا۔ ملازم اٹھا کر لے جاتے تو کیا فرق پڑتا؟

"اپنا سب کچھ دینے کے بعد کیا میں اتنا سا حق نہیں رکھتی کہ وہ ماں کو یا کسی بھی عورت کو میری طرف سے سارا عیش و آرام دے دے' صرف میرے پیار کا ایک پل بھی مجھ سے نہ چھینے؟ کیا اتنا سا حق مانگنے والی کو آپ حقدار نہیں کہیں گے؟ ایب نارمل کہیں گے؟"

ڈاکٹر زیدی کی آواز ابھرنے لگی۔ "ہماری دنیا میں محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو دوسروں کے لئے ہوتا ہے۔ دوسروں کو نوازنے سے محبت کم نہیں ہوتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ محبت کو اگر پاکیزگی سے سوچو تو وہ ماں کو بھی دی جاتی ہے اور بہن کو بھی۔ محبت کو جذبات سے سوچو تو وہ محبوبہ کو اور بیوی کو دی جاتی ہے۔

"مرد کی زندگی میں پہلے ماں آتی ہے۔ بعد میں محبوبہ آتی ہے۔ بعد میں آنے والی کو پہلے آنے والی کا حق نہیں چھیننا چاہئے بلکہ محبت کے جتنے بھی حقدار ہیں' ان سے محبت کرنے کا حق نہیں چھیننا چاہئے۔

"زمانۂ قدیم میں غلام خریدے جاتے تھے۔ ان غلاموں کے دن رات اپنے آقاؤں کے لئے ہوتے تھے۔ ان غلاموں کو اپنی ماں باپ اور بھائی بہنوں سے ملنے اور بات کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

"تم نے ارمان کو محبوب نہیں' غلام بنایا تھا۔ تم نے ارمان کا دل جیتا نہیں تھا' خریدا تھا۔ اس بات کو گرہ میں باندھ لو۔ جب تک خریداری کرتی رہو گی' کسی بھی آئیڈیل کو اپنا محبوب نہیں بنا سکو گی' کسی کو خرید کر اس کا جسم حاصل کر سکو گی مگر دل نہیں جیت سکو گی۔"

وہ اپنے سامنے شمع کی جلتی ہوئی لو کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ میں ارمان کو جیت لیتی مگر مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں نے اس سے کہا تھا اب وہ اپنی ماں کے پیچھے نہ رہے۔ اس کی ماں کی نگرانی کے لئے ڈاکٹروں اور نرسوں کو زیادہ معاوضہ دیا جائے گا۔ اسے صرف وزیٹنگ آورز میں دس پندرہ منٹ کے لئے ملنا چاہئے۔ جب کہ وہ دس پندرہ منٹ بھی میرے تھے۔ میں اپنے وہ چند منٹ اس کی ماں کو خیرات کررہی تھی مگر میری سخاوت اور خیرات کو کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ عجیب الٹی دنیا ہے۔ جتنا اس کی ماں کے لئے کررہی تھی اتنا کوئی کسی کے لئے نہیں کرتا پھر بھی آپ مجھے ایب نارمل کہتے ہیں۔

"میں رات کو کھانے کی میز پر اسے یہ باتیں سمجھا رہی تھی۔ جب وہ سامنے ہوتا تھا تو میں اس گبرو جوان کو دیکھ کر پگھل جاتی تھی۔ اس رات اس نے بڑی فرمانبرداری سے کہا اگر تم مجھ پر میری ماں کا بھی حق نہیں سمجھتی ہو تو تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔ میں پھر کبھی امی کو اپنے بازوؤں میں نہیں اٹھاؤں گا۔ ملازم ان کی خدمت کیا کریں گے۔

"اس تابعدار عاشق نے میرا دل خوش کردیا۔ جب دل صاف ہوا تو یہ خواہش ہوئی کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کرے۔ مجھے بازوؤں میں اٹھا کر ڈائننگ روم سے بیڈ روم میں لے جائے۔

"لیکن یہ بات میں اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔ مرد کو خود سمجھنا چاہئے کہ عورت کن لمحات میں کیا چاہتی ہے۔ میں نے کھانے کی پلیٹ اپنے سامنے سے ہٹاتے

ہوئے کہا بس کھا چکی۔ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔ اب میں بیڈروم میں جاؤں گی۔
وہ بولا۔ "کھانے کے بعد ٹہلنا چاہئے۔ لان میں چلتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

"وہ بالکل ڈفر تھا۔ بعض اوقات میری خواہشات کو، میری باتوں کو اور میرے اشاروں کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔ بالکل اناڑی تھا۔

"لیکن میں بھی ضد کی پکی ہوں۔ وہاں بیٹھی رہی۔ یہ طے کرلیا کہ جاؤں گی تو اس کے بازوؤں میں ورنہ وہیں بیٹھی رہوں گی۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم اپنا سامان خود نہیں اٹھاتے، ملازم سے اٹھواتے ہو لیکن مجھے اٹھا کر پیار کے لمحات کو رنگین بناتے ہو۔ کیا میں بوجھ نہیں لگتی؟"

"وہ بولا، سامان دوسروں کے اٹھانے کے لئے ہوتا ہے اور میں صرف تمہارا بوجھ اٹھانے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ جب تمہیں اٹھاتا ہوں تو پھول کی طرح ہلکی لگتی ہو۔"

"اس کی باتیں میرا دل خوش کردیتی تھیں۔ میں نے سوچا اب وہ میرے جذبوں کو سمجھ رہا ہے۔ اب وہ مجھے پھول کی طرح اٹھا کر لے جائے گا۔"

"شٹ، ایسے وقت چاہنے والا اناڑی بن جائے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ جھنجلاہٹ بھی ہوتی ہے۔ وہ گلاس اٹھا کر پانی پی رہا تھا۔ میں نے ایک فورک اٹھا کر اسے خنجر کی طرح پکڑا پھر اس نکیلے فورک کو اپنی ران میں پیوست کرلیا۔ تکلیف کے باعث چیخ نکل گئی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا، کیا ہوا؟"

"میرے ہاتھ میں فورک تھا اور اس فورک سے گرم لہو کے چند قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ گھبرا کر بولا یہ کیسے ہوگیا؟ جسٹ اے منٹ۔ میں ابھی آیا۔"

"وہ دوڑتا ہوا گیا پھر فرسٹ ایڈ باکس اٹھا کر لے آیا۔ کپڑا ہٹا کر مرہم پٹی کرنے لگا۔ مجھے تکلیف ہو رہی تھی مگر اچھا لگ رہا تھا۔ جب وہ ہاتھ لگاتا رہتا ہے، میری خدمت کرتا رہتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"مرہم پٹی کرنے کے بعد اس نے مجھے دونوں بازوؤں میں اٹھالیا۔ میں مسرتوں سے مالامال ہوگئی۔ میرے اندر جو خواہش تھی وہ پوری ہوگئی۔ وہ مجھے پھول کی طرح اٹھائے ہوئے بیڈ پر لٹاتے ہوئے بولا آخر تم زخمی کیسے ہوگئیں؟"

"میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا تم ایک نمبر کے ایڈیٹ ہو۔ بے وقوف ہو، اناڑی ہو۔ اگر پہلے ہی بازوؤں میں اٹھا کر لے آتے تو یہ زخم نہ لگتا۔"

"اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ میں نے بھی اسے نہیں سمجھایا۔ بعض اوقات پیار میں ناسمجھی بھی اچھی لگتی ہے۔"

"اس نے دوسری صبح دفتر جاتے ہوئے کہا میں اسپتال سے امی کی خیریت معلوم کرتا جاؤں گا۔"

"مجھے یہ پسند نہیں تھا کہ وہ میرے بغیر کسی سے ملنے جائے۔ میں نے کہا ہمارے دفتر میں بڑے مسائل ہیں۔ ان مسائل پر توجہ دو۔ شام کو واپسی میں صرف دس منٹ کے لئے ماں سے مل کر آجانا۔"

"میں غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد دفتر جانے والی تھی۔ کبھی ہم دونوں ساتھ جاتے تھے۔ کبھی میں دیر تک سوتی رہتی تو اسے تنہا جانے کی اجازت دے دیتی تھی۔ میں نے اسے دفتر جانے دیا۔ آدھے گھنٹے بعد میرے ایک ملازم نے فون پر بتایا کہ ارمان اسپتال میں اپنی ماں کے پاس آیا ہے اور اب واپس جارہا ہے۔"

"میں نے اسپتال میں دو ملازموں کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی تاکہ وہ دن رات اس کی ماں کا خیال رکھیں اور اسے کسی چیز کی کمی نہ ہونے دیں۔ جب میں اس کی ماں کا مہنگا علاج کرا رہی تھی۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے معقول انتظامات کرچکی تھی تو پھر ارمان کو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ جب کہ میں نے منع کیا تھا۔ یہ تو مجھے غصہ دلانے والی بات تھی۔"

"میں نے ملازم سے فون پر پوچھا۔ "اس کی ماں کیسی ہے؟"

"میڈم! اچانک بہت طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ صاحب کی ماں جی کو ایک الگ کمرے میں لے جاکے رکھا ہے۔"

"میں نے پوچھا کیا انتہائی نگہداشت میں رکھا ہے؟"

"جی ہاں، اس کمرے کو ایسا ہی کچھ کہتے ہیں۔"

"میں نے فون کو بند کیا۔ اس نے پہلی غلطی کی تھی۔ اسے میں نے بڑی مشکل سے برداشت کیا تھا۔ وہ دوسری بار منع کرنے کے باوجود وہاں گیا تھا۔ جب کہ میں نے کہا تھا کہ ہم شام کو وزیٹنگ آورز میں جائیں گے۔"

"اس کا یوں جانا یہ ثابت کررہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو مجھ پر ترجیح دے رہا ہے۔ اگر اس کی ماں یونہی بیمار پڑتی رہے گی تو میرے اور ارمان کے درمیان دیوار بنتی رہے گی۔ مجھ

سے زیادہ اہمیت حاصل کرتی رہے گی۔'

"میں نے دوسری گاڑی نکلوائی پھر سیدھی اسپتال پہنچ گئی۔ وہ ملاقات کا وقت نہیں تھا لیکن اس کی ماں کو اسپیشل وارڈ کے اسپیشل کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی وقت بھی اس کمرے میں جا سکتا تھا۔"

"میرے دو ملازم وہاں باری باری ڈیوٹی پر موجود رہتے تھے۔ اس وقت وہ ملازم وہاں موجود تھا جس نے مجھے فون کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ارمان کی ماں کو خصوصی نگہداشت والے کمرے میں رکھا گیا ہے۔

"میں نے اس کمرے کی طرف آکر ایک بند کھڑکی کے شیشے کے آرپار دیکھا۔ وہ کمرے کے اندر ایک بیڈ پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ آنکھوں کے نیچے پلاسٹک کا ماسک تھا۔ اس ماسک کے اندر دو نلکیاں اس کے دونوں نتھنوں سے لگی ہوئی تھیں۔ بستر کے قریب ایک اسٹینڈ سے پلاسٹک کا گیس سلنڈر منسلک تھا۔ اس کی نلکیاں اس کے دونوں نتھنوں تک پہنچائی گئی تھیں۔ اس طرح اسے آکسیجن پہنچائی جا رہی تھی۔

"اسپتال کے اس حصے میں خاموشی اور ویرانی تھی۔ وہاں ڈاکٹرز اور نرسیں صرف ضرورت کے وقت آیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر نے ارمان کی ماں کو آکسیجن پہنچانے کے انتظامات کئے تھے پھر وہاں سے چلا گیا تھا۔ ایک نرس آدھے گھنٹے تک اس کمرے میں رہ کر اس کا معائنہ کرتی رہی۔ اس کی نبض اور دل کی دھڑکنیں کسی حد تک نارمل ہو گئی تھیں۔ اسے نیند آ گئی تھی۔ نرس بھی مطمئن ہو کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

"میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر محتاط نظروں سے آس پاس دیکھتے ہوئے اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ بیڈ پر ایک لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی مگر زندہ تھی مگر کیوں زندہ تھی؟

"میں ارمان سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہوں۔ یہ احسان کرتی ہوں کہ ماں کا سایہ اس کے سر پر رہے۔ اس کے باوجود ایب نارمل کہلاتی ہوں۔ تو پھر ایب نارمل ہی سہی۔

"میں گیس سلنڈر کے پاس آ گئی۔ میں ہمیشہ دوسروں کو کچھ نہ کچھ دیتی آئی ہوں مگر کوئی مجھ سے میری دولت اور میرا سب کچھ لے کر بھی مجھ سے میری ایک عزیز ترین چیز چھیننا چاہے گا تو پھر میں بھی یہ حق رکھتی ہوں' اس کا جینا حرام کر سکتی ہوں۔ جو مجھ سے

چھیننا چاہے میں اس کی سانسیں چھین سکتی ہوں۔ میں نے ان دو نلکیوں کو کھینچ کر گیس سلنڈر سے الگ کیا پھر وہاں سے چپ چاپ چلی آئی۔

"جب آفس میں پہنچی تو ارمان صدمے سے نڈھال تھا اور بڑی عجلت میں کوٹ پہنتا ہوا اپنے کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "اتنی بدحواسی میں کہاں جا رہے ہو؟"

"اس نے کہا اوہ شیبا! ابھی اسپتال سے اطلاع ملی ہے کہ امی کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ اسپتال چلو گی؟"

"تم جاؤ۔ میں گھر جا کر تکفین و تدفین کا انتظام کرتی ہوں۔"

"وہ چلا گیا۔ شام تک اس کی ماں کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔ اسے ماں کی موت کا صدمہ تھا۔ وہ رات کے وقت سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ میرے بیڈ پر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑھیا مرنے کے بعد بھی اپنی یادوں کے ذریعے اسے مجھ سے دور کر رہی تھی۔

میں نے ناگواری سے کہا۔ "کیا اس طرح سر جھکائے بیٹھے رہنے سے تمہاری ماں واپس آ جائے گی؟ یہاں کیوں نہیں آتے؟"

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا پھر کہا۔ "ڈاکٹرز اور نرسیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ گیس سیلنڈر سے نلکیاں نکل گئی تھیں۔ جب کہ نلکیاں خود بخود نہیں نکلتیں۔ انہیں نکالنا پڑتا ہے۔"

"میں نے پوچھا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ نلکیاں خود نہیں نکلیں۔ کسی نے نکالی ہیں؟'

"یہی بات میرے ذہن میں گردش کر رہی ہے کہ جب نلکیاں خود نہیں نکلتیں تو کسی نے نکالی ہوں گی۔'

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ کون تمہاری ماں سے دشمنی کرے گا؟ کون نلکیاں نکالے گا؟'

"میں یہ تو نہیں کہہ رہا ہوں کہ کسی دشمن نے ایسا کیا ہو گا۔ کسی نرس یا وارڈ بوائے کی غلطی سے ایسا ہو سکتا ہے۔'

"میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے اچانک کہا۔"تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم اسپتال گئی تھی؟"

"میں نے اسے چونک کر دیکھا پھر ڈھٹائی سے کہا' تم نے بھی مجھے نہیں بتایا کہ میرے منع کرنے کے باوجود اسپتال گئے تھے؟'

"وہ جھجکتے ہوئے بولا' وہ بات یہ ہے کہ میں نے دفتر جاتے وقت موبائل کے ذریعے امی کی خیریت معلوم کی تھی۔ اسپتال میں رہنے والے ملازم نے بتایا کہ اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ انہیں آئی سی یو میں لے جایا گیا ہے۔ تم ایسے وقت ایک ماں کے لئے بیٹے کے جذبات سمجھ سکتی ہو۔ میں بے اختیار امی کے پاس چلا گیا۔'

"کیا تمہارے وہاں جانے سے تمہاری ماں بچ گئی؟ اسے موت نہیں آئی؟"

"ڈاکٹروں نے انہیں بچالیا ہوتا مگر..........' اس نے بڑے صدمے سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا پھر بڑی شکست خوردگی سے کہا۔ "تم نے' تم نے.........'

"میں بستر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے بولی' میں نے؟ کیا میں نے؟ بولو' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم وہاں گئی تھی؟"

"ہاں گئی تھی۔ جب مجھے پتا چلا کہ وہ کمرے میں نہیں ہے۔ اسے آئی سی یو میں رکھا گیا ہے تو میں اس کمرے سے ہی واپس چلی آئی۔ یقین نہ ہو تو ملازم سے پوچھ لو۔'

"پوچھا تھا۔ اس نے تمہیں آئی سی یو کی طرف جاتے دیکھا تھا۔'

"تو؟ تو کیا ہوا؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں نے ان نلکیوں کو گیس سیلنڈر سے الگ کیا تھا؟'

"وہ مجھے تک رہا تھا۔ اس نے پہلے کبھی اس انداز میں مجھ سے آنکھیں نہیں ملائی تھیں۔ اس کی نظروں میں بڑی گہرائی اور پختگی تھی۔ میں نے کہا۔ "اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ مجھ پر شبہ ہے تو جاؤ' میرے خلاف رپورٹ لکھواؤ۔ مجھ پر مقدمہ چلاؤ۔ مجھے پھانسی کے تختے پر پہنچا دو۔'

"اس بار میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت ہے۔ وہ بولا "تمہارے خلاف کیسے کوئی قدم اٹھاؤں؟ تم نے پچھلے ایک برس میں مجھ پر اتنے احسانات کئے ہیں کہ ان احسانات کے بدلے مجھے تم پر قربان ہو جانا چاہئے مگر تم نے میری امی کی قربانی لے لی۔'

"وہ مجھ سے منہ پھیر کر جانے لگا۔ میں نے کہا۔ "جاؤ۔ کسی دوسرے کمرے میں

رات گزارو اور عقل سے سوچو تم میرے خلاف کچھ نہیں کر سکو گے۔ میرے خلاف مقدمہ کرنا تو دور کی بات ہے۔ تم رپورٹ درج کرانے جاؤ گے تو اس کے بھی پیسے لگیں گے اور یہاں سے نکلنے کے بعد تمہاری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں رہے گی۔ جو ہو چکا ہے اسے بھول کر عیش و عشرت کی زندگی گزارو اسی میں دانش مندی ہے۔'

"وہ چلا گیا۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ میں نے اسے دولت کے کھونٹے سے باندھ رکھا تھا۔ میرے کریڈٹ کارڈ سے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے کرتے وہ ہڈ حرام ہو گیا تھا۔ وہ پھر میرے بیڈ روم میں آنے والا تھا۔

"مگر نہیں آیا۔ دوسری صبح ہو گئی پھر شام ہو گئی۔ تب میری بے چینی بڑھ گئی۔ وہ میرا آئیڈیل تھا۔ میں نے زندگی بھر اپنے لئے صرف اپنے لئے.......... اسے خریدا تھا۔ میری خریدی ہوئی چیز میرے گھر سے چلی جائے۔ یہ نقصان میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"وہ ایسے چلا گیا تھا۔ جیسے میں اس کے لئے کچھ نہیں ہوں۔ اس کے لئے سب کچھ کرتی رہی پھر بھی میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ مجھے ایسے چھوڑ کر چلا گیا جیسے میں جھوٹا کھانا ہوں۔ اب اس جھوٹے کھانے کو وہ تو کیا کوئی دوسرا بھی منہ نہ لگائے گا۔

"جب ڈیڈی کو پتا چلا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے اور میں اپنے بیڈ روم سے باہر نہیں نکلتی ہوں۔ چیخ چیخ کر بڑبڑاتی رہتی ہوں' بیڈ روم کی چیزوں کو پھینکتی اور توڑتی پھوڑتی رہتی ہوں تو انہوں نے مجھے آکر سمجھایا' کول ڈاؤن مائی بے بی۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ تم نے ایک ہیرو ٹائپ کا ہینڈسم جوان دیکھا اور میرے منع کرنے کے باوجود اس سے شادی کر کے اپنی زندگی برباد کی ہے۔'

ڈیڈ! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ وہ کہیں جا کر مجھ سے چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ آپ پولیس میں رپورٹ درج کرائیں کہ وہ لاکھوں روپے کے زیورات اور نقدی لے کر یہاں سے فرار ہو گیا ہے۔ پولیس اسے ضرور ڈھونڈ نکالے گی۔"

"بیٹی! یہ سب نہ کرو۔ وہ گرفتار ہو گا۔ اس کے پاس سے کچھ نہیں نکلے گا۔ الزام غلط ثابت ہو گا۔ میری بات مان لو' اس سے انتقام لینے کا خیال دل سے نکال دو۔"

"میں کہہ چکی ہوں' اسے نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے میری محبت کی توہین کی ہے۔ مجھے ٹھکرا کر چلا گیا ہے۔ میں اسے ایک ٹھوکر میں موت کی نیند سلا دوں گی۔"

"بس کرو شیبا۔ تم غصے اور جنون میں کیا کہتی ہو' کیا کرتی ہو تمہیں احساس نہیں ہوتا۔ غلطیاں کرنے کے بعد بھی تم اپنی غلطیوں پر نہیں پچھتاتی ہو۔"

"کیا میں غلطیاں کرتی ہوں؟"

"پہلے چھوٹی بڑی غلطیاں کرتی رہیں۔ میں ان پر پردہ ڈالتا رہا۔ تم میری ایک ہی بیٹی ہو۔ یہی سمجھتا رہا کہ میری محبت نے اور دولت کی فراوانی نے تمہیں ضدی اور خود سر بنا دیا ہے۔ ایک ارب پتی باپ کی بیٹی ایسی ہے تو کوئی بات نہیں۔ غریب لڑکیوں کی طرح تمہارے رشتے کی فکر نہیں کرنی پڑے گی اور یہ سچ ہے' بے شمار رشتے تمہارے قدموں میں پڑے رہتے ہیں مگر تم نے تو انتہا کردی ہے۔ جو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا' تم وہ کر گزری ہو۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"مرڈر کیا ہے۔ اس بے چارے کی ماں کو مار ڈالا ہے۔"

"آپ؟ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں اور تم اسے سمجھ رہی ہو۔ ارمان نے یہ کوٹھی چھوڑتے وقت مجھے فون پر کہا تھا کہ تم نے اسے لاکھوں ڈالرز کا کریڈٹ کارڈ دے کر اس کی ماں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ وہ تمہارے خلاف کچھ نہیں کرسکے گا اس لئے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہے۔"

"میں اسے جانے نہیں دوں گی۔ اسے تلاش کروں گی۔ وہ مل جائے گا تو اسے ایسے جکڑ کر رکھوں گی کہ پھر کبھی مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ اب تو اس کی ماں بھی نہیں ہے۔ اسے مجھ سے چھیننے والی کوئی ہستی نہیں رہی ہے۔"

"شٹ اپ۔ کسی کو خرید کر محبت کرنے کا یہ جنون تمہیں پاگل خانے پہنچا دے گا۔ میرے ساتھ چلو۔ میں سوئٹزر لینڈ جا رہا ہوں۔"

"میں ارمان کے لئے پاگل ہو رہی تھی۔ اس کے بغیر یہ شہر تو کیا یہ گھر بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

"لیکن اسے دل و دماغ سے نکالنا پڑا۔ ایک دن اخبار میں اس کی تصویر دیکھی۔ یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ارمان نامی ایک نوجوان نے ریلوے لائن پر کٹ کر جان دے دی ہے۔ یہ خبر پڑھتے ہی میں ٹھنڈی پڑ گئی۔ اسے اپنا تابعدار محبوب بنانے کے لئے جو جوش و

جنون تھا وہ سرد پڑ گیا۔ جب وہ مر چکا تھا' اس دنیا میں کسی اور کا بن کر رہنے کے لئے زندہ نہیں رہا تھا تو میں اسے کس سے چھینتی؟ کیسے فخر کرتی کہ میں نے صرف اپنے لئے کسی کو ریزرو رکھا ہے؟"

چند سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ اس کے سامنے ٹی وی اسکرین پر شمع کی لو روشن تھی۔ سرخ روشنی کے باعث وہ جیسے لہو میں نہائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں ڈاکٹر زیدی کی آواز اُبھری۔ "اب اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا تم بالکل نارمل ہو؟"

"بے شک میں کہہ چکی ہوں میرے ڈیڈی کا بزنس کئی ممالک تک پھیلا ہوا ہے اور میں تنہا ان کے ہیڈ آفس کو سنبھال رہی ہوں۔ کیا یہ میرے نارمل ہونے کا ثبوت نہیں ہے؟"

"تم ہر اعتبار سے نارمل ہو مگر تمہارا ایک معاملہ ایسا ہے جس میں الجھ کر تم ایب نارمل ہو جاتی ہو۔"

"محبت۔ آپ کہیں گے میں کسی سے محبت کرتی ہوں تو خلاف تہذیب اور خلاف قانون حرکتیں کرنے لگتی ہوں۔"

"اور یہ غلط نہیں ہے۔ تم پچھلے تین برسوں سے بالکل نارمل رہی ہو مگر اب ایسے آثار پیدا ہو رہے ہیں جن کے باعث تمہارے ڈیڈی پھر تمہارے لئے پریشان رہنے لگے ہیں۔"

"آپ ڈیڈی کو سمجھائیں کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ اگر پھر کسی سے محبت کر رہی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پھر ویسی ہی کوئی غلطی کروں گی۔"

"ہماری تو یہی دعا ہے۔ واجد ایک اچھا تعلیم یافتہ لڑکا ہے۔ جب تمہارے ڈیڈی کو پتا چلا کہ تم اس میں دلچسپی لے رہی ہو تو انہوں نے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں لیکن اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکا۔"

"ڈیڈی نے جو بھی معلومات حاصل کیں' وہ کیا ہیں؟"

"یہی کہ واجد ایک بڑی موٹر بوٹ کا مالک تھا۔ اس کی بوٹ کے ملاح بڑے بڑے جال پھینک کر بڑی تعداد میں کیکڑے پکڑ کر لاتے تھے۔ وہ کیکڑے ایک فیکٹری میں سپلائی کئے جاتے تھے۔"

شیبا نے کہا۔ "ہاں' میں نے وہ پوری فیکٹری خرید لی تاکہ واجد میرے قریب

آجائے۔"

"یہاں تم کچھ ایب نارمل ہو رہی ہو۔ تم نے اپنی کاروباری ذہانت کو بالائے طاق رکھ کر ایک چھوٹی سی فیکٹری خریدی ہے۔ کہاں تمہارا یہ اربوں کا کاروبار اور کہاں یہ فشریز کی ایک فیکٹری جہاں سے شاید ہزاروں یا لاکھوں روپے کا منافع ہوتا ہوگا' یہ منافع تمہارے لئے ایک ذرے کے برابر ہے۔ تم نے صرف واجد کو اپنے قریب لانے کے لئے وہ فیکٹری خریدی ہے اور واجد کو اس فیکٹری میں کیکڑوں کا سب سے بڑا سپلائر بنا دیا ہے۔"

وہ بولی۔ "ہم کاروبار کی اس بلندی پر ہیں جہاں پہنچ کر کسی چھوٹے بزنس کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا لیکن کبھی کبھی تفریح کے لئے یا کبھی کسی اپنے کو پانے کے لئے ایسا کیا جاتا ہے۔ اس فیکٹری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایک دن وہ فیکٹری میں اس کے حوالے کر دوں گی۔"

"تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں کہ تم کسی کو پسند کرو اور اس سے شادی کر کے پُرمسرت زندگی گزارتی رہو لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ واجد کون ہے؟ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ کیا وہ تمہارے خیال کے مطابق تمہارے ساتھ ایک اچھی ازدواجی زندگی گزار سکے گا؟ تم بتاؤ اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"میں بھی کچھ زیادہ نہیں جانتی ہوں۔ اسے پہلی بار دیکھا تو ایسا لگا جیسے میں اسے ہی تلاش کر رہی تھی۔ وہی میرے پچھلے زخموں کو بھر سکتا ہے۔ جب میں نے فیکٹری خرید لی اور اسے اپنی فیکٹری کا سب سے بڑا سپلائر بنا دیا تب میں نے اس سے پوچھا' کیا وہ یہاں تنہا رہتا ہے؟

"واجد نے کہا فی الحال تنہا ہوں۔ ایک اچھی خوشحال زندگی گزارنے کے خواب دیکھ کر آیا ہوں۔ چاہوں تو ایک مکان خرید کر ایک گھریلو زندگی گزار سکتا ہوں لیکن میں کسی اچھے علاقے میں ایک بڑی سی کوٹھی خریدوں گا۔ آپ نے مجھے اتنی بڑی آفر دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب جلد ہی میرے یہ خواب پورے ہو سکیں گے۔"

"شیبا! میں تمہارا ڈاکٹر ہوں۔ تمہاری بہتری کے لئے بہترین مشورے دیتا رہتا ہوں۔ میرا ایک مشورہ مانو۔ پہلے واجد کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو۔ اس سے محبت کرنے' پھر شادی کرنے' پھر اسے اپنا بنا کر رکھنے کے سلسلے میں یہ اچھی طرح یقین کر لو کہ تم ایسا کر سکو گی اور اس سلسلے میں پھر کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔"

"کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کی باتوں سے سمجھ لیا ہے اور پھر میں دیکھتی رہتی ہوں کہ وہ دولت کمانے کے لئے دن رات محنت کرتا رہتا ہے۔"

"یہی تو ایک نقطہ ہے۔ پہلے تمہاری زندگی میں آنے والا ارمان ہڈ حرام تھا۔ یہ واجد محنتی ہے۔ دن رات محنت کر کے دولت کمانے والے غیرت مند ہوتے ہیں۔ بہتر ہے اس سے کھل کر باتیں کرو اور اسے اپنی زبان سے یہ کہنے دو کہ وہ تم سے شادی کرے گا۔ تم سے اور صرف تم سے محبت کرتا رہے گا اور تمہاری محبت کو تقسیم نہیں کرے گا۔"

"میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گی۔ اس سے کھل کر باتیں کروں گی پھر جو نتیجہ ہوگا۔ اس سے ڈیڈی کو اور آپ کو آگاہ کروں گی۔"

"دیٹس لائیک اے گڈ گرل۔ اب تم آرام سے اس کرسی پر لیٹی رہو۔ آنکھیں بند کر لو۔ جب پُرسکون ہو جاؤ۔ تھکن کا احساس نہ رہے تو میرے پاس چلی آنا۔ میں ریکارڈنگ روم میں رہوں گا۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تھکن محسوس کر رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ اسی طرح ایزی چیئر پر لیٹی رہے گی۔ تھکن دور ہونے کے بعد وہاں سے جائے گی۔

☆------☆------☆

ڈاکٹر زیدی ریکارڈنگ روم میں شیبا کے باپ سرفراز خان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ٹی وی کے سوئچ کو آف کیا پھر ریکارڈنگ مشین سے ٹیپ اسپول نکال کر سرفراز خان کو دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے خیال میں شیبا ایسی بھی ایب نارمل نہیں ہے کہ کسی کے بھی سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر لے گی۔"

سرفراز خان نے پوچھا۔ "کیا میں غلط سمجھتا ہوں؟"

ڈاکٹر زیدی نے اس ٹیپ اسپول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا ہے؟ کیا اس میں تمہاری بیٹی نے پوری تفصیلات کے ساتھ یہ اعتراف نہیں کیا ہے کہ وہ اپنی ایک ساس کا مرڈر کر چکی ہے؟"

"ہاں مگر اس نے تمہارے سامنے اعتراف کیا ہے۔ تم ماہر نفسیات ہو۔ تم اس کی نفسیاتی کمزوریوں کو سمجھتے ہو۔ یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ اسے ٹرانس میں لا کر کس طرح اس کے اندر کی باتیں اس سے اگلوا سکتے ہو اور ابھی تم نے یہی کیا ہے لیکن کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکے گا۔"

"سرفراز! ہم بچپن کے یار ہیں۔ ہماری دوستی بے مثال ہے۔ یہی دیکھ لو کہ تمہاری بیٹی کے خلاف اتنا بڑا ثبوت میں تمہارے حوالے کررہا ہوں۔ دنیا میں بے شمار ماہرین نفسیات ہیں۔ کوئی بھی دشمنی کرسکتا ہے۔ کوئی بھی ماہر نفسیات تمہاری بیٹی کو ٹرانس میں لاکر اس سے یہ سب کچھ اگلوا سکتا ہے۔ تمہیں بلیک میل کرسکتا ہے اور شیبا کو سزائے موت تک پہنچا سکتا ہے۔"

وہ پریشان ہوکر بولا۔ "اوہ گاڈ! میں کیا کروں؟ تُونے مجھ بے انتہا دولت دی مگر اولاد ایک ہی دی۔ اس اولاد نے میرا سکون برباد کردیا ہے۔ یار زیدی! تم بتاؤ میں کیا کروں؟"

"سب سے پہلے تو یہ کرو کہ بیٹی کی آواز کے اس ٹیپ کو گھر لے جاکر آتشدان میں ڈال دو۔"

"تمہارے کمرے میں بھی آتشدان ہے۔ آؤ وہاں چلتے ہیں۔ شیبا وہیں آجائے گی۔"

ڈاکٹر زیدی نے اپنی کوٹھی کے ایک حصے کو دماغی مریضوں کے لئے وقف کیا تھا۔ اس کے پاس ایسے مریض بھی آتے تھے جو پاگل پن کی حد تک پہنچے ہوئے تھے اور شیبا کی طرح کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جو بظاہر نارمل دکھائی دیتے تھے لیکن زندگی کے کسی کمزور پہلو کے باعث ایب نارمل ہوتے تھے۔ کسی خاص معاملے میں ان کی ذہنی رو بھٹکتی تھی۔ جیسا کہ شیبا کسی سے محبت کرنے اور کسی کو اپنا اور صرف اپنا بنائے رکھنے کے سلسلے میں خودغرض اور جنونی ہو جایا کرتی تھی۔ ڈاکٹر زیدی ایسے مریضوں کو نفسیاتی طریقہ علاج کے مطابق ٹریٹ کیا کرتا تھا۔

وہ دونوں ایک کمرے میں آکر آتش دان کے قریب بیٹھ گئے۔ سرفراز خان اسپول سے آڈیو ٹیپ نکال نکال کر اسے توڑتوڑ کر آتشدان کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالنے لگا اور کہنے لگا۔ "زیدی! تم جانتے ہو۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ اب میری نظروں میں دولت کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ میرا سب سے بڑا اور آخری سرمایہ میری ایک ہی اولاد ہے۔ میری شیبا ہے۔ میرا یہ سرمایہ ڈوب جائے گا تو میں بے انتہا دولت مند ہونے کے باوجود کنگال رہوں گا۔"

"تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ابھی یہ شیبا کے حق میں اچھا ہے کہ وہ واجد کی طرف مائل ہورہی ہے۔ اگر واجد ایک اچھا جیون ساتھی ثابت ہوگا تو شیبا ہمیشہ نارمل رہ کر اس کے ساتھ زندگی گزارتی رہے گی۔"

"گویا واجد ایک ایسا ڈاکٹر ہے۔ جو میری بیٹی کا علاج تمام عمر کرتا رہے گا۔"

"ڈاکٹر تو میں ہوں۔ دوا واجد ہے۔ وہ اپنی محبت اور اپنی تمام توجہ دوا کے طور پر اسے دیتا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آج ہی واجد سے ملاقات کروں گا۔ اس کی پوری ہسٹری معلوم کروں گا۔ پھر اسے ہر قیمت پر اپنی بیٹی کے لئے خرید لوں گا۔"

"خریدنے کی غلطی نہ کرنا۔ ایک بار یہ غلطی شیبا کرچکی ہے اور پھر یہی کرنے والی ہے۔ اس نے کپڑے ایکسپورٹ کرنے والی فیکٹری واجد کی خاطر خریدی ہے اور وہ فیکٹری پیار کی پہلی رشوت کے طور پر اس کے نام کرے گی۔"

"ہوسکتا ہے واجد بہت ضرورت مند ہو۔ زیادہ دولت کمانے کی خاطر شارٹ کٹ راستہ اختیار کرنا چاہتا ہو۔ ایسے جوان قابل قبول ہوتے ہیں۔"

"اگر وہ خود کو فروخت کرے گا تو تمام مناسب اور نامناسب باتیں برداشت کرے گا اور شیبا کا بہترین آئیڈیل شوہر بن کر رہے گا۔"

سرفراز خان اس آڈیو ٹیپ کو جلا کر راکھ کرچکا تھا۔ اب آتشدان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ شعلے مچل رہے تھے، لپک رہے تھے۔ رہ رہ کر بھڑک رہے تھے۔ اس کی بیٹی کی طرح پارا صفت تھے۔ ایک جگہ نہیں ٹھہر رہے تھے۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر خطرناک ارادوں کی طرح رُخ بدل رہے تھے۔

☆-------☆-------☆

شیبا صبح سات بجے اپنے باپ سرفراز خان کے ساتھ ڈاکٹر زیدی کے پاس گئی تھی۔ صبح دس بجے تک ڈاکٹر زیدی کے طریقۂ علاج کے مطابق اس بڑے ہال میں تنہا رہی پھر تقریباً ایک گھنٹے تک آنکھیں بند کئے آرام سے لیٹی رہی۔ اس کے بعد اپنے ڈیڈی اور ڈاکٹر سے رُخصت ہوکر کریبس فیکٹری (کپڑا فیکٹری) میں آئی۔

اب تو دن رات واجد اس کے خیالوں میں رہتا تھا۔ وہ ہر روز ہیڈ آفس کا کام چھوڑ کر واجد کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی خاطر اس فیکٹری میں آیا کرتی تھی۔ اس نے فی الحال اسے اس فیکٹری کا انچارج بنایا تھا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اس فیکٹری میں رہے اور وہاں ملاقات کرنے کا بہانہ ملتا رہے۔

فیکٹری میں آکر پتا چلا وہ موجود نہیں ہے۔ اسے مایوسی ہوئی، ذرا سی جھنجلاہٹ بھی

ہوئی۔ اس نے اس کے موبائل پر رابطہ کیا۔ اس کی آواز سنتے ہی بولی۔ "ہیلو! میں ہوں شیبا۔"

وہ بولا۔ "آپ اپنا نام نہ بتائیں۔ میں آپ کی آواز لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔"

وہ خوش ہوگئی۔ وہ اسے لاکھوں میں نمایاں کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "واجد! تم مجھے آپ نہ کہا کرو۔ تم کہا کرو۔"

"میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔ کہاں آپ اور کہاں میں؟"

"بلندی اور پستی کو نہ دیکھو۔ یہ تو نظر کی بات ہوتی ہے۔ کسی اونچی سطح والے کو نظروں سے گرایا جائے تو وہ حقیر اور قابل نفرت بن جاتا ہے اور کوئی نیچی سطح والا نظروں میں سما جاتا ہے تو اس سے زیادہ محبوب اور بلند مرتبے والا کوئی نہیں ہوتا۔"

"آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت اونچے خیالات رکھتی ہیں۔"

"تم پھر مجھے آپ کہہ رہے ہو۔ کیا میں تم سے ناراض ہو جاؤں؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "ہرگز نہیں۔ آپ مجھ سے ناراض ہوں گی تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گا۔ دیکھئے میں نے پھر بھول سے آپ کہہ دیا۔ دراصل آپ اتنی اسمارٹ اور باوقار ہیں کہ میں تو کیا سب ہی آپ کو بے اختیار آپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ بہرحال میں تمہیں ناراض نہیں ہونے دوں گا۔ اب تو تم خوش ہو؟"

"جو میری بات مانتا ہے۔ میرا ہم مزاج ہوتا ہے۔ میں اس سے ہمیشہ خوش رہتی ہوں۔"

"تم کہاں ہو؟ میں تم سے ملنے یہاں تمہارے ہیڈ آفس آیا ہوا ہوں۔"

"تم میری طرف کھنچے ہوئے گئے ہو اور میں تمہاری طرف یہاں آئی ہوئی ہوں۔"

"یہاں کہاں؟ فشریز میں ہو؟"

"میں یہاں تمہاری کریبس فیکٹری میں ہوں۔"

"میری فیکٹری؟" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "فیکٹری تمہاری ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں اسے اپنی فیکٹری اور اپنا کام سمجھ کر محنت کرتا ہوں۔"

"میرے ساتھ ایسی ہی محنت اور لگن سے رہو گے تو فیکٹری کے مالک بھی بن جاؤ گے۔ میرا انتظار کرو میں آرہی ہوں۔"

وہ اپنا موبائل بند کر کے فیکٹری سے باہر آئی پھر اپنی کار میں بیٹھ کر ہیڈ آفس کی

طرف جانے لگی۔ سوچنے لگی۔ "وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ کیوں اچھا لگتا ہے؟ اس کا قد' اس کی جسامت ایسی ہے کہ سامنے آتا ہے تو پہاڑ جیسا لگتا ہے۔ بڑی ہلکی سی اور گرجتی ہوئی سی آواز ہے۔ دل میں دھک سے لگتی ہے مگر چوٹ نہیں لگتی۔ وہ کم بخت ارمان تو اس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔ میں خواہ مخواہ اپنی جوانی کا ایک بہترین سال اس کے پیچھے برباد کرتی رہی۔"

اس کے ہیڈ آفس کی عمارت تین منزل تھی۔ نیچے سے اوپر تک اس کے دفاتر تھے۔ وہ کار سے اتر کر عمارت میں داخل ہوئی تو سب ہی الرٹ ہوگئے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتی گئی۔ تمام اسٹاف اس کے احترام میں اٹھ کر ادب سے کھڑا ہوتا رہا۔ اس ہیڈ آفس سے لے کر دنیا کے کئی ممالک میں اس کے ڈیڈی کے ہزاروں ماتحت تھے۔ جو اس رئیس زادی کو جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ ہزاروں جھکنے والوں کے سامنے شیبا کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ وہ جیسے ہوا کے دوش پر چلتی یا پرواز کرتی تھی۔

وہ لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر آئی۔ وہاں بھی کئی دفاتر تھے۔ وہاں بھی ادب سے اٹھ کر سلام کرنے والے بے شمار تھے۔ وہاں ایک کمپیوٹر ڈیسک پر واجد جھکا ہوا تھا اور کمپیوٹر آپریٹ کرنے والی لڑکی سے مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ شیبا یہ مسکراتا ہوا منظر دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کوئی دوسرا اس کا ری ایکشن.......... سمجھ سکے۔ وہ فوراً ہی سنبھل کر اپنے دفتری کمرے کی طرف جانے لگی۔ ایسے وقت واجد نے اسے دیکھا پھر اس کی طرف بڑھنے لگا لیکن قریب آنے سے پہلے ہی وہ اپنے دفتری کمرے میں جا چکی تھی۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔

وہ اندر سے بھڑک گئی تھی۔ اس نے یہ بات سوچی بھی نہیں تھی کہ واجد کسی دوسری کے لئے مسکراتا بھی ہو گا۔ جب کہ مسکرانا ایک فطری عمل ہے۔ کسی سے گہری شناسائی نہ ہونے کے باوجود کسی نہ کسی بات پر مسکرایا جا سکتا ہے۔ اس نے انٹرکام پر اپنی سیکرٹری سے کہا۔ "منیجر کو یہاں بھیجنا۔"

اس نے انٹر کام آف کر کے سوچا۔ "مجھے غصے میں نہیں آنا چاہئے۔ میں بھڑکتی ہوں' بہکتی ہوں۔ اسی لئے ڈاکٹر انکل مجھے ایب نارمل کہتے ہیں۔"

وہ خود کو سمجھانے اور پرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ منیجر نے دروازہ کھول کر اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ اس نے کہا۔ "کم ان!"

اس نے اندر آ کر بڑے مؤدبانہ انداز میں اس کے سامنے ایک فائل رکھی پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ شیبا نے پوچھا۔ "کمپیوٹر سیکشن میں کتنی لڑکیاں ہیں؟"

"ایک لڑکی اور تین مرد ہیں۔"

"لڑکی کے بارے میں بتاؤ؟ کیا نام ہے؟ کب سے ملازمت کر رہی ہے؟"

"اس کا نام ثمینہ ہے۔ تین برس پہلے آپ نے اس کا انٹرویو لیا تھا اور اسے ملازمت پر رکھا تھا۔"

وہ ریوالونگ چیئر پر دائیں بائیں ہونے لگی پھر بولی۔ "کیا واجد سے اس کا کوئی رشتہ ہے یا دوستی ہے؟"

"واجد صاحب تو پچھلے دو مہینوں سے یہاں آ رہے ہیں۔ جب سے آپ نے وہ کریبس فیکٹری خریدی ہے۔"

"کیا وہ روز آتا ہے؟"

"کبھی کبھی آتے ہیں۔ ثمینہ سے ملتے ہیں۔ کبھی لنچ کے وقت کبھی چھٹی کے وقت اس کے ساتھ جاتے ہیں۔"

"ثمینہ کی سروس کیسی ہے؟"

"اس کا سروس ریکارڈ بہت اچھا ہے۔ بڑی ذمے داریوں سے فرائض ادا کرتی ہے۔ اس نے ان تین برسوں میں کبھی چھٹی نہیں لی۔ ہمیشہ وقت پر آتی ہے اور وقت پر جاتی ہے۔"

وہ جھنجلا کر بولی۔ "یو شٹ اپ! میں نے اس کا قصیدہ پڑھنے اور سنانے کے لئے تمہیں نہیں بلایا ہے۔ کیا اس میں کوئی خامی نہیں ہے؟ اس کی ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے جسے وجہ بنا کر اسے یہاں سے نکالا جائے؟"

"سوری میڈم! اسے نکالا گیا تو یونین والے ہنگامہ کریں گے۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے منیجر کو دیکھنے لگی۔ انٹر کام کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اس کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف سے لیڈی سیکرٹری کی آواز سنائی دی۔ "میڈیم! مسٹر واجد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "اسے انتظار کرنے کو کہو۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ اس کی باری آئے گی تو اسے یہاں بلایا جائے گا۔"

اس نے انٹر کام کو آف کر دیا پھر منیجر سے بولی۔ "تم واجد کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

وہ بولا۔ "کبھی ان کے بارے میں جاننے کا کچھ موقع نہیں ملا۔ وہ یہاں کبھی کبھی آتے ہیں پھر ثمینہ کے ساتھ چلے جاتے ہیں مگر اتفاق سے مجھے ایک بات معلوم ہو گئی اور وہ یہ کہ واجد صاحب فلرٹ کرتے ہیں۔ ثمینہ کے علاوہ دوسری لڑکیوں سے بھی ان کی دوستی ہے۔"

"کیا تم یقین سے کہہ رہے ہو؟"

"مجھے واجد صاحب کی ایک تصویر ملی ہے' اس تصویر میں وہ ایک عورت کے ساتھ رومانٹک موڈ میں ہیں۔"

"وہ تصویر کہاں ہے؟"

"یہیں۔ میری میز کی دراز میں ہے۔"

"تمہیں وہ تصویر کہاں سے ملی ہے؟"

"واجد صاحب کمپیوٹر کے پاس کھڑے ہوئے ثمینہ سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے باتیں کرتے وقت اپنے پرس میں سے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر ثمینہ کو دیا۔ وہ نوٹ نکالتے وقت ایک تصویر فرش پر گر پڑی۔ وہ جلدی میں تھے۔ ثمینہ کو رقم دے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے وہ تصویر وہاں سے اٹھالی تھی۔"

"میں وہ تصویر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ شیبا اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ کوئی چیز دل سے پسند آ جائے اور نہ ملے تو اسے ہر قیمت پر خریدا جا سکتا ہے لیکن خریدنے سے پہلے دوسرے اسے چرا کر یا چھین کر لے جانے لگیں تو غصہ اس چیز پر نہیں آتا ہے۔ چھیننے والوں پر آتا ہے۔

وہ سوچنے لگی۔ "مجھے خواہ مخواہ واجد پر غصہ آ رہا ہے۔ غصہ تو ثمینہ پر آنا چاہئے۔ غصہ اس عورت پر آنا چاہئے جس نے واجد کے ساتھ تصویر اتروائی ہے۔"

وہ واجد کی مخالفت میں نہیں' حمایت میں سوچ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا' اس خوبرو جوان کو دوسری عورتیں چھیننے جھپٹنے میں لگی ہیں۔ جب وہ واجد کو اپنا لے گی۔ اس سے شادی کر لے گی تو ساری مکھیاں اس مٹھاس پر سے اڑ جائیں گی۔

اس کے موبائل سے بزر کی آواز سنائی دی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر پوچھا۔ "ہیلو؟"

دوسری طرف سے اس کے ڈیڈی سرفراز خان کی آواز سنای دی۔ "ہیلو شیبا! آفس میں ہو؟"

"جی ہاں۔ واجد کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی ہوں۔"

"بیٹی! تمہاری دماغی صحت مندی اور تمہارے بہترین مستقبل کے لئے میں بھی معلومات حاصل کر رہا ہوں۔ واجد ایک اچھا اور سلجھے ہوئے ذہن کا جوان ہے۔"

"کیا خاک سلجھا ہوا ذہن ہے۔ خود کو ہینڈسم ہیرو سمجھتا ہے۔ نہ جانے کتنی عورتوں سے عشق کرتا پھرتا ہے۔"

"تمہاری معلومات غلط ہیں۔"

"غلط نہیں ہیں۔ یہاں ایک ایسی تصویر ہے۔ جس میں وہ ایک عورت سے عشق فرما رہا ہے۔"

"بیٹی وہ عورت کوئی غیر نہیں ہے۔ اس کی بیوی ہے۔"

وہ فون پر چیخ کر بولی۔ "اس کی بیوی؟ وہ شادی شدہ ہے؟"

اس نے شٹ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اسے صوفے پر پھینک دیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ شادی شدہ ہو گا۔ وہ واجد پر منڈلانے والی مکھیوں کو اڑا سکتی تھی لیکن ایک بیوی کو اس سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔

مگر یہ ناممکن تو نہیں تھا؟ کیا میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے؟ کیا وہ ایک دوسرے کو طلاق دیتے اور لیتے نہیں ہیں؟ ایسا ہو سکتا ہے۔ واجد چاہے تو ایک رئیس زادی کو جیتنے کے لئے اپنی بیوی کو اور اپنے رشتے داروں کو چھوڑ سکتا ہے۔

منیجر اجازت لے کر اندر آیا پھر ایک تصویر اس کی طرف بڑھائی' شیبا نے تصویر لے کر دیکھی۔ تصویر میں واجد کے ساتھ ایک عورت کو دیکھ کر منہ بنایا۔ دل میں کہا۔ "نہ میری طرح خوبصورت ہے۔ نہ اسمارٹ ہے۔ میں اسے دیکھ لوں گی۔" اس نے منیجر سے کہا۔ "تم جا سکتے ہو۔ واجد کو یہاں بھیج دو۔"

وہ چلا گیا۔ ایک منٹ کے اندر ہی واجد آیا۔ وہ ریوالونگ چیئر پر جھولتے ہوئے بولی۔

"میں تم سے ملنے فیکٹری گئی تھی۔ تم یہاں آ گئے۔ کیا یہاں کشش زیادہ ہے؟"

"میرے لئے صرف اپنے کاروبار میں کشش ہے۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ بننا چاہتا ہوں۔ یہاں بھی کاروباری سلسلے میں آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔"

واجد نے اسے آپ کہا۔ اس نے سوچا۔ "ابھی آپ ہی کہنے دو۔ اسے اپنی اوقات میں رہنے دو۔" اس نے اس کے سامنے میز پر تصویر پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم کمپیوٹر سیکشن میں یہ تصویر بھول کر چلے گئے تھے۔"

اس نے تصویر کو اٹھا کر دیکھا پھر کہا۔ "میں اس تصویر کو اپنے گھر میں اور فیکٹری میں ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ آپ کو کیسے ملی؟"

اس نے پوچھا۔ "تمہارے ساتھ یہ عورت کون ہے؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "میری بیوی۔"

شیبا کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کوئی عورت پہلے ہی اسے جیت چکی تھی۔ وہ خود کو سمجھانے لگی۔ "کوئی بات نہیں۔ میں جیتنے والوں کو شکست دینا اور ان سے بازی جیت لینا جانتی ہوں۔"

وہ پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "یہ مجھے تنہا رہنے کے لئے چھوڑ گئی ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا یہ تمہیں چھوڑ کر بھاگ گئی ہے؟"

"نہیں۔ یہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

وہ خوشی کے مارے ریوالونگ چیئر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اسے جیسے دنیا کی ساری دولت مل گئی ہو۔ وہ تقریباً چیخ کر بولی۔ "یہ مر چکی ہے؟ تم سچ کہہ رہے ہو نا؟ پھر ایک بار بولو یہ مر چکی ہے۔"

وہ حیرانی سے شیبا کو دیکھ رہا تھا۔ شیبا کی مسرتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ وہ بولا۔ "ہاں' بے چاری بہت بیمار تھی۔ شاید میں صحیح وقت پر صحیح علاج نہ کرا سکا۔ ایسے وقت سب یہی کہتے ہیں کہ موت آئی تھی مر گئی۔ میں بھی یہی کہتا ہوں۔"

وہ قریب آتے ہوئے بولی۔ "تم کھڑے کیوں ہو بیٹھو۔ میں بھی کیسی باؤلی ہوں۔ تم سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ ٹھنڈا پیو گے یا گرم؟ میں تو ٹھنڈا پیوں گی۔ کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ جو چاہیں پلا دیں۔"

"تم پھر مجھے آپ کہنے لگے۔"

"وہ۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ آپ کا آفس ہے۔ میں تم کہوں گا تو لوگ کیا

سوچیں گے؟"

"میں لوگوں کی پروا نہیں کرتی۔ جو فیصلہ کرتی ہوں اسی کے مطابق زندگی گزارتی ہوں۔"

اس نے انٹرکام کے ذریعے بنانا جوس کا آرڈر دیا پھر اس سے پوچھا۔ "تمہاری بیوی کا انتقال کب ہوا؟"

"دو برس پہلے ہوا تھا۔"

"تب سے تم تنہا ہو' دوسری شادی کیوں نہیں کی؟"

"میں نے اپنی ساری توجہ کاروبار پر لگائی ہے۔ فی الحال گھریلو زندگی کا پابند نہیں رہنا چاہتا۔ گھر والے ضد کرتے رہتے ہیں کہ مجھے اپنے لئے نہ سہی اپنے بچے کے لئے شادی کرنی چاہئے۔"

"بچہ؟ تمہارا کوئی بچہ بھی ہے؟"

"ایک بیٹا ہے۔ چھ برس کا ہے میں اسے پوری طرح توجہ نہیں دے پاتا ہوں۔ اب سوچتا ہوں اس کی باقاعدہ تعلیم اور پرورش میری ذمے داری ہے۔"

وہ اس کی باتیں سن رہی تھی اور ناگواری سے منہ بنا رہی تھی۔ "یہ کمبخت بچہ کہاں سے آگیا؟ میں پیار کرنے لگتی ہوں تب کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا کانٹا' چبھنے لگتا ہے۔ وہ بچہ چھوٹا ہی سہی مگر چبھتا رہے گا۔"

اس نے پوچھا۔ "تم تو یہاں تنہا رہتے ہو۔ میں نے تمہارے بیٹے کو کبھی تمہارے ساتھ نہیں دیکھا۔"

"میں دن رات مصروفیات کے باعث فشریز کے ایک کاٹیج میں رہتا ہوں۔ ہفتے میں ایک دن کے لئے بیٹے سے ملنے جاتا ہوں۔ اس کے ساتھ پورا ایک دن گزارتا ہوں۔ وہ اپنے نانا اور نانی کے پاس رہتا ہے۔"

ایک ملازم ٹرے میں جوس لے آیا۔ ان دونوں کے سامنے دو گلاس رکھ کر چلا گیا۔

شیبا نے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پیا۔ کلیجے میں ٹھنڈک پہنچی کہ واجد بیٹے کے ساتھ نہیں رہتا ہے۔ بیٹے کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

اس نے دوسرا گھونٹ پی کر سوچا۔ "یہ ہینڈسم میری زندگی میں آئے گا تو دوسرے اس کی زندگی سے نکل جائیں گے۔ نکلنے والوں میں بیٹا بھی ہو گا اور میں جانتی ہوں وہ کیسے

نکالے جائیں گے۔"

اس کے اندر یہ بات پیدا ہوئی کہ وہ پھر الٹی سیدھی حرکتیں کرے گی تو ذہنی مریضہ کہلائے گی۔ اپنے طور پر کچھ کرنے سے بہتر ہے کہ واجد سے معاملات طے کرے۔ اگر وہ اس سے شادی کرے گا تو اس کے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ یا امریکا کے کسی شہر میں بھیج دیا جائے گا۔ اس بچے کو ایک طویل عرصے تک دور رکھنے کی یہ ایک معقول وجہ ہوگی۔

وہ بولی۔ "کیا ابھی تم کاروبار کے سلسلے میں باتیں کرنے آئے ہو؟"

"میں یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر ایک اور بوٹ خریدی جائے تو زیادہ کیکڑے حاصل ہوں گے۔ ہم زیادہ مال ایکسپورٹ کر سکیں گے۔ زیادہ منافع حاصل کر سکیں گے۔"

وہ کاروبار کی باتیں کر رہا تھا مگر اس وقت شیبا کی دلچسپیوں کا مرکز صرف وہ باتیں کرنے والا تھا پھر اسے کچھ یاد آیا۔ وہ بولی۔ "تم یہاں اکثر ثمینہ سے ملنے آتے ہو۔ اسے کب سے جانتے ہو؟"

"جہاں میرا سسرال ہے وہیں سامنے والے مکان میں ثمینہ رہتی ہے۔"

"تم سے اچھی خاصی دوستی ہے۔"

"وہ بڑی ملنسار ہے۔ ہر ایک سے ملتی ہے اور ہنستی بولتی رہتی ہے۔ میرے سسرال میں ایسا آنا جانا ہے۔ جیسے وہ اسی گھر کی فرد ہو۔ یہاں دفتر سے جانے کے بعد میرے بیٹے وکی کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ اسے ٹیوشن پڑھاتی ہے۔"

شیبا نے دل ہی دل میں کہا۔ "بہت چال باز ہے۔ بیٹے کے ذریعے باپ کو پھانس رہی ہے۔ واجد سے رقم بھی وصول کرتی ہے۔ مینجر کہہ رہا تھا کہ واجد نے ایک دن اپنے پرس سے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر اسے دیا تھا۔"

اس نے واجد سے کہا۔ "ملنسار ہونا اور بات ہے۔ بے تکلف ہونا اور بات ہے۔ وہ تم سے بے تکلف ہے۔ تم سے اچھی خاصی رقمیں وصول کرتی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ وہ بہت خوددار ہے۔ کبھی کسی کا احسان نہیں لیتی۔"

"مینجر کہہ رہا تھا کہ اس نے اسی آفس میں تم سے ایک ہزار روپے لئے تھے۔"

واجد نے کچھ سوچا پھر کہا۔ "اوہ.......... اچھا۔ یاد آیا۔ اس نے وکی کے لئے اسکول کی فیس اور کتابوں کے لئے ایک ہزار روپے لئے تھے۔"

"کیا تم اس سے بے تکلف نہیں ہو؟ اس کے ساتھ لنچ کرنے جاتے ہو۔ کبھی یہاں چھٹی کے وقت آتے ہو تو وہ آفس سے تمہارے ساتھ کہیں جاتی ہے۔"

"وہ گھر سے آفس اور آفس سے گھر جاتی ہے۔ کبھی کسی تیسری جگہ نہیں جاتی۔"

"میں اتنی دیر سے تمہارے اندر کی باتیں کرید رہی ہوں۔ اب تک تمہاری باتوں سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ تم ثمینہ سے یا کسی اور سے دلچسپی نہیں لے رہے ہو۔ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جی؟" اس نے چونک کر شیبا کو دیکھا۔ "آپ؟ میرا مطلب ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟ شاید میں نے غلط سنا ہے۔"

"تم نے وہی سنا ہے جو میں نے کہا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تم میری طرف مائل ہوتے۔ مجھ سے دلچسپی ظاہر کرتے مگر میں خود ہی تم سے کہنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔"

وہ چپ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی باتیں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ یعنی سمجھ تو رہا ہوں مگر یقین نہیں آ رہا ہے کہ آپ۔ آپ.........."

"یہ تم نے آپ آپ کی کیا رٹ لگائی ہے؟"

"آپ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہیں۔ آپ کی شخصیت میں اتنا رعب اور دبدبہ ہے کہ میں بے اختیار آپ کہنے لگتا ہوں اور آپ مجھے ایسی بات کہہ رہی ہیں جو میرے برابر کی عورت کہہ سکتی ہے۔"

"میں عورت نہیں ہوں، لڑکی ہوں۔"

"وہ.......... میں نے.......... سنا تھا کہ آپ کی شادی ہوئی تھی۔ آپ کے شوہر نے خودکشی کر لی۔ پتا نہیں کہاں تک درست ہے۔ میں نے صرف سنا ہے۔"

"تم نے سنا ہے تو کیا ہوا؟ کیا شادی کے بعد اور بیوہ ہونے کے بعد میں بوڑھی ہو گئی ہوں؟ مجھے عورت کہہ رہے ہو۔ کیا مجھ میں ایک لڑکی کا نکھار اور دلکشی نہیں ہے؟"

وہ ذرا گھبرا کر بولا۔ "ہے۔ بہت ہے۔ بہت بہت زیادہ ہے۔"

"کیا بہت زیادہ ہے؟"

"نکھار ہے، دلکشی ہے۔ آپ کو دیکھ کر یہ نہیں لگتا کہ آپ کی شادی ہوئی تھی۔"

وہ ذرا سخت لہجے میں بولی۔ "میری پہلی شادی کی بات نہ کرو۔"

اسے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک شادی کے بعد سیکنڈ ہینڈ ہو گئی ہے۔

اس نے حقیقت سے انکار کیا۔ نہیں۔ سچ تو یہ ہے چاندی کے برتن میں رکھے ہوئے سونے کے بسکٹ کا بھاؤ کبھی کم نہیں ہوتا ہے۔ سونے کا بھاؤ کبھی گرتا نہیں ہے۔ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور یہ تسلیم کر رہا ہے کہ اب بھی میری قدر و قیمت ہے۔

وہ بولی۔ "چپ کیوں ہو؟ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کے جواب میں تمہیں کچھ کہنا چاہئے۔"

"میں یہی سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا کہنا چاہئے۔ آپ آسمان ہیں، میں زمین ہوں۔ زمین آسمان کو دیکھ سکتی ہے مگر اس کو چھو نہیں سکتی۔"

"میرے سامنے یہ فلمی مکالمے نہ بولو۔ ایک عورت اپنی زبان سے محبت کا اظہار نہیں کرتی ہے۔ اپنی خاموشی سے بہت کچھ کہہ دیتی ہے مگر تم خاموشی کی زبان نہیں سمجھ رہے ہو۔ مجھے بولنے پر مجبور کر رہے ہو۔ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ دل و جان سے چاہتی ہوں، تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ جو چاہو مجھ سے مانگ لو۔ میری ساری دولت مانگو گے۔ میں تمہیں سب کچھ دے دوں گی۔"

"محبت میں مانگا نہیں جاتا۔ ایک دوسرے کی رضامندی سے خود بخود پیار ملتا رہتا ہے۔"

"کیا تم سے رضامندی کے لئے تین بار تم سے قبول کرانا ہوگا؟ تم اتنے بے حس کیوں ہو؟ میں نے جتنی بڑی آفر دی ہے اسے سنتے ہی تمہیں خوشی سے اچھل پڑنا چاہئے تھا۔"

"میں بہت خوش نصیب ہوں کہ آپ نے مجھے اتنی بڑی آفر دی مگر اچانک اتنی بڑی خوشی مل جائے تو آدمی بدحواس ہو جاتا ہے۔"

"ہاں، تمہاری موجودہ سماجی پوزیشن دیکھتے ہوئے میں تسلیم کرتی ہوں کہ آدمی کو اپنی حیثیت سے زیادہ خوشیاں ملتی ہیں تو وہ بدحواس ہو جاتا ہے۔"

وہ بولا۔ "سچ تو یہی ہے۔ میں اپنے حواس میں نہیں ہوں۔ مجھے سنبھلنے کا، کچھ سمجھنے کا موقع دیں، میں پھر کبھی آپ سے ملوں گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بولی۔ "کیا تم جا رہے ہو؟"

"آپ کی باتوں نے مجھے چکرا دیا ہے۔ میں کچھ وقت تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ابھی جاؤ کل ملاقات ہوگی۔"

شیبا نے اٹھ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے مصافحہ کیا پھر وہ بولی۔ "میں نے پہلی بار اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیا ہے۔ میں چاہوں گی کہ ان ہاتھوں کی طرح ہمارے دل اور دماغ بھی ہمیشہ کے لئے مل جائیں۔ آئی وِش یُو گڈلک۔"

شیبا نے ہاتھ چھوڑا۔ وہ چلا گیا۔ واجد کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یہ سوچ کر اپنی توہین محسوس کرتی کہ اس نے محبت کا جواب فوراً ہی محبت سے نہیں دیا ہے یا تو بدحواس ہوگیا ہے یا پھر اسے ٹال کر چلا گیا ہے۔

مگر کہاں جائے گا؟ دنیا کے بازار میں کوئی ایسی مہنگی اور نایاب چیز نہیں ہے جسے وہ خرید نہ سکے۔ کسی وجہ سے خرید نہ سکے تو وہ چھیننے کا ہنر بھی جانتی تھی۔ تجارت میں لین دین ہوتا ہے۔ اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے لیکن لین دین سے پہلے نقصان وہ پہلوؤں پر نظر رکھی جاتی ہے۔

فی الوقت اسے ثمینہ کی طرف سے نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس حد تک معلوم ہوچکا تھا کہ دونوں میں بڑی بے تکلفی ہے۔ ساتھ لنچ کرتے ہیں اور ساتھ کہیں آتے جاتے بھی ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ثمینہ کو چاہتا ہو اور یہ چاہت ظاہر نہ کررہا ہو؟

شیبا نے سوچا۔ "وہ چھپا رہا ہے لیکن شاید ثمینہ چھپا نہیں پائے گی۔ اسے ٹٹولنا چاہئے۔ میں اس کے اندر کی بات اس سے اگلوالوں گی۔"

اس نے انٹرکام کے ذریعے سیکرٹری سے کہا۔ "ثمینہ کو یہاں بھیج دو۔"

"میڈم! وہ ابھی مسٹر واجد کے ساتھ گئی ہے۔"

شیبا کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے پوچھا۔ "کہاں گئی ہے؟ کیا وہ آفس کا کام چھوڑ کر اسی طرح چلی جاتی ہے؟"

"نو میڈم! یہ لنچ آور ہے۔ وہ لنچ کے لئے جایا کرتی ہے۔"

اس نے انٹرکام کو آف کیا۔ جھنجلا کر سوچنے لگی۔ "وہ جہنم میں جائے لیکن واجد ایسے وقت اس کے ساتھ کیوں گیا ہے جبکہ اسے تنہا رہ کر میری آفر پر خوشی سے سوچنا چاہئے تھا اور خود کو خوش قسمت سمجھنا چاہئے تھا لیکن جو وقت میرے بارے میں سوچنے کے لئے ہے' وہ قیمتی وقت ثمینہ کو دے رہا ہے۔"

یہ یقین ہورہا تھا کہ وہ ثمینہ کو چاہتا ہے مگر ظاہر نہیں کررہا ہے۔ شاید اس کشمکش

میں ہے کہ ثمینہ کو ٹھکرا کر ایک رئیس زادی کی آفر قبول کرنا چاہئے یا نہیں۔

وہ ایسے وقت انگاروں پر لوٹنے لگتی تھی۔ اس کے اندر یہ سوالات چیخ رہے تھے کہ ثمینہ کیوں ہے؟ وہ نہ ہوتی تو واجد اسے ٹال کر نہ جاتا۔ اس کے اور ثمینہ کے درمیان کشمکش میں مبتلا نہ رہتا۔ اگر ثمینہ نہ رہے تو اس کی مشکل آسان ہوجائے گی۔ وہ اسی کے آگے جھکنے لگے گا۔

وہ بے چین ہوگئی تھی۔ سکون سے آفس میں نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ وہاں سے نکل کر کار میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی میں آگئی۔ اس کے دماغ میں صرف ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی کہ کچرا صاف کرے گی۔ اس کے پیار کے راستے میں جو گندگی آئے گی اسے اٹھا کر گٹر میں پھینک دے گی۔

وہ اپنے بیڈروم میں آکر اپنی سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس سنگھار میز میں مختلف خانے بنے ہوئے تھے۔ کسی خانے میں مختلف کمپنیوں کی فیس کریم رکھی ہوئی تھیں۔ کسی خانے میں مختلف شیڈز کی درجنوں لپ اسٹکس رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سب مہنگے اور امپورٹڈ آئٹم تھے۔ عام عورتوں کو نصیب نہیں ہوسکتے تھے۔

اس نے لپ اسٹک کے چھ مختلف شیڈز نکالے' انہیں سنگھار میز پر رکھا۔ پھر الماری کے پاس آئی۔ الماری کے اندر ایک چھوٹا سا آئیرن سیف تھا۔ اس نے اسے کھولا۔ سیف کے اندر بہت ہی نایاب اور بیش قیمت ہیرے اور موتی رکھے ہوئے تھے۔ سونے کی صندوقچی کے اوپر ایک پستول رکھا ہوا تھا۔ اس نے پستول کو ہٹا کر صندوقچی کھولی۔ اس کے اندر ایک چاقو رکھا ہوا تھا۔ چاقو کا دستہ سونے کا تھا۔ اس دستے پر چھوٹے چھوٹے ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب خنجر تھا۔ اس سے کسی کو قتل کرنا ضروری نہیں تھا۔ اسے شوپیس کے طور پر رکھا گیا تھا۔

اسی صندوقچی میں ایک چھوٹی سی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ اس شیشی پر پوائزن لکھا ہوا تھا۔ گویا اس سیف میں تمام کا تمام ہلاکت کا سامان رکھا ہوا تھا۔ پستول' خنجر' زہر اور وہ بیش قیمت ہیرے جنہیں چاٹنے سے موت آسکتی تھی۔ وہ نارمل رہا کرتی تھی لیکن اس کے خفیہ سیف میں ایب نارمل بنانے کا سامان رہا کرتا تھا۔

وہ چھوٹی سی شیشی کو اٹھا کر سنگھار میز کے پاس آئی۔ اس نے شیشی کو کھولا پھر ایک ایک لپ اسٹک کے کیپ کو کھول کر زہر کے دو دو قطرے ہر لپ اسٹک میں ٹپکانے لگی۔

☆------☆------☆

ثمینہ اور واجد ایک ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ثمینہ نے کہا۔ "میں نے پیٹ بھر کر کھایا ہے مگر تم نے اب تک آدھی روٹی بھی نہیں کھائی ہے۔"

اس نے کہا۔ "میں تمہیں ساری باتیں بتا چکا ہوں پھر بھی تم میری پریشانی نہیں سمجھ رہی ہو۔"

"میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ ایک رئیس اعظم کی بیٹی تمہارے عشق میں گرفتار ہے اور وہ تم سے اپنی محبت کا جواب محبت سے طلب کر رہی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیسی محبت؟ اس کی بول چال سے اس کے ہر انداز سے غرور ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے محبت کا اظہار بھی ایسے کیا جیسے کاروباری لین دین کر رہی ہو۔"

ثمینہ نے پوچھا۔ "اگر وہ کاروباری انداز میں نہ بولتی تو کیا تم اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتے؟"

"کیسی بات کر رہی ہو؟ تم جانتی ہو میں شادی کروں گا تو آمنہ سے کروں گا۔ وہ میری سالی ہے۔ میری مرحومہ بیوی کی بہن ہے۔ وہ میرے اور اپنی بہن کے بیٹے کو ایک سگی ماں کا پیار دے گی۔"

"میں جانتی ہوں۔ تم اپنے بیٹے سے بہت پیار کرتے ہو۔ اس کی تعلیم و تربیت کی خاطر دوسری شادی کرنے والے ہو تو پھر کر کیوں نہیں لیتے؟ اتنی دیر کیوں کر رہے ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں۔ میرے پاس ایک بوٹ ہے۔ اگر دوسری بوٹ خرید لوں گا تو منافع زیادہ ہوتا رہے گا۔ میں دوسری بوٹ خریدنے کے بعد ہی شادی کروں گا۔"

"تو پھر میڈم سے صاف صاف کہہ دو کہ تم اپنے بیٹے کی اطمینان بخش پرورش کے لئے آمنہ سے شادی کرو گے۔"

"یہ تو میں ابھی کہہ دیتا لیکن بولنے سے پہلے تولنا چاہئے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ وہ رئیس زادی میرا انکار برداشت نہیں کرے گی۔ اپنی انسلٹ محسوس کرے گی اور کاروباری معاملات میں جو سہولتیں دے رہی ہے، وہ تمام سہولتیں چھین لے گی۔"

"ہاں ایسا وہ کر سکتی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تم پر جو مہربانیاں کر رہی ہے اس کے پیچھے ضرور کوئی بات ہے۔ اب ایسی حالت میں تم کیا سوچ رہے ہو؟ کیا فیصلہ کرنے والے ہو؟"

"ابھی تو الجھا ہوا ہوں لیکن اپنے بیٹے کی بھلائی کے لئے یہی بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ آمنہ اس کی سگی خالہ ہے۔ میں اس سے شادی کروں گا تو وہ بہن کے بیٹے کو سگی ماں کا پیار دے گی۔"

"یہی دانشمندی ہے۔ اپنی اولاد کے حق میں فیصلہ کرنا چاہئے۔ ابھی جاؤ وہ دفتر میں ہوگی۔ اس سے صاف صاف کہہ دو کہ تم آمنہ سے شادی کرنے والے ہو۔"

"ابھی نہیں کل۔ اس نے کل مجھ سے ملاقات کرنے کو کہا ہے۔ میں اسے اپنی مجبوریاں سمجھاؤں گا۔ شاید اس کی سمجھ میں بات آجائے اور وہ مجھے کاروباری سہولتوں سے محروم نہ کرے۔"

"بڑے لوگوں کی بگڑی ہوئی اولادیں کسی کی مجبوریاں نہیں سمجھتیں۔ اپنی من مانی کرتی ہیں۔ اس بات کے لئے ذہنی طور پر آمادہ رہو کہ وہ تمہیں نقصان پہنچائے گی۔"

"اب اس کی باتیں چھوڑو۔ جو ہوگا کل دیکھا جائے گا۔ یہ بتاؤ میرا وکی پڑھنے لکھنے میں کیسا ہے؟"

"بہت ذہین ہے۔ تم نے پچھلی بار اس کی مارکس شیٹ دیکھی تھی۔ اس بار وہ کلاس میں فرسٹ آئے گا۔"

"یہ سب تمہاری محنت اور توجہ کی وجہ سے ہے۔ تم اس کے ساتھ بہت وقت گزارتی ہو۔"

"ڈیوٹی کے بعد میرا کوئی اور کام نہیں رہتا۔ گھر میں دل نہیں لگتا۔ اس لئے وکی کے پاس چلی جاتی ہوں۔ اسے صرف پڑھاتی لکھاتی نہیں ہوں۔ اس کے ساتھ ٹی وی دیکھتی ہوں اور انڈور گیمز کھیلتی ہوں۔"

"تم اسے اتنی محبت اور توجہ دیتی ہو۔ کیوں دیتی ہو؟ یہ سوال میرے ذہن میں اکثر پیدا ہوتا ہے۔"

وہ اس سے نظریں چرا کر سر جھکا کر بولی۔ "کہہ تو رہی ہوں۔ آفس ڈیوٹی کے بعد فری رہتی ہوں اس لئے اپنا باقی وقت تمہارے بیٹے کو دیتی رہتی ہوں۔"

واجد نے اس کی جھکی ہوئی نظروں کو دیکھا۔ اس کے بولنے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بات بنا رہی ہے۔ ورنہ بات کچھ اور ہے۔

وہ اپنی جگہ مجبور تھا۔ آمنہ سے رشتے کی بات ہو چکی تھی۔ ورنہ اسے تو اپنے بیٹے

کے لئے ایک ماں کی ضرورت تھی۔ ثمینہ بھی اس کی دلہن بن کر وکی کی ماں بن سکتی تھی مگر دیر ہو چکی تھی۔

وہ دونوں کھانے کے بعد ریسٹوران سے باہر آ گئے۔ سڑک پار کر کے دفتری عمارت کے سامنے پہنچ کر واجد نے کہا۔ "میں کل کسی وقت تم سے ملوں گا۔ تمہیں بتاؤں گا کہ شیبا کے ساتھ میری کیا باتیں ہوئی ہیں۔"

ثمینہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر سر جھکا کر اس سے کہا۔ "میں جانتی ہوں، تم اپنے بیٹے کی خاطر ایک دولت مند عورت کو ٹھکرا دو گے۔ شیبا تو کیا کسی بھی عورت کو آمنہ پر ترجیح نہیں دو گے۔ تمہارے خیال میں صرف آمنہ ہی تمہارے بیٹے کو ماں کا پیار دے سکے گی۔ اچھا چلتی ہوں۔"

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے چلتی ہوئی اس عمارت میں داخل ہو گئی۔ لنچ کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی کمپیوٹر ڈیسک پر آ گئی۔ لنچ سے پہلے چھوڑا ہوا ادھورا کام مکمل کرنے لگی۔

شیبا ایک گھنٹے بعد وہاں واپس آئی۔ اس نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دور بیٹھی ہوئی ثمینہ کو دیکھا پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر دائیں بائیں گھومتی رہی اور سوچتی رہی پھر اس نے انٹرکام پر لیڈی سیکرٹری سے کہا کہ وہ ثمینہ کو بھیج دے۔

ایک منٹ کے اندر ہی ثمینہ نے آ کر اسے سلام کیا۔ وہ بولی۔ "آؤ۔ بیٹھو۔"

ثمینہ کو حیرانی ہوئی کیونکہ وہ اپنے دفتر میں کام کرنے والے بڑے بڑے عہدیداروں کو بھی اپنے سامنے کھڑا رکھتی تھی۔ کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

شیبا نے کہا۔ "میں نے تمہارا سروس ریکارڈ دیکھا ہے۔ ایکسیلنٹ ہے۔ بڑی ذمے داریوں سے اپنے فرائض ادا کرتی ہو۔ اسی لئے تمہیں بیٹھنے کو کہہ رہی ہوں۔"

وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی بیٹھ گئی۔ شیبا اپنے ہینڈ بیگ میں سے چھ عدد لپ اسٹک نکالتی ہوئی انہیں اپنے سامنے میز پر رکھنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا واجد سے پرانی جان پہچان ہے؟"

نہیں۔ میرا گھرانہ ان کے سسرال کے سامنے ہے۔ میں ان کے بیٹے وکی کو ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔"

اس نے ایک لپ اسٹک کے کیپ کو کھول کر پوچھا۔ "یہ پنک شیڈ کیسا ہے؟"

"بہت اچھا ہے۔ اس کی پیکنگ اور فنشنگ بہت عمدہ ہے۔ میں نے یہاں کسی دکان میں نہیں دیکھا۔"

وہ ایک ایک لپ اسٹک کا کیپ کھول کر الگ کر رہی تھی۔ ثمینہ بڑے شوق سے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں پیرس جاتی ہوں تو کاسمیٹکس کا ایسا سامان لاتی ہوں جو یہاں بہت کم عورتوں کے پاس ہوتا ہے۔ بائی دی وے تم کون سا شیڈ استعمال کرتی ہو؟ ابھی تو تمہارے ہونٹ پنک دکھائی دے رہے ہیں۔"

"میں ہمیشہ یہی پنک شیڈ استعمال کرتی ہوں۔"

"کیا یہ تمہاری پسند ہے یا کسی نے تمہارے کانوں میں کہا ہے کہ اسے گلابی ہونٹ اچھے لگتے ہیں؟"

ثمینہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔ شیبا نے دل ہی دل میں کہا۔ "میں خوب سمجھتی ہوں۔ واجد کو یہ شیڈ پسند ہو گا اسی لئے اپنے ہونٹوں کو گلابی رکھتی ہے۔"

اس نے پنک کلر کی لپ اسٹک کو ثمینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو۔ یہ تمہاری پسند کا شیڈ ہے بلکہ تمہاری نہیں کسی اور کی پسند تمہارے ہونٹوں پر کھلتی رہتی ہے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میڈم! یہ......... یہ آپ مجھے دے رہی ہیں؟ یہ تو بہت مہنگی ہے۔"

"مہنگی تمہارے لئے ہے۔ میرے لئے نہیں ہے۔ میں نے تمہارا سروس ریکارڈ دیکھ کر سوچا کہ تمہیں انعام دیا جائے، تمہاری تنخواہ بڑھائی جائے۔ اسی ماہ سے تمہاری تنخواہ بڑھ جائے گی اور یہ لپ اسٹک انعام کے طور پر ہے۔"

ثمینہ اس لپ اسٹک کو لیتے ہوئے بولی۔ "تھینک یو میڈم۔ یہ انعام ہے۔ میں بڑے فخر سے لے رہی ہوں۔"

"اس انعام کے صلے میں میری ایک شرط ہے۔ اس لپ اسٹک کا ذکر ابھی کسی سے نہ کرنا۔ کل سب کو تنخواہیں دی جائیں گی۔ اس وقت اعلان کیا جائے گا کہ تمہارے بہترین سروس ریکارڈ کے پیش نظر تمہاری تنخواہ بڑھائی گئی ہے۔ کل تم یہ لپ اسٹک لگا کر آؤ گی پھر فخر سے سب ہی کو بتاؤ گی کہ میں نے تمہیں یہ انعام دیا ہے۔"

"آل رائٹ میڈم۔ میں ابھی کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ آپ کے حکم کے مطابق یہ انعام کل ہی سب کو دکھاؤں گی۔"

شیبا نے دوسری لپ اسٹکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اور کوئی شیڈ پسند ہے تو اس میں سے لے سکتی ہو۔"

"تھینک یو میڈم۔ بس یہی ایک کافی ہے۔ آپ نے میری تنخواہ بڑھائی ہے۔ میرے گھر والے بہت خوش ہوں گے۔"

"تم تنخواہ بڑھنے کی خوش خبری گھر والوں کو سنا سکتی ہو مگر اس لپ اسٹک کا ذکر گھر والوں سے بھی نہ کرنا۔ پہلے اسے استعمال کرو پھر جسے چاہو اسے اپنے گلابی ہونٹ دکھاؤ اور اس انعام پر فخر کرو۔ اچھا اب تم جا سکتی ہو۔"

وہ پھر ایک بار شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شیبا نے تمام لپ اسٹکس کو سمیٹ کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھا پھر وہاں سے اٹھ کر ہینڈ بیگ لے کر باہر آئی۔ اپنی کار میں بیٹھ کر جانے لگی۔ جتنی زہر آلودہ لپ اسٹک اس کے پاس رہ گئی تھیں' وہ انہیں کسی گٹر میں پھینک دینا چاہتی تھی تاکہ یہ ثبوت نہ رہے کہ وہ ایسی کسی کاسمیٹکس کمپنی کی لپ اسٹکس استعمال کرتی ہے۔

ثمینہ آفس ٹائم کے بعد اپنے گھر آئی۔ اپنے والدین کو خوش خبری سنائی کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوگیا ہے پھر اس نے سوچا انعام میں ملنے والی لپ اسٹک بھی اپنے والدین کو دکھائے۔ اگرچہ شیبا نے منع کیا تھا۔

"اس نے کیوں منع کیا ہے؟" ثمینہ نے سوچا۔ "یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کل دفتر میں میری اضافی تنخواہ کا اعلان ہوگا تو اس کے ساتھ میں میڈم کا دیا ہوا یہ تحفہ بھی وہاں سب کو دکھاؤں گی لیکن گھر والوں کو ابھی بتاؤں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

اس نے اپنے پرس میں سے وہ لپ اسٹک نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "امی یہ دیکھیں یہ بہت مہنگی لپ اسٹک ہے۔ یہاں کسی شاپنگ سنٹر میں نہیں ملے گی۔ میڈم شیبا باہر سے لائی ہیں۔ انہوں نے مجھے میری پسند کی یہ لپ اسٹک دی ہے۔"

اس کے باپ نے کہا۔ "تمہاری میڈم بہت اچھی ہیں۔ انہوں نے تمہاری تنخواہ بھی بڑھائی ہے اور یہ انعام بھی دیا ہے۔"

اس کی ماں خوش ہو کر شیبا کو دعائیں دینے لگی۔ ان کے قریبی رشتے داروں میں کسی

کی شادی تھی۔ وہ شادی کی تقریب میں جا رہے تھے۔ ثمینہ نے کہا۔ "میں ابھی غسل کر کے تیار ہو جاتی ہوں۔ آپ سامنے والے انکل سے کہہ دیں کہ ہم وکی کو بھی اپنے ساتھ اس تقریب میں لے جائیں گے۔"

وہ غسل کرنے چلی گئی۔ ملازمت کرنے والوں کی زندگی میں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں آتی ہیں۔ کبھی تنخواہ میں دو چار سو روپے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کوئی انعام یا بہترین کارکردگی کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی ان سے چھین لی جاتی ہیں۔

اس نے تقریب میں شریک ہونے کے لئے ایک بہت خوب صورت لباس پہنا۔ آئینے کے سامنے آکر زلفوں کو سنوارا' چہرے کو نکھارا پھر ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑیاں بنانے کے لئے وہ لپ اسٹک نکالی۔ اسے خوش ہو کر دیکھا۔ سنگھار کا کوئی نیا سامان مل جائے تو خوشی ہوتی ہے۔ اس نے کیپ کو ہٹایا پھر آئینہ کی طرف جھک کر اس لپ اسٹک کے گلابی رنگ کو اپنے لبوں پر سجانے لگی۔

اس کے دونوں ہونٹ گلاب کی طرح کھل اٹھے۔ اس نے اب تک بازاروں میں ملنے والی امپورٹڈ لپ اسٹک استعمال کی تھی لیکن شیبا کی دی ہوئی لپ اسٹک کے مقابلے میں وہ سب ہیچ تھیں۔ آئینے میں وہ مہنگا پنک کلر دیکھنے سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ دوسرے تمام امپورٹڈ آئیٹم سے مختلف ہے۔ ثمینہ کے لب قدرتی طور پر گلابی لگ رہے تھے۔

اس نے اوپر نیچے کے لبوں کو ایک دوسرے سے بھینچ کر اس پنک کلر کو دیکھا اور مسکرانے لگی۔ ایسا کرتے وقت اس کا لعاب دہن ہونٹوں تک نہیں آیا تھا اگر ذرا سی بھی نمی ہونٹوں تک پہنچتی اور اس کی گلابیت اس کی زبان تک پہنچتی تو وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی پڑ جاتی۔

اس نے لپ اسٹک لگا کر اسے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ تقریب میں چائے اور شربت پینے کے باعث لپ اسٹک یا تو دھل جاتی ہے یا رنگ ہلکا پڑ جاتا ہے۔ اس نے وہ لپ اسٹک یہ سوچ کر پرس میں رکھ لی کہ ایسے وقت رنگ پھیکا پڑے گا تو وہ دوبارہ اسے استعمال کرے گی۔

وہ اپنے والدین کے ساتھ وکی کو لے کر اس تقریب میں آئی۔ مہمانوں میں شربت کا دور چل رہا تھا۔ ثمینہ اور اس کی والدہ وغیرہ کو بھی شربت کے گلاس پیش کئے گئے۔ ثمینہ

نے اپنا گلاس وکی کو دیتے ہوئے کہا۔ "اسے تم پی لو۔"

میزبان خاتون نے کہا۔ "شربت کی کمی نہیں ہے۔ ہم وکی کو دوسرا گلاس دے رہے ہیں۔"

وہ نہیں چاہتی تھی کہ شربت پینے سے اتنی مہنگی گلابیت پھیکی پڑ جائے۔ موت اس کے وجود کے دروازے تک پہنچی ہوئی تھی۔ گفتگو کے دوران میں دروازہ کھلتا اور بند ہوتا رہتا تھا مگر موت کو اندر داخل ہونے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

عجب ستم ظریفی تھی۔ واجد کے حوالے سے موت کو اس کے ہونٹوں تک پہنچایا گیا تھا جبکہ وہ بے چاری اس کی محبوبہ نہیں تھی۔ وہ شیبا کے راستے کا پتھر نہیں تھی لیکن شیبا اسے ٹھوکر مارنے کی تدبیر کر چکی تھی۔

وکی نے دو گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "آنٹی! میں نہیں پیوں گا۔"

ثمینہ نے جھک کر پوچھا۔ "کیوں نہیں پیو گے؟"

"مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ آپ جانتی ہیں کل مجھے زکام تھا آج بھی ہو جائے گا۔"

ثمینہ نے اس سے گلاس لے کر کہا۔ "پہلے ہی پینے سے انکار کرنا چاہئے تھا۔ تم نے اسے جھوٹا کر دیا ہے۔"

اس کی ماں نے کہا۔ "بیٹی تم پی لو۔ میں جانتی ہوں تمہیں نزلہ زکام نہیں ہوگا۔ تم ہونٹوں کی سرخی کی وجہ سے شربت نہیں پی رہی ہو۔"

ثمینہ نے شربت سے بھرے ہوئے گلاس کو دیکھا۔ وہ بڑی دیر سے پیاس برداشت کر رہی تھی لیکن کچھ پینے سے پرہیز کر رہی تھی۔ آخر اس نے سوچا۔ کیا حرج ہے۔ میں پینے کے بعد دوبارہ لپ اسٹک لگا سکتی ہوں۔

یہ سوچ کر اس نے گلاس کو ہونٹوں سے لگایا۔ پہلا گھونٹ پیتے ہی اسے محسوس ہوا کہ شربت میں مٹھاس کے باوجود کڑواہٹ ہے۔ اس نے پوچھا۔ "امی کیا شربت کڑوا ہے؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ بھلا شربت کہیں کڑوا ہوتا ہے۔"

اس نے دوسرا گھونٹ پیا۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ چہرے سے کرب و اذیت کے آثار نمایاں ہوئے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنے حلق کو سہلاتی ہوئی پیچھے کی طرف لڑکھڑائی۔ اس قابل نہیں رہی تھی کہ اپنا

توازن قائم رکھ پاتی۔ فرش پر گر کر تڑپنے لگی۔

ماں باپ نے چیخ کر کہا۔ "ثمینہ۔ ثمینہ۔ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟"

وہ اسے سنبھالنے کے لئے لپکے۔ دوسرے مہمان اور میزبان بھی دوڑتے ہوئے اس کے قریب آگئے لیکن ان مختصر سے لمحات میں اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ جسم ساکت ہو گیا تھا اور دیدے پھیل گئے تھے۔ اتنی بڑی دنیا اس کی بے نور آنکھوں کے سامنے ہمیشہ کے لئے بجھ گئی تھی۔

☆------☆------☆

وہ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سرفراز خان اور ڈاکٹر زیدی اس کے سامنے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ سرفراز خان غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔ "تم پاگل ہو گئی ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ تم سچ مچ پاگل ہو گئی ہو۔"

ڈاکٹر زیدی نے پوچھا۔ "شیبا تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟ کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے کتنا گھناؤنا جرم کیا ہے؟"

وہ ڈھٹائی سے بولی۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔"

سرفراز خان نے اس کے قریب آکر اس پر جھک کر پوچھا۔ "تم نے وہ لپ اسٹک اسے کیوں دی تھی؟"

"میں نے لپ اسٹک کسی کو نہیں دی تھی۔"

"ثمینہ کے ماں باپ کا بیان ہے کہ تم نے ثمینہ کی تنخواہ میں اضافہ کیا تھا اور وہ لپ اسٹک انعام کے طور پر یا ایک تحفے کے طور پر اسے دی تھی۔"

"اٹ از کوائٹ نان سینس۔ کیا میں اپنی کسی ملازمہ کو کوئی تحفہ دوں گی؟ آپ جانتے ہیں میں کسی ملازم کو منہ نہیں لگاتی۔ کسی کو خوش کرنے کے لئے تحفہ دینا میرے مزاج کے خلاف ہے۔ آپ میرے مزاج کو سمجھتے ہوئے یہ بے تکی بات کہہ رہے ہیں۔ میں آخر ثمینہ کو کوئی لپ اسٹک کیوں دوں گی؟"

"میں جانتا ہوں کہ تم کسی ملازم کو منہ نہیں لگاتی ہو۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ تم نے وہ لپ اسٹک ثمینہ کو نہیں دی تھی لیکن اس کے والدین ایسا بیان کیوں دے رہے ہیں۔ انہیں تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"آپ اس کے والدین سے پوچھیں وہ تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ میں نے اس کی

تنخواہ میں اضافہ کیا ہے۔ آپ مینجر سے پوچھ لیں کہ میں نے تنخواہ میں اضافے کے لئے کوئی انکری منٹ لیٹر جاری کیا ہے؟"

"ہم نے پوچھا تھا۔ مینجر نے پولیس والوں کو بیان دیا ہے کہ ثمینہ کی تنخواہ بڑھانے کے لئے تم نے کوئی حکم جاری نہیں کیا ہے۔"

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "مینجر کے اور تمہارے بیان کی روشنی میں ثمینہ کے والدین کا بیان جھوٹا ثابت ہو رہا ہے لیکن وہ لپ اسٹک نایاب ہے۔ یہاں کی مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہے۔ ایسے فارن آئٹمز دولت مند خواتین بیرونی ممالک سے لا کر استعمال کرتی ہیں۔"

"تو پھر پولیس والوں سے کہیں کہ جو لپ اسٹک ثمینہ کے پاس پائی گئی ہے' اسے ثابت کر دیں کہ میں اسے استعمال کرتی تھی۔ آپ میرے بیڈ روم میں جا کر دیکھ لیں۔ میرے پاس "ڈی روز کاسمیٹکس" کا ایک بھی آئٹم نہیں ہے۔"

باپ نے اسے چونک کر دیکھا پھر اس کے بازو کو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "تم کیسے جانتی ہو کہ ثمینہ کے پاس "ڈی روزا کمپنی" کی لپ اسٹک تھی؟"

"آں؟" اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے بات بنائی۔ "مجھے کیا معلوم کہ اس کے پاس "ڈی روزا" کی لپ اسٹک ہے۔ میں نے تو یونہی ایک کمپنی کا نام لیا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ اگر تم نے پولیس والوں کے سامنے ایسا کہہ دیا تو وہ ثابت کر دیں گے کہ تم نے ہی ثمینہ کو ہلاک کیا ہے۔"

ڈاکٹر زیدی نے اس کے قریب آ کر کہا۔ "شیبا! یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ پولیس والوں کے سامنے ایسی غلطی نہیں کرو گی۔ ان کے سامنے "ڈی روزا کمپنی" کا نام زبان پر نہیں لاؤ گی۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "انکل! یہ نام یونہی بے اختیار میری زبان پر آ گیا تھا۔ اب میں کبھی یہ نام نہیں لوں گی۔"

سرفراز خان ایک صوفے پر آ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بڑے صدمے سے کہنے لگا۔ "یا خدا! تُو نے مجھے دنیا جہان کی دولت دی مگر ایک اولاد کو میرے لئے عذاب بنا دیا۔ مرنے کے بعد اعمال کا حساب ہوتا ہے پھر بد اعمال کے مطابق سزائیں ملتی ہیں۔ مجھے اس کم بخت بیٹی کے باپ بننے کی سزا جیتے جی مل رہی ہے۔"

"ڈیڈی! میں کم بخت ہوں' ذلیل ہوں' کمینی ہوں۔ میں ہی بری ہوں اور جو مجھ پر

ظلم کرتے ہیں اور مجھ سے میری عزیز ترین چیز چھین لیتے ہیں' وہ بہت اچھے ہیں۔ وہ زندہ رہتی اور واجد کو مجھ سے چھین کر لے جاتی تو آپ خوش رہتے۔ اس طرح سر پکڑ کر نہ بیٹھتے۔"

وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔ "یُو شٹ اَپ! تم سے کوئی چیز چھین لی جاتی تو ایک باپ کو خوشی نہیں ہوتی۔ تم ارمان کی طرح واجد کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی ہو۔ میں ثمینہ کو ہر قیمت پر خرید لیتا اسے تمہارے راستے سے ہٹا دیتا مگر تمہیں میری حکمت عملی پر اور اپنے ڈاکٹر انکل کے علاج پر بھروسا نہیں ہے۔"

"مجھے بھروسا ہے اسی لئے تو آپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں یہاں سے تین سو میل دور اپنے فارم ہاؤس میں چلی گئی تھی۔"

"تم نے اس بے چاری کو بے موت مار ڈالا۔ اس کے بعد ہم پر بھروسا کر رہی ہو۔ آئندہ پھر کوئی بات تمہارے مزاج کے خلاف ہو گی تو اس وقت ہم پر بھروسا کرنا بھول جاؤ گی پھر کوئی غلطی کر بیٹھو گی۔"

"آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ اب میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہو گی۔ میں آپ کی قسم کھاتی ہوں۔"

"مت کھاؤ میری قسم۔ تم بھیانک جرم کرتی ہو اور ہم اسے غلطی کہہ کر تمہیں سمجھاتے ہیں تاکہ آئندہ ایسا نہ کرو مگر غلطی ہم کر رہے ہیں۔ تمہارے بھیانک جرم کو محض ایک غلطی کہہ دیتے ہیں۔ تم بھی کھیل سمجھ کر زندگی کو غلط طریقے سے کھیلنے لگتی ہو۔"

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "سرفراز میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ شیبا کو ایک طویل مدت کے لئے پیرس بھیج دو۔ خدا کا شکر کرو پہلے بھی اس کے جرم پر پردہ پڑ گیا تھا۔ اب اس پر جو الزام ہے وہ بہت کمزور ہے۔ آئندہ اسے کوئی پاگل پن دکھانے کے لئے یہاں نہ رہنے دو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولی۔ "میں تنہا نہیں جاؤں گی۔ واجد کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

سرفراز اور زیدی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سرفراز نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں واجد سے بات کروں گا۔ اسے ہر قیمت پر تمہارے لئے خریدوں گا۔"

ایک ملازم نے آکر کہا۔ "صاحب! باہر پولیس والے آئے ہیں۔"

سرفراز نے کہا۔ "انہیں بٹھاؤ۔ ہم آرہے ہیں۔"

ملازم چلا گیا۔ ڈاکٹر زیدی نے شیبا کے قریب آکر کہا۔ "شیبا! یہ بات اچھی طرح یاد رکھو کہ تمہاری زبان پر "ڈی روزا کاسمیٹکس کمپنی" کا نام نہیں آئے گا۔ باقی معاملات ہم سنبھال لیں گے۔"

وہ تینوں اس کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہاں ایک پولیس افسر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے سرفراز خان سے مصافحہ کیا پھر کہا۔ "آپ عزت دار لوگ ہیں۔ میں عام لوگوں کی طرح آپ کی صاحب زادی کو تھانے لے جاکر بیان نہیں لینا چاہتا۔ یہاں بیان لے کر چلا جاؤں گا۔"

سرفراز خان نے کہا۔ "آپ تشریف رکھیں۔ میری بیٹی سے سوالات کریں۔ ثمینہ ہماری ایک معمولی ملازمہ تھی۔ اس سے دشمنی تھی نہ دوستی۔ میری بیٹی پر قتل کا الزام غلط ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "بے شک غلط ہے۔ مقتولہ کے صرف والدین مخالفت میں بیان دے رہے ہیں اور اس بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہاں تو مس صاحبہ! کیا وہ لپس اسٹک آپ نے ثمینہ کو دی تھی؟"

شیبا نے کہا۔ "میں ملازموں سے خوش ہوتی ہوں تو انہیں دو چار سو روپے دے دیا کرتی ہوں لیکن اپنی کوئی چیز کسی کو نہیں دیتی پھر ایک ملازمہ کو ایک لپ اسٹک کیوں دوں گی؟ یہ بھی غلط ہے کہ میں نے اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا تھا۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "جی ہاں' میں نے دفتر میں جاکر مینیجر وغیرہ سے تصدیق کی ہے۔ ثمینہ کی تنخواہ بڑھانے والی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔"

شیبا سوالات کے جواب میں جو کچھ بول رہی تھی۔ اسے ایک سپاہی لکھتا جارہا تھا۔ آخر انسپکٹر نے وہ کاغذ لے کر اسے شیبا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کا بیان ہے۔ اسے پڑھ کر دستخط کردیں۔"

شیبا نے اسے پڑھ کر دستخط کئے۔ انسپکٹر نے وہ کاغذ لے کر دونوں سپاہیوں سے کہا۔ "باہر جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔"

دونوں سپاہی باہر چلے گئے۔ انسپکٹر نے سرفراز خان سے کہا۔ "آپ شریف اور عزت دار لوگ ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ بار بار یہاں آؤں یا آپ کی صاحب زادی کو تھانے میں طلب کروں۔ یہ اچھا نہیں لگتا۔ ایسا تو چھوٹے لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔"

سرفراز خان نے کہا۔ "جسٹ اے منٹ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ ڈرائنگ روم سے گیا پھر جلد ہی واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پھولا ہوا لفافہ تھا۔ اس نے وہ لفافہ انسپکٹر کو دیا۔ انسپکٹر نے اسے لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس کی کیا ضرورت تھی۔ ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھیک کرنے سے ٹھیک ہوگا۔ آپ یہ رپورٹ لکھ سکتے ہیں کہ ثمینہ کسی نامعلوم شخص کے عشق میں گرفتار تھی۔ وہ شخص اپنا کام نکلنے کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اس نے ثمینہ کو لپ اسٹک کا تحفہ دیا تھا۔ اس طرح اس نے ہمیشہ کے لئے ثمینہ سے پیچھا چھڑالیا۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ درست کہتے ہیں۔ یہی ہوا ہے۔ عزت ماب سرفراز خان صاحب بالکل یہی ہوا ہے۔ میں یہی رپورٹ لکھوں گا۔ آج سے پوری پولیس فورس زہریلا تحفہ دینے والے نامعلوم قاتل کو تلاش کرتی رہے گی۔"

وہ مصافحہ کرکے چلا گیا۔ شیبا نے کہا۔ "ڈیڈی آپ تو خوامخواہ پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ دیکھئے کتنی آسانی سے یہ معاملہ نمٹ گیا ہے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تم اپنے بڑے سے بڑے پاگل پن کو اہمیت نہیں دیتی ہو مگر اب تم وہی کرو گی جو ہم کہیں گے۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ "ہیلو واجد! میں سرفراز خان بول رہا ہوں۔"

وہ اپنے باپ کی زبان سے واجد کا نام سن کر خوشی سے کھل گئی۔ فوراً ہی باپ کے قریب آگئی۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ "میں نے تم سے ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا۔ کیا تم آرہے ہو؟ ہوں۔ ہوں۔ ہوں۔ میں اپنی کوٹھی میں ہوں۔ ابھی آسکتے ہو تو چلے آؤ۔"

اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر ریسیور رکھ دیا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "آپ نے ریسیور کیوں رکھ دیا؟ میں اس سے بات کرنے والی تھی۔"

"تم ابھی اس سے بات نہیں کرو گی۔ وہ یہاں آرہا ہے۔ تم دوسرے کمرے میں رہو

گی۔"

"کیوں؟ آپ مجھے اس سے باتیں کیوں نہیں کرنے دیں گے؟"

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "پہلے ہم اس سے بات کریں گے۔ اس سے تمام معاملات طے کریں گے۔ اس کے بعد تم یہاں آ کر اس سے مل سکو گی۔"

وہ باپ کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "ڈیڈی! میں اس کے آنے پر یہاں ہوں گی تو کیا فرق پڑے گا؟"

"مجھ سے بحث نہ کرو۔ ابھی تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھ پر اور اپنے ڈاکٹر انکل پر بھروسا کرو گی۔ لہٰذا بھروسا کرو اور یہاں سے جاؤ۔"

وہ ناراضگی سے پاؤں پٹختے ہوئے اپنے باپ کے بیڈروم میں آ کر بستر پر بیٹھ گئی پھر لیٹ گئی۔ چھت کو تکتے ہوئے سوچنے لگی۔ "میرے اندر خوامخواہ تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے جذبات میں بہنا نہیں چاہئے۔ ڈیڈی اور انکل پر بھروسا کرنا چاہئے۔ وہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں واجد کو میرا لائف پارٹنر بنا دیں گے۔"

اس نے کروٹ لے کر تکئے کو کھینچ کر اپنی دونوں بانہوں میں لے کر بھینچ لیا۔ "ہائے واجد! تم میرے لئے، صرف میرے لئے پیدا ہوئے ہو۔ میری یہ شدید خواہش ہے کہ تم سوچو تو میرے لئے سوچو، بولو تو میرے لئے بولو۔ ساری زندگی میرے لئے جیتے رہو اور کبھی جان دینے کی بات آئے تو میرے لئے جان دو۔"

اس دنیا میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو صرف اپنے لئے جیتے ہیں اور اپنے لئے کسی کو جینے دیتے ہیں اور اپنے ہی لئے کسی کو مار ڈالتے ہیں۔ کسی ایک چیز کو یا کسی ایک ہستی کو اتنی شدت سے چاہتے ہیں کہ اس کے حصول کے لئے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر زیدی اچھی طرح جانتا تھا کہ شیبا کو ہمیشہ نارمل رکھنے کے لئے صرف ایک ہی دوا ہے اور وہ دوا ہے واجد۔ شیبا فلرٹ یا آوارہ مزاج نہیں تھی۔ اس نے پہلے ارمان کو دل و جان سے چاہا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اگر وہ کسی کو نہ چاہتی تو ہمیشہ نارمل رہتی لیکن واجد اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ اب یہی ایک علاج تھا کہ وہ اس کا لائف پارٹنر بن کر، اس کی دوا بن کر دن رات اس کے ساتھ رہے۔

شیبا کی چاہت میں اور اس کی محبت کی شدت میں بڑی سچائی تھی۔ واجد کو حاصل کرنے کے بعد پھر وہ کسی دوسرے کا تصور بھی نہ کرتی۔ ایک شریف زادی کی طرح واجد

کے ساتھ ساری زندگی گزار دیتی لیکن اس شریف زادی کی محبت میں تمام خوبیاں تھیں، صرف شرافت نہیں تھی۔

اسے محبت کرنے والی مہذب شریف زادی بنائے رکھنے کے لئے واجد اس کے لئے ضروری ہو گیا تھا۔ وہ واجد کے سوا کسی دوسرے کو کبھی قبول نہ کرتی اور واجد کو پا کر پھر کبھی کسی کو گھاس نہ ڈالتی۔ اس کے اندر ایک اچھی عورت کی تمام خوبیاں تھیں مگر اسے ایب نارمل بنانے والی ایک خرابی بھی تھی۔

واجد آ گیا۔ سرفراز خان اور ڈاکٹر زیدی نے اس کا استقبال کیا۔ انہوں نے اس سے مصافحہ کیا۔ اسے بیٹھنے کو کہا پھر سرفراز خان نے رسمی طور پر پوچھا۔ "تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟"

"خدا کا شکر ہے اور آپ کی مہربانیاں ہیں۔ کام اچھا چل رہا ہے۔ کل سے میری بوٹ سمندر میں نہیں جا رہی ہے۔ اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی مرمت کے بعد کام شروع کر سکوں گا۔"

سرفراز خان نے کہا۔ "تمہیں ایک اور بوٹ خرید لینا چاہئے۔"

"میں اسی کوشش میں ہوں مگر ابھی کچھ عرصے تک کاروبار پر توجہ نہیں دے سکوں گا۔"

"ایسی کیا بات ہے کہ توجہ نہیں دے سکو گے؟"

"مجھے ثمینہ کی ہلاکت سے بہت شاک پہنچا ہے۔"

"ہاں، صدمہ پہنچنے کی بات ہے۔ پتا نہیں اس بے چاری سے کس نے دشمنی کی ہے۔ میری بیٹی پر خوامخواہ الزام آ رہا ہے۔ ابھی ایک پولیس انسپکٹر آیا تھا۔ وہ شیبا کا بیان لے کر گیا ہے۔"

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "ہمیں ثمینہ اور اس کے گھر والوں سے پوری ہمدردی ہے لیکن مقتولہ کے والدین کو شیبا کے خلاف نہیں بولنا چاہئے تھا۔ شیبا نے کبھی کوئی چیز ثمینہ کو یا کسی ملازمہ کو کبھی نہیں دی۔"

سرفراز خان نے کہا۔ "لپ اسٹک جیسی چیزیں دو بے تکلف سہیلیاں دیتی لیتی ہیں اور ثمینہ سہیلی نہیں تھی، ملازمہ تھی۔"

"مقتولہ کے والدین نے یہ بھی جھوٹ کہا ہے کہ شیبا نے ثمینہ کی تنخواہ میں اضافہ

کیا تھا۔ پولیس والوں کی تفتیش سے یہ بیان جھوٹا ثابت ہو چکا ہے۔"

سرفراز خان نے واجد سے کہا۔ "تم تو شیبا کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے تمہیں کریبس فیکٹری کا انچارج بنایا ہے۔ تمہیں دوسری بوٹ خرید کر دینے والی ہے۔ کیا تمہیں حیرانی نہیں ہے کہ تمہارا اتنا خیال رکھنے والی کے خلاف جھوٹ بولا جا رہا ہے؟"

واجد نے کہا۔ "میں اس بات پر حیران ہو کر کیا کروں گا؟"

"شیبا نے بتایا ہے کہ تمہارے سسرال والوں کے تعلقات ثمینہ کے گھر والوں سے ہیں۔ تم انہیں غلط بیانی سے باز رکھ سکتے ہو۔"

"انہیں غلط بیانی سے باز رکھنا ضروری نہیں ہے۔ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ شیبا نے وہ لپ اسٹک ثمینہ کو دی تھی۔"

"یہی تو ہم کہتے ہیں۔ جب شیبا نے دی ہی نہیں تھی تو ثبوت کہاں سے ملے گا۔"

واجد نے خشک لہجے میں کہا۔ "ایسے جرائم بھی ہوتے ہیں جن کے خلاف کبھی ثبوت نہیں ملتے۔ میرا خیال ہے اس موضوع پر بات نہ کی جائے۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ جو بات تکلیف دہ ہو' اس بات سے پرہیز کرنا چاہئے۔ میں نے تو اچھے ماحول میں اچھی باتیں کرنے کے لئے تمہیں بلایا ہے۔"

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "تمہیں جو صدمہ پہنچا ہے ہو سکتا ہے ہماری باتوں سے وہ صدمہ کم ہو جائے یا ختم ہو جائے۔"

واجد نے کہا۔ "کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جن پر مرہم نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ زخم وقت کے ساتھ ساتھ بھرتے ہیں۔"

سرفراز خان نے کہا۔ "ایک ذاتی سا سوال ہے۔ کیا تم ثمینہ سے محبت کرتے تھے؟"

"ہاں' محبت تو کرتا تھا مگر رومانس نہیں کرتا تھا۔"

شیبا ڈرائنگ روم کے دروازے کے پیچھے کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ ثمینہ سے محبت کرتا تھا اور یہ جھوٹ کہہ رہا تھا کہ ثمینہ سے رومانس نہیں کرتا تھا۔

واجد نے سرفراز کو اور ڈاکٹر زیدی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ثمینہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ میرے بچے کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اسے پڑھاتی لکھاتی تھی اس لئے میں اس کی عزت کرتا تھا۔ میرے عزت کرنے کے اس عمل کو محبت کہا جا سکتا ہے۔ ہماری سوسائٹی' ہمارا

معاشرہ ایسا ہے کہ ہم کسی لڑکی سے ملتے ہیں' اس کی عزت کرتے ہیں تو فوراً ہی سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہم اس سے رومانس کر رہے ہیں۔ میں تو ثمینہ سے رومانس کر ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ میں اپنی سالی آمنہ سے شادی کرنے والا ہوں۔"

یہ بات شیبا کو ایک گولی کی طرح لگی۔ وہ گولی دل میں پیوست ہو گئی۔ دل میں یہ بات اٹک گئی کہ واجد کسی آمنہ کو چاہتا ہے۔ ثمینہ کے سلسلے میں غلط رائے قائم کی گئی تھی۔

شیبا کو اس بات کا افسوس نہیں ہوا کہ اس نے غلط فہمی کی بنا پر ثمینہ کو مار ڈالا ہے۔ اب تو آمنہ اس کے دل میں چبھ گئی تھی۔ "یہ دوسری کہاں سے آگئی؟ میں کرید کرید کر معلومات حاصل کرتی رہی۔ اگر ثمینہ اور واجد ایک بار بھی آمنہ کا ذکر کرتے تو میں خواہ مخواہ ثمینہ کے سلسلے میں اتنی دردسری مول نہ لیتی۔"

وہ سوچ رہی تھی اور دروازے کی آڑ سے واجد کو دیکھ رہی تھی۔ ثمینہ کی ہلاکت کے بعد وہ ہاتھ آتے آتے پھسل گیا تھا۔ کسی دوسری کی طرف پھسل رہا تھا۔ بہت پہلے سے آمنہ کی طرف مائل تھا۔ شیبا نے غلط سمجھا تھا اور غلط فہمی کے باعث دوسری سے دشمنی کر بیٹھی تھی۔

سرفراز خان نے واجد سے پوچھا۔ "کیا آمنہ سے تمہارا رشتہ پکا ہو چکا ہے؟"

"میری طرف سے پکا ہے کیونکہ وہ میری بیوی کی سگی بہن ہے۔ میرے بیٹے کو سگی ماں کا پیار دے گی۔"

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کسی سگے رشتے دار سے اپنے بچے کو سگا پیار ملے۔ عورت اپنی حاسدانہ فطرت سے مجبور ہوتی ہے۔ جب اپنا بچہ ہوتا ہے تو اپنی سگی بہن کے بچے سے حسد کرنے لگتی ہے۔ اپنے بچے کو اس پر ترجیح دیتی ہے۔"

واجد نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ آمنہ سے جو توقع کر رہا ہوں' وہ غلط ہو سکتی ہے لیکن اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت کے لئے کسی سے تو شادی کرنی ہی ہوگی۔"

"تو پھر ایسی لڑکی سے کرو جہاں تمہارے بیٹے کا مستقبل محفوظ بھی ہو اور بہت شان دار بھی ہو۔ میں تمہیں کورٹ پیپر پر یہ لکھ کر دوں گا کہ تمہارے بیٹے کو یورپ یا امریکا

میں تعلیم و تربیت کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ وہ وہاں شہزادوں کی طرح زندگی گزارے گا۔"

"آپ میرے بیٹے کو شہزادہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے جوان ہونے تک پتا نہیں کتنے کروڑ خرچ کریں گے۔ آپ ایسا کیوں کریں گے؟"

"میں تمہیں اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔ اپنی بیٹی سے منسوب کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میرے اربوں روپوں کے کاروبار اور تمام جائیداد کی تنہا وارث ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ساری دولت تمہاری ہوگی۔"

وہ بولا۔ "یہ خوابوں اور خیالوں کی سی باتیں ہیں۔ ایسی کہانیاں لکھی جاتی ہیں کہ مجھ جیسے ایک معمولی شخص کو ایک رئیس زادی کے ذریعے سارے جہاں کی دولت اور خوشیاں مل جاتی ہیں اور ہماری دنیا میں کہیں نہ کہیں ایسا سچ مچ ہوتا بھی ہوگا۔"

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "بڑے لوگوں کے دل بڑے ہوتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ تم خود دیکھ رہے ہو کہ تمہارے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔ سرفراز خان تمہیں اپنی بیٹی بھی دے رہے ہیں اور تمام دولت بھی۔"

"ڈاکٹر صاحب! یہ تو مجھ جیسے جوان کے لئے خوش قسمتی کی انتہا ہے لیکن آپ نے یہ بھی سنا ہوگا نہ دیکھا ہوگا کہ اتنی بڑی خوش قسمتی ٹھکرا دی جائے۔ مجھے افسوس ہے میں سرفراز صاحب کی یہ آفر قبول نہیں کر سکوں گا۔"

دروازے کے پیچھے شیبا نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں' وہ اسے ٹھکرا رہا تھا۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے چبانے لگی۔ محبوب تو سنگ دل ہوتے ہیں۔ ایک پتھر کے صنم سے اس کا واسطہ پڑا تھا لیکن وہ پتھر کو پوجنا چاہتی تھی۔ اگر وہ پوجا سے رام نہ ہوتا تو اسے توڑ بھی سکتی تھی۔

سرفراز خان نے کہا۔ "تعجب ہے۔ تم اتنی بڑی آفر قبول نہیں کر رہے ہو۔ انکار کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"

واجد نے کہا۔ "اتنی بڑی آفر سے انکار کرنے کی وجہ بھی بہت بڑی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کا ماضی اور اس کا حال دیکھا جاتا ہے۔ شیبا نے ماضی میں شادی کی تھی۔ اس کے شوہر نے خودکشی کرلی۔ آپ خودکشی کی وجہ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ میں خودکشی نہیں کرنا چاہتا۔"

شیبا دروازے کے پیچھے سے تڑپ کر نکلی پھر واجد کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "تم میرے بارے میں غلط رائے قائم کر رہے ہو۔ ارمان کی خودکشی کی وجہ میں نہیں ہوں۔ میں نے اسے اتنی دولت دی تھی' اتنی دولت دی تھی کہ وہ گمراہ ہوگیا تھا۔ اس قدر عیاش ہوگیا تھا کہ اس نے ایک لڑکی کے عشق میں پاگل ہو کر خودکشی کرلی۔"

واجد نے کہا۔ "باپ کی دولت نے تمہیں گمراہ کیا ہو یا ارمان کو......... یہ تو ثابت ہوجاتا ہے کہ دولت گمراہ کرتی ہے۔ میں گمراہ نہیں ہونا چاہتا۔"

وہ قریب آکر بولی۔ "تم اتنا بتا دو کہ مجھ میں کیا خرابی ہے؟ کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟ جوان نہیں ہوں؟ عزت دار نہیں ہوں؟"

"تم خوب صورت ہو' جوان ہو' عزت دار ہو اور بہت کچھ ہو لیکن میں ثمینہ کے والدین کو برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ پانچوں وقت کے نمازی ہیں۔ وہ اپنے دلوں میں خدا کا خوف رکھتے ہیں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ پہلے تمہارے دشمن نہیں تھے اور نہ اب ہیں۔ وہ تو اپنے ایمان کے مطابق سچ بیان دے رہے ہیں۔"

شیبا نے کہا۔ "سچ بولنے والے بھی کبھی مصلحتاً جھوٹ بول دیتے ہیں۔"

"شیبا میں تم سے زیادہ ثمینہ کو جانتا ہوں۔ اس نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی تھی' کوئی گناہ نہیں کیا تھا جس سے شرمندہ ہو کر وہ زہریلی لپ اسٹک سے خودکشی کرلیتی۔ میں تم سے بحث نہیں کروں گا لیکن ثمینہ کے والدین کو کبھی جھوٹا نہیں کہوں گا۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔ "رک جاؤ واجد۔ تم میرے متعلق جیسی بھی رائے قائم کرو لیکن میں تمہیں چاہتی ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کتنی شدت سے چاہتی ہوں۔ میں تمہارے بغیر پاگل ہوجاؤں گی۔"

واجد دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کرتا ہوا چلا گیا۔ وہ دروازہ شیبا کے منہ پر لگا۔ وہ غصے سے تلملا گئی۔ مٹھیاں بھینچ کر چیختے ہوئے بولی۔ "یو ڈرٹی ڈوگ۔ تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ آج تک کسی نے میری انسلٹ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ تم کتے ہو کتے۔ یہاں سے بھونکتے ہوئے گئے ہو۔ میں چیلنج کرتی ہوں۔ تم دم ہلاتے ہوئے آؤ گے۔ میں تمہارے گلے میں پٹا ڈال کر رکھوں گی۔"

وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ دروازے پر لاتیں اور گھونسے مار رہی تھی۔ سرفراز خان اور ڈاکٹر زیدی اسے دونوں طرف سے پکڑ کر وہاں سے کھینچ کر لا رہے تھے۔

اسے سمجھا رہے تھے کہ وہ خود کو قابو میں رکھے۔

لیکن وہ بے قابو ہو رہی تھی۔ اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ واجد اس کے لئے چیلنج بن گیا تھا۔ وہ اسے جبراً حاصل کرلینے کی قسمیں کھا رہی تھی لیکن وہ کب تک حلق پھاڑ پھاڑ کر چیختی رہتی۔ آخر چکرا کر ان دونوں بوڑھوں کے بازوؤں میں بے ہوش ہوگئی۔

☆------☆------☆

واجد نے شیبا کی خریدی ہوئی کریبس فیکٹری سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اپنے ماہی گیروں سے کہا کہ اب وہ کیکڑوں کے لئے جال نہیں پھینکیں گے۔ گہرے سمندر میں جاکر مچھلیاں پکڑا کریں گے۔

اسے معلوم ہوا تھا کہ شیبا اب اپنے آفس میں نہیں آتی ہے۔ ایک آفس کے آدمی نے بتایا کہ وہ بیمار ہے اور اس کا علاج گھر میں ہو رہا ہے۔

سرفراز خان دنیا والوں کے سامنے یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ بظاہر نارمل دکھائی دینے والی بیٹی پہلے ارمان کے لئے ایب نارمل تھی' اب واجد کو جبراً حاصل کرنے کے لئے پاگل ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر زیدی اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اس کا رازدار تھا۔ وہ بڑی رازداری سے اس کی بیٹی کا علاج کرتا رہتا تھا۔ وہ عام حالات میں خطرناک نہیں تھی بلکہ کسی خاص معاملے میں بھی دوسروں کے لئے خطرناک نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر واجد اس کی زندگی میں آجاتا ہے۔

ڈاکٹر زیدی نے اپنے علاج کے ذریعے اور نفسیاتی ٹریٹمنٹ کے ذریعے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ جوش میں آتی رہے گی تو ہوش کھوتی رہے گی۔ اسے پُرسکون رہ کر کسی طرح واجد کو اپنی طرف مائل کرنا چاہئے یا پھر ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ واجد سے بڑھ کر ایک سے ایک پُرکشش اور گبرو جوان ہیں۔ ایسا کوئی جوان اس کی نظروں میں آئے گا تو وہ واجد کو خود ہی ٹھکرا دے گی۔

وہ ایک ہفتے بعد اپنے آفس میں آئی۔ پتا چلا کہ واجد نے اس کی کریبس فیکٹری چھوڑ دی ہے اور اس کی بوٹ کے ماہی گیر اب مچھلیاں پکڑ کر لاتے ہیں۔ اس نے واجد کو اس کے موبائل پر مخاطب کیا اور کہا۔ "میں کاروبار کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہوں۔"

اس نے کہا۔ "سوری' اب میرا تم سے کوئی لین دین نہیں رہا ہے۔ میں بہت مصروف ہوں۔ کسی سے ملاقات کا وقت نہیں نکال سکتا۔"

اس نے فون کو بند کیا پھر آفس سے اٹھ کر فشریز کے اس ڈیک پر آئی جہاں واجد کی بوٹ لنگرانداز ہوا کرتی تھی۔ وہ وہاں موجود تھا۔ شیبا نے کہا۔ "تم نہ آئے صنم تو ہم چلے آئے۔ تم مجھ سے کتراتے کیوں ہو؟ کم آن' دوستی کرو۔"

اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ واجد نے اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا "جس ہاتھ پر ثمینہ کا لہو نظر آرہا ہے۔ میں اس ہاتھ سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔"

"میں اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے موقع نہیں دو گے؟"

"جاؤ' موقع ہی موقع ہے۔ اپنے حق میں ثبوت حاصل کرو۔ جب اپنی بے گناہی ثابت کردو گی تو میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔"

"میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہیں بے حد و حساب محبتیں دے کر اپنے بہترین عمل سے تمہیں قائل کردوں گی کہ تم مجھے غلط سمجھتے آرہے ہو۔"

اس کی بوٹ سمندر میں جا رہی تھی۔ وہ بوٹ پر سوار ہوگیا۔ ایک ماہی گیر نے پوچھا۔ "کیا آپ سمندر میں جائیں گے؟"

واجد نے کہا۔ "جب سمندر میں طوفان آئے تو ہم خشکی پر چلے آتے ہیں۔ جب یہاں زلزلہ آئے تو اپنے بچاؤ کے لئے سمندر میں جانا چاہئے۔ بوٹ اسٹارٹ کرو۔"

بوٹ اسٹارٹ ہو کر گہرے سمندر کی طرف جانے لگی۔ شیبا ساحل پر کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے اس طرح چھوڑ کر گیا تھا کہ ماہی گیروں کے سامنے اس کی کھلی انسلٹ کی تھی۔ اسے غصہ آرہا تھا مگر پیار بھی آرہا تھا۔ بہترین گھڑسوار وہ ہوتا ہے جو سرکش گھوڑے کو اپنے قابو میں کرکے اس پر سوار ہو جاتا ہے۔ واجد سرکشی دکھا رہا تھا۔ شیبا کے لئے چیلنج بنتا جا رہا تھا۔

وہ ساحل پر کھڑی دور سمندر میں جانے والی بوٹ کو دیکھ رہی تھی۔ اتنی دور سے واجد ٹھیک طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بوٹ دور جاتی ہوئی آخر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی پھر بھی وہ تصور میں اسے دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی کہ کس طرح اس سرکش گھوڑے کو قابو میں کرنا چاہئے۔

اس نے کریبس فیکٹری میں آکر وہاں کے رجسٹر سے واجد کے مکان کا پتا نوٹ کیا۔

ویسے تو وہ ساحل کے ایک کاٹیج میں رہتا تھا لیکن اس کا مستقل پتا وہی تھا جہاں اس کا بیٹا اپنے نانا نانی کے ساتھ رہتا تھا۔ شیبا نے اس شام اس پتے پر جاکر ذرا دور اپنی کار کھڑی کی۔ ٹھنڈا مشروب پینے کے بہانے اپنی کار میں بیٹھی رہی اور اس مکان کی طرف دیکھتی رہی۔ اس مکان کے سامنے چند بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کھیل کے دوران میں ایک دوسرے کو مخاطب کررہے تھے۔ کئی لڑکوں نے ایک بچے کو بار بار وکی کہہ کر مخاطب کیا تو شیبا سمجھ گئی کہ وہی واجد کا بیٹا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت نے مکان سے باہر آکر وکی کو آواز دی۔ اسے گھر میں آنے کے لئے کہا۔ "وکی! آجاؤ۔ تمہیں وقت پر کھانا اور وقت پر سونا چاہئے۔ صبح جگاؤ تو جاگنا نہیں چاہتے۔ تمہارا دل پڑھنے میں نہیں کھیلنے میں لگتا ہے۔ کل سے میں تمہیں اسکول پہنچایا کروں گی۔"

شیبا نے کار اسٹارٹ کی پھر وہاں سے اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہئے' اتنا تو جانتی تھی کہ وکی اپنے باپ کی کمزوری ہے۔ وہ باپ اپنے بیٹے کی خاطر ایک بے انتہا دولت مند لڑکی کو چھوڑ کر کسی آمنہ سے شادی کرنے والا ہے۔ اگر بیٹا نہ رہے تو باپ آمنہ سے شادی کیوں کرے؟ اس انداز میں سوچتے وقت اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتی تھیں۔ وکی کے بارے میں سوچتے وقت شیبا کو یہی لگ رہا تھا کہ اس کے اندر کی تیز آندھی میں واجد ایک تنکے کی طرح اڑتا ہوا اس کے پاس چلا آرہا ہے۔

☆------☆------☆

دوسری صبح وکی اپنی نانی کے ساتھ اسکول گیا۔ وہ بوڑھی خاتون اسے ایک رکشے میں لے کر آئی تھیں۔ اس نے وکی سے کہا۔ "بیٹے جاؤ۔ دل لگا کر پڑھو۔ میں ٹھیک ایک بجے لینے آؤں گی۔"

وہ ٹھیک ایک بجے نہ آسکی۔ اکثر رکشا ٹیکسی والے کسی نہ کسی وجہ سے کہیں آنے جانے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ آدھے گھنٹے کے بعد پہنچی۔ اسکول کے تمام بچے جاچکے تھے۔ احاطے کے اندر چند ایسے بچے کھیل رہے تھے جن کے والدین ابھی انہیں لینے نہیں آئے تھے۔ بوڑھی خاتون کو ان بچوں میں وکی نظر نہیں آیا۔ اس نے آفس میں آکر میڈم سے پوچھا۔ میڈم نے کہا۔ "اگر وہ باہر بچوں کے ساتھ نہیں ہے تو پھر جاچکا ہے۔ سمجھ دار بچہ ہے۔ کسی اپنے کے ساتھ گیا ہوگا۔"

میڈم نے باہر احاطے میں آکر بچوں سے پوچھا۔ "کیا وکی تمہارے ساتھ کھیل رہا تھا؟"

ایک بچے نے جواب دیا۔ "یس میڈم! ایک بڑی سی کار آئی تھی۔ وکی اس میں بیٹھ کر گیا ہے۔"

خاتون نے پریشان ہو کر کہا۔ "ہمارے پاس یا ہمارے رشتے داروں کے پاس کوئی بڑی سی کار نہیں ہے۔ اگر اپنی گاڑی ہوتی تو میں اپنے نواسے کو رکشے میں نہ لاتی۔"

میڈم نے ایک بچے سے پوچھا۔ "اس بڑی کار میں کون آیا تھا؟ کیا تم میں سے کسی نے دیکھا ہے؟ وہ کس کے ساتھ گیا ہے؟"

"بڑی سی گاڑی میں ایک آنٹی آئی تھیں۔ انہوں نے وکی کو پاس بلا کر ایک ٹافی کھلائی تھی پھر اسے اپنے ساتھ بٹھا کر لے گئی تھیں۔"

وہ آنٹی کون تھیں؟ اس کار کا نمبر کیا تھا؟ یہ بچے نہ بتا سکے۔ بوڑھی خاتون نے گھر آکر پوچھا۔ کسی آنٹی نے وکی کو گھر نہیں پہنچایا تھا۔ اس کے نانا نے واجد کو فون پر بتایا کہ وکی لاپتا ہوگیا ہے۔ جب واجد کو یہ معلوم ہوا کہ ایک بڑی سی کار میں کوئی آنٹی آکر اسے لے گئی ہیں تو بے اختیار شیبا اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگی۔

اس نے فوراً ہی شیبا کے موبائل کے نمبر پنچ کئے مگر اس سے رابطہ نہ ہوا۔ اس نے سرفراز خان سے رابطہ کیا پھر پوچھا۔ "شیبا کہاں ہے؟"

"وہ یہاں نہیں ہے۔ اپنے فارم ہاؤس میں گئی ہے۔ کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں' پلیز آپ فارم ہاؤس کا پتا اور وہاں کا فون نمبر بتائیں۔"

سرفراز نے اسے پتا اور فون نمبر بتانے کے بعد کہا۔ "واجد! تم میری بیٹی سے ملنا چاہتے ہو۔ اس بات سے مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔ تم اس سے ملتے رہو گے تو تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔"

"مسٹر سرفراز خان! میں آپ کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ اس کے فارم ہاؤس چلیں آپ کو پتا چلے گا کہ آپ کی پاگل بیٹی نے میرے چھ برس کے معصوم بیٹے کو اغوا کیا ہے۔"

وہ ایک دم سے چونک کر بولا۔ "کیا! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ نہیں میری بیٹی ایسا نہیں کرے گی۔ میں ابھی فارم ہاؤس کی طرف جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں بھی اسی راستے پر آپ سے ملوں گا۔"

واجد نے فون بند کیا پھر اپنی گاڑی اسٹارٹ کرکے فارم ہاؤس کی طرف جانے لگا۔ وہ فارم ہاؤس شہر سے تین سو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو سرفراز کی گاڑی بھی پہنچ رہی تھی۔ دونوں نے اپنی گاڑی کے ہارن بجائے پھر گاڑی سے اتر کر کاٹیج کی طرف جانے لگے۔

شیبا گاڑی کی آواز سن کر دوڑتی ہوئی کاٹیج سے باہر آئی۔ واجد کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی۔ "واجد! تم ڈیڈی کے ساتھ آئے ہو۔ میرا دل کہتا تھا۔ میری محبت ایک دن ضرور تمہیں کھینچ لائے گی۔"

وہ سخت لہجے میں بولا۔ "میرا بیٹا کہاں ہے؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "تمہارا بیٹا؟ تم مجھ سے اپنے بیٹے کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

سرفراز نے کہا۔ "واجد تمہیں الزام دے رہا ہے کہ تم نے اس کے بیٹے کو کڈنیپ کیا ہے۔"

"واٹ!" وہ حیرانی سے بولی۔ "میں نے کڈنیپ کیا ہے اور تمہارے بیٹے کو؟ واجد تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تم نے ثمینہ کی ہلاکت کا الزام مجھ پر لگایا اور اب کہہ رہے ہو کہ میں مجرموں کی طرح تمہارے وکی کو اٹھا لائی ہوں۔"

"ہاں، آج دن کے ایک بجے تم اسے اسکول سے لے گئی تھیں۔"

"دن کے ایک بجے؟ میں تو صبح نو بجے سے یہاں اس کاٹیج میں ہوں۔ میرے فارم کے ملازم اس بات کی گواہی دیں گے۔ تم اندر آؤ۔ اس کاٹیج کا گوشہ گوشہ دیکھ لو۔ یہ فارم چار مربع کلو میٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ پورے فارم میں اسے تلاش کرلو۔ جب میں یہاں ہوں تو پھر تمہارے بیٹے کو بھی یہیں ہونا چاہئے۔"

واجد تیزی سے چلتا ہوا کاٹیج کے اندر آیا پھر بیٹے کو آوازیں دیتا ہوا اسے ہر جگہ ڈھونڈنے لگا۔ "وکی۔ وکی تم کہاں ہو؟ میں تمہیں لینے آیا ہوں بیٹے۔"

اس کے ساتھ سرفراز خان بھی وکی کو آوازیں دیتا ہوا تلاش کررہا تھا۔ شیبا ان کے پیچھے پیچھے گھوم رہی تھی۔ وکی کہیں نظر نہیں آیا۔ واجد تھک ہار کر کاٹیج کے باہر برآمدے میں آگیا۔ پریشان ہو کر دور تک دیکھنے لگا۔

شیبا نے اس کے قریب آکر کہا۔ "تم اچھی طرح اطمینان کرلو۔ یہاں کوئی تہہ خانہ نہیں ہے۔ پلیز واجد میرے لئے جو غلط فہمیاں ہیں اسے دل سے نکال دو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی گاڑی کی طرف جاتا ہوا سرفراز سے بولا۔ "میں آپ کے فارم کے ایک ایک حصے میں جانا چاہتا ہوں۔ اپنا اطمینان کرکے آؤں گا۔"

وہ اپنی گاڑی کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بیٹھنے لگا۔ شیبا دوڑتی ہوئی آکر اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں اپنا پورا فارم تمہیں دکھاؤں گی۔ فارم کے آس پاس کے لوگوں سے بھی پوچھ سکو گے کہ انہوں نے میرے ساتھ کسی بچے کو یہاں دیکھا ہے یا نہیں۔"

وہ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ شیبا نے کہا۔ "تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم اپنے بیٹے کو کتنا چاہتے ہو۔ اس کے لئے کس قدر پریشان ہو رہے ہو۔ کیا تم نے اس کے اغوا ہونے کی رپورٹ درج کرائی ہے۔"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "نہیں۔"

"یہ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھ پر شبہ کرکے سیدھے یہاں چلے آئے ہو۔ کوئی بات نہیں میں تمہاری بے اعتنائی، تمہاری نفرت برداشت کرتی رہوں گی مگر تمہیں سب سے پہلے رپورٹ درج کرانی چاہئے تھی۔"

"یہاں سے جاکر درج کراؤں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تمہارے ساتھ دن رات اسے تلاش کروں گی۔"

وہ کچھ نہ بولا، خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا فارم کے ایک ایک حصے سے گزرتا رہا۔ وہ بولی۔ "تم کبھی سمجھ نہیں پاؤ گے کہ میں دیوانگی کی حد تک تمہیں چاہتی ہوں۔ میں تمہارے چہرے پر مسکراہٹ لانے کے لئے پانی کی طرح اپنی دولت بہا کر وکی کو ڈھونڈ نکالوں گی۔"

اس نے ایک جگہ گاڑی روک دی پھر اپنے موبائل کے ذریعے وکی کے نانا اور نانی سے رابطہ کیا پھر پوچھا۔ "ہیلو انکل! وکی کا کچھ پتا چلا؟"

دوسری طرف سے وکی کے نانا نے کہا۔ "ابھی پندرہ منٹ پہلے کسی عورت نے فون کیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی وکی اس کے پاس، خیریت سے ہے اور خیریت سے رہے گا۔"

"وہ عورت کون ہے؟ وکی کو کہاں لے گئی ہے؟ وہ چاہتی کیا ہے؟"

"وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ اس نے تمہارے موبائل پر رابطہ کیا تھا مگر تم سے رابطہ نہ ہو سکا۔"

واجد نے کہا۔ "میں شہر سے تین سو کلومیٹر دور ہوں اس لئے موبائل پر رابطہ نہیں ہوا۔ میرے موبائل کی بیٹری بھی ڈاؤن ہو رہی ہے۔ یہ بتائیں اس نے اور کیا کہا ہے۔"

"اس نے کہا ہے کہ آج رات دو بجے تمہارے موبائل پر رابطہ کرے گی یا پھر ہمارے فون پر تم سے بات کرے گی۔ تم جہاں بھی ہو فوراً یہاں چلے آؤ۔ رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ وہ دو گھنٹے بعد فون کرے گی۔"

"میں ابھی آرہا ہوں۔" اس نے فون بند کیا پھر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا کاٹیج کی طرف جانے لگا۔

شیبا نے کہا۔ "تھینکس گاڈ' ہمارے بیٹے کا سراغ مل گیا ہے۔"

واجد نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ وکی کو ہمارا بیٹا کہہ رہی تھی۔ خود کو اس سے اور اس کے بیٹے سے جوڑ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "واجد وہ خیریت سے ہے نا؟ فون پر تمہاری باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی عورت کے پاس ہے' تم پوچھ رہے تھے کہ وہ کیا چاہتی ہے؟"

اس نے کاٹیج کے سامنے گاڑی روک کر سرفراز سے کہا۔ "وکی کا سراغ مل رہا ہے۔ کوئی عورت اسے لے گئی ہے۔ اس کے سلسلے میں مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ میں جارہا ہوں مجھے دو گھنٹے کے اندر وہاں پہنچنا ہے۔"

شیبا نے کہا۔ "ڈیڈ! میں واجد کے ساتھ جارہی ہوں آپ کاٹیج لاک کرکے چلے آئیں۔ آپ ہم سے فون پر رابطہ رکھیں۔"

شیبا کو موقع ملا تھا' وہ وکی کے بہانے اس کے ساتھ لگی رہنا چاہتی تھی۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا شہر کی طرف جارہا تھا۔ شیبا نے کہا۔ "واجد باتیں کرو۔ دماغ کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ وکی میرے پاس نہیں ہے۔ میرے سلسلے میں تمہاری غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے۔"

اس نے کہا۔ "میرا بیٹا مل جائے گا تو میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔"

"میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ تم مجھ سے کم تر ہو کر معافی مانگو۔ مرد عورت سے برتر

رہے تو اچھا لگتا ہے۔ تم میرے حواس پر چھائے ہوئے ہو۔ مجھ سے ہمیشہ برتر رہو گے۔"

"شیبا میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جب بھی تم مجھ سے گفتگو کرتی ہو تو تمہاری آواز میں اور تمہارے لہجے میں پیار کی شدت ہوتی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم مجھے واقعی دیوانگی کی حد تک چاہتی ہو لیکن............"

"لیکن کیا؟ دل میں کوئی پھانس نہ رہ جائے۔ نکال ڈالو۔"

"میں۔ دراصل میں ثمینہ کے معاملے میں الجھ گیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں جس طرح وکی کے سلسلے میں تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی ہے اسی طرح ثمینہ کے معاملے میں میری طرف سے تمہارا دل صاف ہو جائے گا۔"

"میرے لئے یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ میں تمہاری چاہت کا جواب چاہت سے کیسے دوں؟ میں اپنے ساس سسر کو آمنہ کے لئے زبان دے چکا ہوں۔"

"ابھی آمنہ کی نہیں' صرف چاہت کی بات کرو۔ مقدر کا لکھا کوئی نہیں جانتا۔ آگے کیا ہونے والا ہے؟ کبھی بارات ایک دلہن کے لئے آتی ہے مگر دوسری دلہن سے شادی ہو جاتی ہے۔ تم ابھی اتنا بتاؤ کہ مجھے چاہتے ہو یا نہیں؟"

"محبت کا جواب محبت سے دینا چاہئے اور میں تمہاری محبت کی انتہا دیکھ رہا ہوں۔ اس کے باوجود اپنے دل کی بات زبان پر نہیں لاؤں گا۔ پلیز ابھی صرف میرے بیٹے کی باتیں کرو۔"

وہ وکی کے بارے میں بڑی محبت سے بولنے لگی۔ واجد نے موبائل کے ذریعے اپنے سسر سے کہا۔ "میں ابھی پہنچنے ہی والا ہوں دو بجنے والے ہیں۔ اس عورت کا فون آئے تو کہنا میں پندرہ منٹ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ وہ آدھے گھنٹے بعد مجھ سے فون پر بات کر سکے گی۔"

شیبا نے کہا۔ "یہ ضرور ایسا کوئی گینگ ہے جو بچوں کو اغوا کرتا ہے۔ انہیں دوسرے ملکوں میں لے جا کر فروخت کرتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ عورت کون ہو سکتی ہے۔ اگر وہ عورت ایسے کسی گینگ سے تعلق رکھتی ہے تو پھر مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتی ہے؟"

"یہ لوگ بڑی بڑی رقمیں وصول کرنے کے لئے عورتوں' بچوں اور بوڑھوں کو اغوا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ عورت تم سے دو چار لاکھ روپے کا مطالبہ کرے گی۔"

"دو چار لاکھ کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کی سلامتی اور واپسی چاہتا ہوں۔"

"اللہ نے چاہا تو وہ سلامت بھی رہے گا اور واپس بھی آجائے گا۔"

وہ اپنے سسرال پہنچ گیا۔ اس نے اپنی ساس اور سسر سے شیبا کا تعارف کرایا۔ اس کی ساس نے کہا۔ "ہائے اللہ! تم وہی ہو جس نے ثمینہ کو لپ اسٹک دی تھی۔"

واجد نے کہا۔ "پلیز آنٹی' کسی ثبوت کے بغیر آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔"

"ہائے بیٹا! تم تو یہی کہہ رہے تھے کہ اسی نے وہ لپ اسٹک دی ہوگی۔"

اس کے سسر نے ڈانٹ کر کہا۔ "کم بولا کرو۔ خاموش رہو۔ آؤ بیٹی اندر آؤ۔ واجد کے ساتھ آئی ہو تو اس کا مطلب ہے تمہارے بارے میں غلط رائے قائم کی گئی تھی۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "تھینک یو انکل! میں نے پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے کہا ہے وہ جلد ہی اس قاتل کو گرفتار کریں گے جس نے ایک لپ اسٹک کے ذریعے اتنی بڑی واردات کی ہے۔"

وہ تقریباً رات کے ڈھائی بجے پہنچے تھے۔ اس نامعلوم عورت نے اب تک فون نہیں کیا تھا۔ اس کی ساس چائے بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ شیبا نے اس کے سسر سے پوچھا۔ "گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟ آپ اور آنٹی تنہا رہتے ہیں؟"

"ہماری ایک بیٹی آمنہ ہے۔ وہ اپنے ننھیال میں رہتی ہے۔ وہیں تعلیم حاصل کررہی ہے۔ ہمارا نواسہ وکی ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ اللہ اسے خیریت سے واپس لائے۔ وہ ہم بوڑھوں کی تنہائی دور کرتا ہے۔"

تھوڑی دیر میں چائے آگئی۔ وہ سب چائے پینے لگے۔ ایسے وقت فون کی گھنٹی سنائی دی۔ واجد نے لپک کر ریسیور اٹھایا پھر بولا۔ "ہیلو میں واجد بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے ایک عورت کی کرخت آواز سنائی دی۔ "ہیلو! بیٹے کو تلاش کررہے ہو؟ یہ لو اس کی آواز سنو۔"

چند سیکنڈ کے بعد ہی اسے اپنے بیٹے وکی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو ابو! میں وکی بول رہا ہوں۔ آپ یہاں کب آئیں گے؟ آنٹی کہہ رہی ہیں بہت رات ہوگئی ہے۔ مجھے سو جانا چاہیے آپ کل آئیں گے۔"

اسی فون پر اس نامعلوم عورت کی آواز سنائی دی۔ "وکی بیٹے زیادہ نہیں بولتے۔

میں نے تمہیں نیند سے جگایا ہے۔ ابو سے پوچھو وہ کب آئیں گے؟ پھر جواب سن کر سو جاؤ۔"

وکی نے پوچھا۔ "ابو آپ کب آئیں گے؟"

اس عورت نے کہا۔ "مسٹر واجد! بالکل مختصر سا جواب دو۔ کل شام کو آنا مناسب رہے گا کیونکہ میرا مطالبہ پورا کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

واجد نے کہا۔ "وکی بیٹے! تمہاری آواز سن کر اطمینان ہورہا ہے۔ میں کل شام تک تمہیں لینے آؤں گا۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ شاید وہ وکی کو سلا رہی تھی پھر اس کی آواز سنائی دی "سوری تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ تمہیں یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں سنگ دل بھی ہوں اور رحم دل بھی۔ سنگ دل اس لئے کہ بیٹے کو باپ سے جدا کردیا ہے اور رحم دل اس لئے کہ تمہارے بیٹے کو بڑے آرام سے زندہ سلامت رکھا ہے۔"

واجد نے پوچھا۔ "تم ایسا کیوں کررہی ہو؟"

"پاپی پیٹ کی خاطر کررہی ہوں۔ میں ان دنوں سخت مشکلات میں ہوں۔ مجھے دو کروڑ روپے کی ضرورت ہے۔ تم میری مشکل آسان کردو اور بیٹے کو لے جاؤ۔"

وہ حیرانی سے تقریباً چیخ کر بولا۔ "کیا؟ دو کروڑ روپے؟"

شیبا اور اس کی ساس سسر نے سوالیہ نظروں سے واجد کو دیکھا۔ واجد نے کہا۔ "میں دو چار لاکھ کا آدمی ہوں۔ فشریز کا ایک معمولی ٹھیکے دار ہوں۔ میں نے کبھی دو کروڑ روپے ایک ساتھ نہیں دیکھے۔"

"مگر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہیں بیٹے کی اور مجھے دو کروڑ کی ضرورت ہے۔"

"پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے بارے میں تمہاری معلومات غلط ہیں۔ میں کروڑ پتی نہیں ہوں۔ مجھ سے دو تین لاکھ کی باتیں کرو۔ میں اتنی رقم لے کر کل ہی تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

وہ سخت لہجے میں بولی۔ "میں فون پر لمبی گفتگو نہیں کروں گی۔ کل شام تک میرا مطالبہ پورا کرو۔ چاہو تو اور چوبیس گھنٹے کی مہلت لے لو۔ مجھے ہر حال میں میری مطلوبہ رقم چاہیے۔ ورنہ پرسوں شام کو اس شہر کے کسی بھی حصے میں تمہیں اپنے بیٹے کی لاش ملے گی اور اتنی عقل تو تمہیں ہے کہ اس سلسلے میں پولیس کو انفارم کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا

ہے۔ میں کل صبح دس بجے تمہارے موبائل پر رابطہ کروں گی۔"

دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا۔ وہ ہیلو ہیلو کہہ کر پکارتا رہا پھر اس نے بھی ریسیور رکھ کر اپنی ساس اور سسر کو دیکھا۔ ساس نے کہا۔ "بیٹا! کیا وہ دو کروڑ مانگ رہی ہے؟ یہ کون پاگل ہے؟ ہم نے تو خواب میں بھی اتنے روپے نہیں دیکھے۔"

شیبا نے کہا۔ "واجد! کسی نے تمہارے بارے میں اسے غلط اطلاع دی ہے۔ اسے بتایا گیا ہوگا کہ تم کروڑپتی ہو اسی لئے وہ اتنا بڑا مطالبہ کررہی ہے۔"

واجد نے کہا۔ "میں اسے اپنی حیثیت بتا رہا تھا مگر اس نے نہیں سنی۔ اسے بھی یقین نہیں آئے گا اور اگر یقین آئے گا کہ میری حیثیت ایسی نہیں ہے اور میں دو چار لاکھ سے زیادہ ادا نہیں کرسکوں گا تو پھر وہ میرے بیٹے کو نقصان پہنچائے گی۔ اس نے بہت بڑی رقم کے لئے یہ واردات کی ہے۔ وہ دو چار لاکھ لینے کے لئے لین دین کا خطرہ مول لینا نہیں چاہے گی۔"

اس کے سسر نے کہا۔ "اگر معلوم ہوتا کہ وہ عورت کہاں ہے تو میں اس کے قدموں میں جاکر گر پڑتا۔"

واجد نے کہا۔ "انکل ہوش کی باتیں کریں۔ اس عورت کا پتا معلوم ہوتا تو ہم اس کے قدموں پر نہیں گرتے وہ ہمارے قدموں میں گر کر معافی مانگتی ہم اسے سزا دلائے بغیر نہ چھوڑتے۔"

شیبا نے کہا۔ "ان باتوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ ایسے جرائم کرنے والے نہ اپنا پتا ٹھکانا بتاتے ہیں نہ اپنا چہرہ دکھاتے ہیں۔ یہ بتاؤ وہ آئندہ کب فون کرے گی؟"

"کل صبح دس بجے۔"

شیبا نے پوچھا۔ "تم اس عورت کا مطالبہ پورا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کتنی رقم حاصل کرسکتے ہو؟"

"میرے پاس تقریباً ساڑھے چار لاکھ روپے ہیں۔ اپنی بوٹ کو بیچنے کے بعد تقریباً پندرہ لاکھ ہوجائیں گے۔"

اس کے سسر نے کہا۔ "ہم اپنی یہ کوٹھی بیچ دیں گے۔ اس کے پچیس لاکھ ضرور مل جائیں گے۔"

شیبا نے کہا۔ "سب کچھ بیچ دینے کے بعد بھی اس کے مطالبے کا چوتھائی حصہ نہیں

ہو رہا ہے۔"

واجد گہری سنجیدگی اور پریشانی سے سوچ رہا تھا اور بے خیالی میں شیبا کو تک رہا تھا۔ شیبا نے کہا۔ "واجد تم جانتے ہو۔ میرے لئے دو کروڑ روپے ریت کے ایک ذرے کے برابر ہیں۔ یہ رقم میں تمہیں دوں گی۔"

واجد نے چونک کر کہا۔ "تم؟ ہاں، تم دے سکتی ہو مگر........"

"مگر کیا؟ ایسے وقت تم خودداری دکھاؤ گے؟"

اس کی ساس نے کہا۔ "بیٹا! اللہ تعالیٰ نے شیبا کو وسیلہ بنا کر بھیجا ہے۔ تم اس سے قرضہ لے لو۔"

وہ بولا۔ "آنٹی! دو کروڑ کا قرضہ لینا کوئی کھیل تو نہیں ہے۔"

شیبا نے کہا۔ "پلیز، ابھی قرضے کی بات نہ کرو بیٹے کی سلامتی دیکھو۔ وہ سنگ دل عورت ناکام ہونے کے بعد پتا نہیں ہمارے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔"

واجد کو ایسا لگا جیسے وہ بڑی اپنائیت سے وکی کو ہمارا بیٹا کہہ رہی ہو۔ اس نے سوچا کہ وہ کیوں شیبا کی اس چاہت کو نظرانداز کررہا ہے جو اس کے لئے اور اس کے بیٹے کے لئے ہے۔ اس نے وکی کے اغوا کے سلسلے میں شیبا پر شبہ کیا تھا اور یہ شبہ غلط ثابت ہو رہا تھا۔ ثمینہ کے سلسلے میں بھی وہ خوامخواہ ایک ایسی عورت کے خلاف سوچ رہا ہے جو اسے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔

وہ سر جھکائے گہری سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ شیبا نے کہا۔ "تم بہت پریشان ہو۔ میں نہیں جانتی تم اس پریشانی میں کیا فیصلہ کرو گے لیکن میں جانتی ہوں کہ وکی کو ہر حال میں وہاں سے لانا ہے اور میں ضرور لاؤں گی۔"

اس کے سسر نے کہا۔ "بیٹی! تم ہمارے لئے رحمت بن کر آئی ہو۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم وکی کو بخیریت واپس لے آؤ گی۔ بیٹی میں تمہیں کچھ زیادہ تو نہیں دے سکتا۔ صرف دعائیں دے سکتا ہوں اور یہ کوٹھی تمہارے نام کرسکتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "انکل آپ لین دین کی بات نہ کریں۔ میں آپ سے کچھ نہیں لوں گی۔ وکی میرا بھی بیٹا ہے میں اسے لے آؤں گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ واجد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو میں تمہیں پہنچادوں۔"

وہ دونوں وہاں سے سرفراز خان کی کوٹھی میں آئے۔ وہ بھی فارم ہاؤس سے واپس

آچکا تھا۔ شیبا نے اسے وکی کے سلسلے میں تمام باتیں تفصیل سے بتائیں۔ سرفراز نے خوش ہو کر کہا۔ "دو کروڑ تو کیا ہم دو سو کروڑ دے سکتے ہیں۔ میں نے تو واجد سے پہلے ہی کہا تھا کہ میرا جو کچھ ہے وہ میری بیٹی کا ہے اور جو میری بیٹی کا ہے وہ ہمارے واجد بیٹے کا ہے۔"

واجد کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ اسی ڈرائنگ روم سے باغیانہ انداز میں ان کی بہت بڑی آفر کو ٹھکرا کر گیا تھا۔ اب اسی ڈرائنگ روم میں صرف دو کروڑ کی معمولی رقم کے لئے اس کا سر جھک گیا تھا۔

شیبا نے کہا۔ "بہت رات ہو چکی ہے۔ واجد! اگر مائنڈ نہ کرو تو مجھے میرے گھر تک پہنچا دو۔"

"اس میں مائنڈ کرنے کی کیا بات ہے۔ یوں بھی مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ آؤ چلو۔"

رخصت ہوتے وقت سرفراز خان نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "آج سے تم میرے بیٹے ہو۔ وکی کی ذرا فکر نہ کرو۔ وہ تمہیں بخیریت ملے گا۔"

وہ مصافحہ کرکے شیبا کے ساتھ باہر آیا۔ شیبا نے اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی گاڑی فارم ہاؤس میں چھوڑ آئی ہوں ورنہ تمہیں زحمت نہ دیتی۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اپنے ڈیڈی کے ساتھ نہیں رہتی ہو؟"

"نہیں۔ ڈیڈی نے میرے حصے کا کاروبار اور جائیداد میرے نام لکھ دی ہے۔ ویسے ان کے بعد تو سب کچھ میرا ہونے والا ہے۔"

اس نے شیبا کی کوٹھی میں پہنچ کر پوچھا۔ "تم اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا رہتی ہو؟"

"کیا کروں کوئی اپنا نہیں ہے۔ رشتے دار خودغرض ہیں۔ کسی کو سہیلی بناتی ہوں تو وہ قرضہ مانگ کے لے جاتی ہے پھر منہ چھپاتی رہتی ہے۔ دولت مند ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ کوئی اپنا بن کر نہیں رہتا۔ کبھی نہ کبھی خودغرضی دکھا جاتا ہے۔"

"ہاں' غریبی میں بھی مشکلات ہیں اور امیری میں بھی۔ انسان بلندی میں رہے یا پستی میں اسے اپنے حالات کے مطابق مشکلات سے نمٹنا پڑتا ہے۔"

"تمہاری مشکل آسان ہو رہی ہے۔ کل ہمارا بیٹا واپس مل جائے گا مگر تمہارے چہرے پر خوشی نہیں ہے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "نہیں میں تو خوش ہوں۔ میرے لئے اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ میرے بیٹے پر اب کوئی مصیبت نہیں آئے گی اور وہ سلامتی سے مجھے مل جائے گا۔"

"تو پھر اتنے خاموش اور سنجیدہ کیوں ہو؟ تمہیں تو ہنسنا بولنا چاہئے۔ کم از کم مسکرانا تو چاہئے۔"

"وہ.......... بات یہ ہے کہ میں وکی کے نانا سے اپنی شادی کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے کروں۔ میرے انکار سے ان سب کو تکلیف پہنچے گی۔"

وہ بولی۔ "تعجب ہے۔ تم ان کے نواسے کو اغوا کرنے والوں کے چنگل سے نکال رہے ہو۔ اس معصوم بچے کو زندہ سلامت واپس لا رہے ہو تو کیا وہ اتنا نہیں سمجھیں گے کہ کسی کی جان بچانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔"

واجد نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ شاید وہ نہیں سمجھ پائیں گے۔"

"تو پھر ابھی جاکر ان سے پوچھ لو کہ وہ ایک بڑی قربانی دے کر اپنے نواسے کی زندگی بچانا چاہتے ہیں یا نہیں۔"

"ان سے پہلے میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ اگر وہ راضی نہ ہوئے تو کیا تم مجھے دو کروڑ جیسی بھاری رقم قرض کے طور پر دوگی؟"

"تم میری نظروں میں بہت اونچا مقام رکھتے ہو۔ مجھ سے قرض مانگنے والی بات نہ کرو۔ میرا جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے۔ میں ایک شرط پر دو کروڑ روپے دوں گی۔"

واجد نے دل میں کہا۔ "میں جانتا ہوں۔ یہ شادی کرنے کی شرط پیش کرے گی۔ ہماری دنیا میں کچھ لئے بغیر کچھ دیا نہیں جاتا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "وہ شرط کیا ہے؟"

"میرے پاس پانچ لاکھ ڈالرز کا کریڈٹ کارڈ ہے۔ وہ کارڈ تم مجھ سے لو گے اور وہ پانچ لاکھ ڈالرز خرچ کرتے رہو گے۔ اپنے لئے شان دار کوٹھی بناؤ گے۔ نئی کار خریدو گے اور ہماری سطح پر پہنچ کر زندگی گزارتے رہو گے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارے پانچ لاکھ ڈالرز کا مطلب ہے۔ تین کروڑ روپے۔ یہ تین کروڑ روپے کوئی تین روپے تو نہیں ہیں۔ تم اتنی بڑی رقم مجھے کیوں دینا چاہتی ہو؟"

"میں وکی کی واپسی کے لئے دو کروڑ کیوں دے رہی ہوں؟ جب تم یہ سوال نہیں کر رہے ہو تو پھر آگے کوئی سوال نہ کرو۔ میں خوش رہنا چاہتی ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تم سے کچھ حاصل کرکے خوش رہوں۔ تم میری سطح پر آکر باوقار طریقے سے زندگی گزارتے رہو گے تو میں تمہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہوں گی۔"

"نہیں شیبا تم مجھ پر بوجھ ڈال رہی ہو۔ یہ اتنا بڑا بوجھ ہے کہ میں اس کے نیچے کچل کر رہ جاؤں گا۔"

"وہ بولی کتنی عجیب بات ہے کہ میں تمہاری شریکِ حیات بننا چاہوں گی تو یہ سمجھا جائے گا کہ میں اپنی دولت سے تمہیں خرید رہی ہوں۔ اگر میں کسی لالچ اور خودغرضی کے بغیر اپنے پیار کی خاطر اپنے محبوب کو باعزت اور باوقار زندگی گزارتے دیکھ کر خوش رہنا چاہوں گی تو تم میری اس محبت کو بوجھ سمجھ رہے ہو اور سمجھتے رہو گے۔"

"شیبا! میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرے گا کہ تم ساری زندگی میری خوشیاں چاہتی رہو اور میں تمہیں ایک لمحے کی بھی خوشی نہ دے سکوں۔ یہ تو سراسر میری خودغرضی اور بے حسی ہوگی۔"

"تم خوامخواہ کیوں بجھ رہے ہو۔ فی الحال تمام الجھنوں کو ذہن سے نکال دو۔ صرف ہمارے بیٹے کی باتیں کرو۔ وہ نامعلوم عورت کل صبح دس بجے فون کرے گی اور دس بجنے میں اب صرف پانچ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ تم نے رات سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں تمہاری بھوک پیاس اُڑ گئی ہے مگر کچھ تو کھانا چاہئے۔"

اس نے ایک ملازمہ کو بلا کر ناشتا اور پھلوں کا جوس لانے کے لئے کہا پھر اس سے بولی۔ "تم اس نامعلوم عورت سے فون پر کس طرح معاملات طے کرو گے؟ رقم کے سلسلے میں کوئی فکر نہیں ہے۔ تم یہ رقم ایک بریف کیس میں لے جاؤ گے لیکن وہ بریف کیس اس وقت تک کسی کے حوالے نہیں کرو گے جب تک کہ وکی تمہاری گود میں نہیں آجائے گا۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"ہاں، میں یہی کروں گا۔ پتا نہیں وہ رقم لینے اور وکی کو واپس کرنے کے لئے مجھے کہاں بلائے گی۔ میرا خیال ہے وہ عورت خود نہیں آئے گی۔ کسی دوسرے کو بھیجے گی۔"

شیبا نے صوفے سے اٹھ کر ایک الماری کھولی پھر وہاں سے ایک ریوالور نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ پوری طرح لوڈڈ ہے۔ تم وہاں خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے۔

خدانخواستہ انہوں نے دھوکا دیا تو یہ ریوالور تمہارے کام آئے گا۔"

اس نے ریوالور لے کر صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم میرے لئے اور میرے بیٹے کے لئے اتنا کچھ کر رہی ہو کہ اب مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیسی شرمندگی؟"

"یہی کہ میں نے تمہارے بارے میں غلط رائے قائم کی تھی۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "اب میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں اپنے خیال کا اظہار بڑی محبت سے کروں گا مگر تھوڑا انتظار کرو۔ میرا بیٹا مجھے مل جائے گا تو میں دیوانہ وار تمہاری زلفوں کی چھاؤں میں آجاؤں گا۔"

وہ خوشی سے کھل گئی اور اسے رخصت کرنے کے لئے کوٹھی کے باہر پورچ تک آئی۔ وہ اس سے مصافحہ کرکے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ اسے بڑی چاہت سے اور بڑی لگن سے دیکھ رہی تھی۔ جس کی چاہت میں پاگل ہو رہی تھی اب وہ اسے ملنے والا تھا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھ گیا اور وہ گنگناتے ہوئے کوٹھی کے اندر چلی گئی۔

نائٹ چوکیدار نے بڑے آہنی گیٹ کو کھولا۔ واجد گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا احاطے سے نکل کر گاڑی کو ایک طرف موڑنا چاہتا تھا کہ اسی موڑ پر دوسری کار آرہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے رک گئیں پھر اس کار نے ذرا پیچھے ہو کر واجد کو آگے جانے کا موقع دیا۔ وہ ڈرائیو کرتا ہوا آگے چلا گیا۔ کار آگے بڑھ کر اسی گیٹ کے سامنے آئی۔ چوکیدار گیٹ بند کر رہا تھا۔ اس نے پھر گیٹ کو کھولا وہ کار اندر آکر پورچ میں رک گئی۔ ایک عمر رسیدہ خاتون نے کار سے اتر کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ ایک ملازم نے آکر دروازہ کھولا پھر اسے دیکھ کر بولا۔ "میڈم بیڈ روم میں ہیں۔"

وہ اندر آکر کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے شیبا کے بیڈ روم میں آئی۔ وہ اسے دیکھ کر بولی۔ "آنٹی آپ اس وقت آئی ہیں؟"

آنٹی نے اندر آکر اپنا پرس ایک طرف رکھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "صبح ہو چکی ہے۔ میں دن نکلنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ تم سے وکی کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ کچھ بات بن رہی ہے یا نہیں؟"

"میں نے آپ کو تاکید کی تھی کہ مجھ سے کبھی ملاقات نہ کریں۔ فون پر بات کریں۔ آپ یہاں کیوں چلی آئی ہیں؟"

"میں کئی بار فون کر چکی ہوں۔ یہاں تم فون اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔"

"میں ابھی ایک گھنٹے پہلے آئی ہوں۔ تمام رات واجد کے ساتھ مصروف رہی ہوں۔ آپ نے موبائل پر بات کیوں نہیں کی؟"

"میں نے موبائل پر بھی رابطہ کیا تھا مگر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ تم نے اسے بند رکھا ہوگا یا اس میں کوئی خرابی ہوگی۔ مجھے دس بجے واجد سے فون پر بات کرنا ہے۔ مجھے کچھ معلوم تو ہو کہ وہ دو کروڑ کی ادائیگی کے لئے راضی نہیں ہوگا تو مجھے جواباً کیا کہنا چاہیے۔"

شیبا نے کہا۔ "وہ کیا راضی ہوگا۔ راضی تو میں ہوں۔ آپ میرے لئے اتنی بھاگ دوڑ کر رہی ہیں۔ آپ کو دو لاکھ روپے مل جائیں گے۔"

"میں جانتی ہوں تم زبان کی پکی ہو۔ میں اس کام کے عوض تم سے ایک پیسہ نہ لیتی مگر کیا کروں کینیڈا سے بیٹی کا خط آیا ہے۔ وہ وہاں مقابلہ حسن میں حصہ لے رہی ہے۔ اسے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ آپ مجھ سے رقم کیوں لے رہی ہیں۔ کل میں آپ کو رقم دوں گی۔ آپ کینیڈا چلی جائیں گی پھر کبھی واپس نہیں آئیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے یہ بتاؤ اس کے بیٹے کو کہاں پہنچاؤں اور اس سے رقم کس طرح لوں۔"

"آپ آج شام کو اسے ہلٹن میدان میں بلائیں گی۔ وکی کو اپنی کار میں بٹھا کر لے جائیں گی۔ آپ کی کار کے شیشے کلرڈ ہیں۔ آپ کار میں بیٹھی رہیں گی وہ آپ کی صورت نہیں دیکھے گا۔ آپ وہاں اندر بیٹھے بیٹھے اپنی کار کی ڈکی کھولیں گی۔ وہ اس ڈکی میں نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس رکھ دے گا۔ آپ وکی کو کار سے باہر نکالیں گی۔ وہ باپ کے پاس جائے گا اور آپ واپس آجائیں گی۔"

"ٹھیک ہے بیٹی' میں یہی کروں گی۔ میں اتنی سی بات فون پر معلوم کر سکتی تھی مگر کیا کروں تم سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ آپ یہ بات کتنی بار کہیں گی۔ واجد سے فون پر معاملات طے کرنے کے بعد آپ آج ہی کینیڈا جانے والی کسی فلائٹ میں ایک سیٹ حاصل کریں گی۔ یہاں سے چلی جائیں گی۔ میری شادی سے پہلے واپس نہیں آئیں گی۔"

وہ اپنا پرس اٹھا کر وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ "تم فکر نہ کرو۔ واجد نے میری

صورت نہیں دیکھی ہے اور نہ میں دکھاؤں گی۔"

وہ چلی گئی۔ شیبا نے تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گرتے ہوئے کہا۔ "آہ! واجد! تم نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ میں تمہیں حاصل کرنے کے لئے ایسا کر رہی ہوں لیکن ڈیڈی اور ڈاکٹر انکل کو جب یہ معلوم ہوگا تو وہ مجھے ایب نارمل کہیں گے۔"

☆------☆------☆

وقتِ مقررہ پر ٹھیک دس بجے فون پر رابطہ ہوا۔ یہ معاملات طے ہوگئے کہ وہ آج شام پانچ بجے اس کی مطلوبہ رقم لے کر ہلٹن میدان میں آئے گا اور وہ وکی کو وہیں اس کے حوالے کردے گی۔ اس سلسلے میں اس نے تاکید کی کہ ایسے وقت ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہیں ہوگا۔

واجد نے وہ دن بڑی بے چینی اور بڑے کرب سے گزارا پھر شام پانچ بجے سے پہلے ہی اس میدان میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر بھی انتظارِ کرب سے گزرتا رہا۔ وہ ٹھیک پانچ بجے اپنی کار ڈرائیو کرتے ہوئے آئی اور کار کو ٹھیک واجد کی گاڑی کے سامنے روک دیا۔

واجد بیٹے کو حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ وہ فوراً ہی اپنی گاڑی سے باہر آیا۔ فون پر یہی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بریف کیس لے کر ڈکی کے پاس جائے گا۔ وہ ہدایت کے مطابق بریف کیس لے کر وہاں آیا۔ ڈکی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے بریف کیس کو اندر رکھ کر اس ڈکی کو بند کردیا۔ اس کے بند ہوتے ہی کار کا ایک دروازہ کھلا۔ وکی ابو کہتا ہوا باہر آگیا۔

واجد نے دوڑتے ہوئے آکر بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ کار کا دروازہ بند ہوگیا۔ وہ اسٹارٹ ہو کر وہاں سے جا رہی تھی۔ واجد نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تو اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ کار وہی تھی جسے اس نے شیبا کی کوٹھی کے احاطے میں جاتے دیکھا تھا۔ احاطے کے اندر جانے سے پہلے وہ دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کے سامنے آکر رکی تھیں پھر اس کار نے واجد کو آگے جانے کا موقع دیا تھا۔ ایسے وقت اس نے نہ کار کا رنگ دیکھا تھا نہ ماڈل دیکھا تھا۔ اس کی نمبر پلیٹ پر صرف ایک نظر ڈالی تھی پھر وہاں سے گزر گیا تھا۔

کار کا نمبر ایسا تھا۔ جسے یاد رکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کا نمبر ایک بچے کو بھی یاد ہو جاتا۔ اس کار کا نمبر اکیسویں صدی کے آخری سال کا نمبر تھا۔ اس کار پلیٹ پر "DH 2000" لکھا ہوا تھا۔

وہ بیٹے کو سینے سے لگائے میدان میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کار کو جاتے ہوئے دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ "یہ کار شیبا کی کوٹھی میں گئی تھی۔ کیوں گئی تھی؟"

جواب صاف سمجھ میں آرہا تھا۔ اس کار والی کا تعلق شیبا سے ہے۔

وکی اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ بڑی پیار بھری باتیں کررہا تھا لیکن واجد کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ بیٹے نے باپ کو چوم کر کہا۔ "ابو آپ نے مجھے کس نہیں کیا۔"

اس نے چونک کر بیٹے کو دیکھا پھر اسے کس کرتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹے عورت کون تھی۔ اس نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟"

"نہیں ابو یہ آنٹی بہت اچھی ہیں۔ انہوں نے مجھے اسکول میں آکر کس کیا تھا۔ مجھے ایک ٹافی دی تھی۔ بڑی مزے دار ٹافی تھی۔ کھانے کے بعد مجھے نیند آگئی۔"

"تم آنٹی کے ساتھ کیسے رہ گئے؟ کیا تمہیں ان سے ڈر نہیں لگتا تھا؟"

"نہیں ابو۔ آنٹی بہت اچھی ہیں۔ ان کے پاس کارٹون بکس ہیں' کارٹون فلمیں ہیں اور اتنے مہنگے مہنگے کھلونے ہیں کہ ایسے کھلونے آپ میرے لئے کبھی نہیں لائے۔"

"میں سمجھ گیا کہ اس عورت نے کس طرح تمہیں خوش رکھا ہوگا۔ اغوا کرنے والے بچوں کو قیدی بنا کر بھوکا پیاسا رکھتے ہیں مگر........"

اس نے سوچا۔ "مجھے یہ سمجھنا چاہئے کہ میرے بیٹے کو اغوا کیا گیا مگر اسے وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا گیا پھر اس کے حصول کو میرے لئے آسان بنا دیا گیا۔ یہ دو کروڑ جیسی رقم جسے میں برسوں تک نہیں کما سکتا تھا۔ مجھے ایسے مل گئی جیسے خوابوں اور قصے کہانیوں میں ملتی ہے۔"

وہ وکی کو گاڑی میں بٹھا کر اسے ڈرائیو کرتا ہوا تیزی سے جانے لگا۔ کار اس وسیع و عریض میدان سے نکل کر ایک شاہراہ پر پہنچ رہی تھی۔ وہ عورت تیز رفتاری سے ڈرائیو کرنے کی عادی نہیں تھی اس لئے مناسب رفتار سے جارہی تھی۔ واجد اس سے بہت فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔

یہ تو اس نے دیکھا تھا کہ وہ کار والی عورت' شیبا کی کوٹھی کے احاطے میں گئی تھی۔ شیبا اپنی کوٹھی میں تنہا رہتی تھی۔ لہٰذا وہ شیبا سے ہی ملنے گئی تھی اور اسی کار والی نے وکی کو ابھی اس کے حوالے کیا تھا۔ اس سے دو کروڑ وصول کئے تھے۔ کیا وہ پھر شیبا کے پاس

جائے گی اور اس کے دو کروڑ روپے اسے واپس کردے گی؟ اگر ایسا ہے تو پھر شیبا نے وکی کو اس عورت کے ذریعے اغوا کرایا تھا۔

واجد کو یقین کی حد تک شبہ ہو رہا تھا کہ شیبا نے وکی کو اغوا کرایا ہے۔ وہ اس پہلو سے غور کرنے لگا تو ایک ایک بات سمجھ میں آنے لگی کہ وکی کو اغوا کرا کے اس پر دباؤ ڈالا گیا تھا۔ دو کروڑ کا مطالبہ کیا گیا تاکہ وہ مجبور ہو کر اتنی بڑی رقم شیبا سے حاصل کرے۔

اس دوران میں شیبا بڑی شدت سے اپنی محبتیں ظاہر کرتی رہی۔ اسے براہ راست شادی کرنے کو نہیں کہا لیکن کئی لاکھ ڈالرز کا کریڈٹ کارڈ قبول کرنے کی شرط پیش کی تاکہ وہ اس کی مہربانیوں کے بوجھ تلے دبا رہے اور اس سے شادی کرنے پر خود ہی مجبور ہوجائے اور وہ اسے شیبا کا خلوص' محبت اور فراخ دلی سمجھ کر اس طرف مائل ہورہا تھا۔

موبائل فون سے بزر کی آواز سنائی دی۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ شیبا کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو واجد! کیا ہمارا بیٹا مل گیا؟"

وہ وکی کو ہمارا بیٹا کہہ کر اسے غیر شعوری طور پر متاثر کرتی آرہی تھی۔ وہ بولا "ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔ میرا بیٹا مجھے مل گیا ہے۔"

"اتنی دیر کیوں ہوگئی؟ میں کب سے تمہارے فون کا انتظار کررہی ہوں۔"

واجد آگے جانے والی کار کو دیکھ رہا تھا۔ ایک چوراہے پر کئی گاڑیاں ان کے درمیان آگئی تھیں۔ وہ کار بہت آگے نکلتی جارہی تھی اور اس کے آگے آجانے والی گاڑیاں رک رک کر چل رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ "میں ٹریفک کے ہجوم میں ہوں۔ تھوڑی دیر بعد بات کروں گا۔"

اس نے فون بند کیا اور گاڑیوں کے درمیان سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس وقت تک وہ کار بہت دور جاکر ایک سگنل کراس کررہی تھی۔ واجد جب تک وہاں پہنچا' سگنل کی سرخ لائٹ آن ہوچکی تھی۔ اسے کئی گاڑیوں کے پیچھے رکنا پڑا۔ اگر ان گاڑیوں سے آگے ہوتا تو سگنل کے خلاف آگے بڑھتا چلا جاتا۔ وہ کار بہت آگے جاچکی تھی۔ آگے تین اطراف میں راستے تقسیم ہوگئے تھے۔ وہ ایک جگہ رک کر سوچ میں پڑ گیا کہ کدھر جائے؟

آخر ایک راستے پر چل پڑا۔ دو چار کلومیٹر جانے کے باوجود وہ کار نظر نہیں آئی۔ اب اسے ڈھونڈا نہیں جاسکتا تھا۔ آئندہ کبھی اتفاق سے نظر آجاتی تو یہ ثابت کرنا دشوار

ہوتا کہ اسی کار میں وکی کو اغوا کیا گیا تھا۔ اس نے ایک جگہ گاڑی روک کر سوچا' اس کار کے سلسلے میں شیبا سے کچھ اگلوانا چاہئے۔

لیکن کس طرح حقیقت اگلوائی جائے؟ کیا وہ تسلیم کرے گی کہ وہ کار اس کی کوٹھی میں آئی تھی اور اس کار والی سے اس کا تعلق ہے؟

اس نے اچھی طرح سوچ کر شیبا سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "ہیلو شیبا! مجھے عورت کی چال بازی کو سمجھنے میں دیر ہو گئی اس لئے دیر سے فون کر رہا ہوں۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا وکی کو واپس لانے والی پھر کوئی چالبازی دکھا رہی ہے؟"

"نہیں' اب میں دکھا رہا ہوں۔ اس کی کار کا نمبر ڈی ایچ 2000 ہے۔ میں اس کار کا تعاقب کرتا ہوا اس کی کوٹھی تک پہنچ گیا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" اس کی آواز اور لہجے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ "کیا تم اب تک اس کا تعاقب کر رہے تھے؟ کہاں ہے اس کی کوٹھی؟ تم ابھی وہاں ہو؟"

"اتنے سارے سوالات ایک ساتھ نہ کرو۔ پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔ وہی ڈی ایچ 2000 نمبر والی کار آج صبح اس وقت تمہاری کوٹھی میں آئی تھی۔ جب میں تم سے رخصت ہو کر جا رہا تھا۔ تم اس کار والی یا والے کو جانتی ہو؟"

دوسری طرف ذرا دیر خاموشی رہی۔ اس نے پوچھا۔ "خاموش کیوں ہو؟"

وہ بولی۔ "میں اس کار کا نمبر معلوم کر رہی ہوں' جو تمہارے جانے کے بعد میری کوٹھی کے پورچ میں آئی تھی۔ ذرا انتظار کرو۔ میں چوکیدار اور دوسرے ملازموں سے پوچھتی ہوں۔"

واجد نے دل میں کہا۔ "بہت چالاک ہے۔ اس طرح سوچنے اور باتیں بنانے کی مہلت حاصل کر رہی ہے۔ دیکھتا ہوں' وہ کس طرح بات بنائے گی۔"

وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔ "ہیلو واجد! کسی ملازم نے اس کار کا نمبر نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت میں اپنے بیڈ روم میں تھی۔ ملازم نے بتایا کہ میرا ایک کزن نعیم الدین آیا ہے۔ میں نے اس سے ڈرائنگ روم میں ملاقات کی تھی۔ وہ دوپہر کی فلائٹ سے لندن گیا ہے۔ اسے پانچ ہزار پاؤنڈز کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے اس کی ضرورت پوری کر دی۔"

"تو پھر تمہارا کزن میرے بیٹے کو اغوا کرنے کا ذمے دار ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔ وہ دوپہر کی فلائٹ سے لندن جا چکا ہے اور جس گاڑی کا نمبر

تم بتا رہے ہو اس گاڑی والی نے ابھی وکی کو تمہارے حوالے کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے' تمہارا کزن جا چکا ہے مگر اس کی کار کسی عورت نے میرے بیٹے کو مجھ تک پہنچانے کے لئے استعمال کی ہے۔"

"واجد! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میرے کزن کے پاس اس نمبر کی کار نہیں ہے' جو نمبر تم نے کسی کی کار کے پڑھے ہیں۔"

"تم کیسے جانتی کہ تمہارے کزن کی کار کے وہ نمبر نہیں ہیں جبکہ تم ابھی ملازموں سے کار کے نمبر پوچھ رہی تھیں؟"

"اوہ واجد! تم پھر میرے متعلق غلط رائے قائم کر رہے ہو۔ میں نے یہ سوچ کر ملازموں سے پوچھا ہے کہ شاید میرا کزن کسی دوسرے کی گاڑی میں آیا ہو مگر ملازم کہہ رہے ہیں کہ وہ کسی کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ لہٰذا اپنی کار میں آیا تھا اور اس کی کار کا نمبر ڈی ایچ 2000 نہیں ہے اور اس نمبر کی کار میری کوٹھی میں نہیں آئی تھی۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔"

"یقین نہ دلاؤ۔ میں ابھی عینک خریدنے جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر میری نظر ٹیسٹ کرے گا۔ میری نظر کمزور ہوئی تو مجھے تمہاری بات کا یقین آ جائے گا۔"

"پلیز ابھی میرے پاس آؤ اور مجھے اس کوٹھی میں لے چلو' جہاں تم نے اس کار کو جاتے دیکھا ہے۔"

"میں نے کہا نا؟ آنکھوں کے کسی ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔ تم سے آج رات کسی وقت ملاقات کروں گا۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ دوسری طرف شیبا نے ہیلو ہیلو کہا پھر فون بند کر کے اپنی آنٹی کو گھور کر دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت اپنے آفس میں تھی۔ اس کی آنٹی وہ دو کروڑ روپے واپس دینے وہاں آئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "بیٹی! مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"وہ آپ کی کار کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ آپ جانتی ہیں؟"

"جانتی ہوں۔ عقب نما آئینے میں اسے دیکھ رہی تھی۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ میرے پیچھے نہیں ہے۔ تب میں راستہ بدل کر یہاں آئی ہوں۔"

"وہ مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے کہ اس نے آپ کو کسی کوٹھی میں جاتے دیکھا ہے

جبکہ آپ سیدھی یہاں آفس میں آئی ہیں۔"

"تو پھر اس سے کہو کہ وہ تمہیں اس کوٹھی میں لے جائے' جہاں اس نے مجھے دیکھا ہے۔"

"ابھی میں نے یہی کہا تھا مگر اس نے بات بنا کر فون بند کر دیا ہے۔ میں اس بات پر اڑ جاؤں گی کہ وہ مجھے آپ کی کوٹھی میں لے چلے اور وہ آپ تک مجھے نہیں پہنچا سکے گا لیکن آپ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ آپ کو صبح میرے پاس نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"میں مجبوری بتا چکی ہوں۔ میرا آنا ضروری تھا۔ فکر کیوں کرتی ہو؟ انکار کرتی رہو کہ اس نمبر کی کار تمہاری کوٹھی میں نہیں آئی تھی اگر آئی تھی تو وہ تمہیں اس کوٹھی میں لے چلے اور اپنا شبہ دور کرے اور وہ میری کوٹھی نہیں جانتا ہے۔"

"آپ ابھی وہ کار لے جائیں۔ اسے اپنے گیراج میں بند کریں اس کی نمبر پلیٹ اتار دیں۔ کل یورپ جانے سے پہلے مجھے اپنی کوٹھی اور کار کی چابی دے جائیں۔ وہ آئندہ بھی اس کار کو نہیں دیکھ سکے گا۔"

وہ آنٹی اس سے دو لاکھ روپے لے کر چلی گئی۔ شیبا سوچنے لگی۔ بات کچھ بگڑ گئی ہے مگر بنائی جا سکتی ہے۔ واجد کو جھٹلا سکتی ہے کہ جس طرح وہ کار والی کی کوٹھی تک پہنچنے کی بات غلط کر رہا ہے اسی طرح یہ جھوٹ کہہ رہا ہے کہ اس نے ڈی ایچ 2000 نمبر کی کار اس کی کوٹھی میں جاتے دیکھا تھا۔

بہرحال وہ اس کی دیوانی تھی۔ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے والی تھی اگر اتنا کچھ کرنے کے باوجود اس سے بدظن ہوتا' تو وہ پھر بیٹے کو اس کی کمزوری بنا کر اسے اپنی محبت کے عذاب میں مبتلا کر سکتی تھی۔

اس نے ایک گھنٹے بعد اسے فون کیا۔ رابطہ نہیں ہوا' اس نے موبائل بند رکھا تھا۔ اس نے وکی کے نانا سے فون پر پوچھا۔ "کیا وکی واپس آ گیا ہے؟"

اس کے نانا نے کہا۔ "واجد نے ایک گھنٹا پہلے فون کیا تھا۔ وکی کے ملنے کی خوش خبری سنائی تھی۔ بیٹی! ہم تمام عمر تمہارے احسان مند رہیں گے۔ تمہاری مہربانی سے ہمارا نواسا ہمیں واپس مل رہا ہے۔"

"کیا یہاں واجد ہے؟ پلیز مجھ سے بات کرائیں۔"

"وہ ابھی وکی کو لے کر نہیں آیا ہے۔ کہہ رہا ہے۔ کل رات تک آئے گا۔ بیٹی! ہم نواسے سے ملنے کے لئے تڑپ رہے ہیں اور وہ پتا نہیں اسے کہاں لے گیا ہے۔ وہ تمہیں فون کرے تو اس سے پوچھو کہ وہ وکی کو ہمارے پاس لانے کے بجائے کہاں لے گیا ہے؟"

"آپ کا کیا خیال ہے' وہ بیٹے کو کہاں لے جا سکتا ہے؟"

"یہاں اس کا ایک دوست زبیر احمد ہے۔ واجد کبھی کبھی اس کے گھر میں راتیں گزارتا ہے۔ اس سے بڑی دوستی ہے۔ وہ اس کے گھر گیا ہو گا یا پھر اپنے کاٹیج میں ہو گا۔"

"پلیز زبیر احمد کا پتا اور فون نمبر بتائیں۔"

"ہمیں پتا معلوم ہوتا تو نواسے سے ملنے ابھی وہاں چلے جاتے۔ ہمیں فون نمبر بھی معلوم نہیں ہے۔"

شیبا نے فون بند کر دیا۔ جھنجلا کر زیر لب بڑبڑانے لگی۔ "چالاکی دکھا رہا ہے۔ بیٹے کو کہیں چھپانے لے گیا ہے۔ اسے اندیشہ ہے کہ وکی کو دوبارہ اغوا کرایا جا سکتا ہے۔ کیا میں پاگل کی بچی ہوں کہ پھنسنے کے لئے دوبارہ وہی واردات کراؤں گی؟ نہیں' وہ میری بچی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے گا تو وکی کو حادثہ پیش آئے گا۔ وہ بیٹے کو اٹھائے ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال دوڑتا پھرے گا۔ میں وکی کو مرنے نہیں دوں گی' اس کے ذریعے مسائل پیدا کرتی رہوں گی۔ وہ دو کروڑ کا قرض دار ہے۔ اتنی بھاری رقم کبھی ادا نہیں کر سکے گا۔ مجھے ساری زندگی محبتیں دے کر قرض چکاتا رہے گا۔"

☆------☆------☆

وہ آمنہ کے پاس آ گیا۔ آمنہ اپنے ننھیال میں رہتی تھی۔ واجد کو دیکھتے ہی خوشی سے کھل اٹھی۔ اس نے وکی کو گود میں لے کر چومتے ہوئے کہا۔ "اچانک کیسے آ گئے؟ اطلاع تو دی ہوتی۔ آیئے بیٹھئے۔ رات کے تین بجے ہیں اور ہمارا بیٹا ابھی تک جاگ رہا ہے۔"

آمنہ نے بھی بے اختیار' بڑی اپنائیت سے وکی کو "ہمارا بیٹا" کہا۔ واجد نے اسے بڑی چاہت سے دیکھتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔ "اپنوں کی اپنائیت میں جو بات ہوتی ہے' وہ غیروں میں نہیں ہوتی۔ میں شروع سے یہ سمجھتا آ رہا ہوں کہ وکی کو آمنہ سے بھرپور ممتا ملے گی اور تحفظ حاصل رہے گا۔"

وہ بولی۔ "نانی جان اور نانا جان سو رہے ہیں۔ میں انہیں جگاتی ہوں۔"

"ابھی نہیں۔ انہیں سونے دو۔ میں تم سے کچھ کہنے آیا ہوں۔ اسی تنہائی میں ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے شرماتے ہوئے سر پر آنچل رکھا۔ ایک مرد تنہائی میں باتیں کرنا چاہے تو جوان لڑکی بہت کچھ سوچ کر شرمانے لگتی ہے۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں کھانا تیار کرتی ہوں۔ پہلے کچھ کھالیں۔ چائے پی لیں۔ آپ تھکے ہوئے ہیں۔"

"میں کھانا بعد میں کھاؤں گا۔ یہاں بیٹھو اور میری باتیں سنو۔"

وہ سر جھکا کر وکی کو ساتھ لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے صوفے پر لٹا کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھا پھر اس کا سر سہلانے لگی۔ واجد نے کہا۔ "تم اسے بہت چاہتی ہو۔ پتا ہے اسے اغوا کیا گیا تھا۔"

آمنہ کی سانس جیسے اوپر کی اوپر رہ گئی۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "ہائے اللہ! یہ کب ہوا؟ کس نے اسے کڈنیپ کیا تھا؟ کیا دشمنی تھی؟"

"ایک عورت ہے۔ وہ بڑی محبت سے دشمنی کر رہی ہے۔ میرے پیچھے پاگل ہے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ واقعی پاگل ہے.........."

وہ اسے شیبا کے بارے میں تفصیل سے تمام رُوداد سنانے لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر واجد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی رُوداد سن رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ بے خیالی میں وکی پر اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے وہ اس کے لئے ڈھال بن رہی ہو۔ اس نے بڑی حیرانی اور پریشانی سے کہا۔ "وہ عورت ہے یا چڑیل؟ آپ سے محبت کر رہی ہے یا دشمنی؟ ایک معصوم بچے کو اغوا کیا۔ صرف اس لئے کہ آپ پر دباؤ ڈال سکے۔ آپ کو اپنی طرف جھکا سکے۔ آپ کہتے ہیں' وہ آپ کو دیوانوں کی طرح چاہتی ہے۔ دیوانوں کی طرح نہیں' پاگلوں کی طرح آپ کو توڑ پھوڑ دینا چاہتی ہے۔"

"میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں' وہ رئیس زادی ایب نارمل ہے۔ اپنی ضد پوری کرنے کے لئے وکی کو نقصان پہنچا سکتی ہے اسی لئے میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا ہے۔ میں اسے دن رات اپنے ساتھ رکھوں گی۔ آپ اسے چھوڑ کر جائیں گے نا؟"

"میرا کوئی نہیں ہے۔ خدا کے بعد تم پر ہی بھروسا کرتا ہوں۔ یہ تمہارے پاس رہے

گا تو میں بے فکری اور اطمینان کے ساتھ شیبا سے نمٹتا رہوں گا۔"

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے کہ آپ مجھ پر بھروسا کرتے ہیں۔ میں آپ کے اعتماد سے بھی زیادہ وکی کی حفاظت کروں گی۔ کبھی اس پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

"آمنہ! وہ ایک بلا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وکی کو میری کمزوری بنانے کے لئے یہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات آ سکتی ہے کہ میں نے بیٹے کو تمہاری پناہ میں رکھا ہے۔"

"یہاں کی فکر نہ کرو۔ کبھی یہاں آئے گی تو میں اسے دن میں تارے دکھاؤں گی۔"

"میں تمہیں پچھلے آٹھ برسوں سے جانتا ہوں۔ تم اسکول لائف سے مستقل مزاج ہو اور مضبوط قوت ارادی کی مالک ہو۔ تم میں شریک حیات بننے کی اور بچوں کو ممتا دینے کی خوبیاں ہیں۔ میں یہاں سے پوری طرح مطمئن ہو کر جاؤں گا۔"

"آپ کو یہاں کچھ روز رہنا چاہئے۔ شیبا سے جتنا عرصہ دور رہیں گے' اتنا ہی بہتر ہو گا۔ وہ آپ کو تلاش کرتی رہے گی اور جھنجلاتی رہے گی پھر تھک ہار کر صبر کرلے گی۔"

"وہ صبر کرنے والی عورت نہیں ہے۔ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی پھر سب سے بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ میں دو کروڑ کا مقروض بن گیا ہوں۔"

"کیسے دو کروڑ؟ کیسا قرض؟ اس کا فراڈ کھل گیا ہے۔"

"نہیں کھلا ہے۔ میں یہ ثابت نہیں کر سکوں گا کہ میں نے کڈنیپ کرنے والی کی کار کو شیبا کی کوٹھی میں جاتے دیکھا تھا پھر مجھ سے غلطی ہو گئی ہے میں نے اس سے کہا کہ میں اس کار والی کی کوٹھی تک پہنچ گیا ہوں جبکہ میں اس اجنبی عورت کو نہیں جانتا اور نہ ہی میں نے اس کی کوٹھی دیکھی ہے۔"

"آپ ثابت نہیں کر سکیں گے لیکن یہ سچ ہے کہ آپ نے اس کار کو شیبا کے گھر جاتے دیکھا ہے۔"

"اب تو میرے دماغ میں دہرے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ میں نے اس نمبر کی کار وہاں دیکھی تھی یا نہیں؟ وہ نظر کا دھوکا تو نہیں تھا؟ ایک تو میں اس پہلو سے الجھ رہا ہوں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں شیبا کو اس عورت کی کوٹھی تک نہیں پہنچا سکوں گا۔ جھوٹا پڑ جاؤں گا۔ میرے جھوٹ کا مطلب ہو گا کہ وکی کے اغوا سے شیبا کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس نے محبت اور فراخ دلی سے مجھے دو کروڑ روپے دیئے ہیں۔ اب مجھے اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کرنی ہے۔ میں اپنا سب کچھ بیچ کر بھی قرض ادا نہیں کر سکوں گا۔ وہ رقم کے بدلے میری محبت اور توجہ مانگتی رہے گی۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ آپ وہاں جا کر بری طرح پھنس جائیں گے۔ ابھی نہیں جائیں۔ یہاں کچھ روز رہ کر موجودہ حالات پر اچھی طرح غور کریں۔ اس مشکل سے نکلنے کی تدبیر کریں پھر وہاں جائیں۔"

آمنہ کے بزرگ نیند سے بیدار ہو گئے اور وہاں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ واجد نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے دعائیں دیں اور خوشی کا اظہار کیا۔ وکی سو گیا تھا۔ آمنہ اسے گود میں اٹھا کر بولی۔ "میں اسے لٹا کر کھانا لا رہی ہوں۔"

وہ وکی کو اٹھا کر چلی گئی۔ واجد ان بزرگوں سے باتیں کرنے لگا۔ باتوں کے دوران میں اس کا ذہن شیبا کی طرف اٹکا ہوا تھا۔ اس کے سامنے یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ وکی کو آمنہ کی پناہ میں چھوڑ کر واپس جائے۔ شیبا سے سامنا کرے اور جیسے بھی ناگوار حالات پیش آتے رہیں۔ ان سے مردانہ وار نمٹتا رہے۔

☆------☆------☆

شیبا کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ وہ ایک جگہ چین سے نہیں رہ پا رہی تھی۔ کہیں بیٹھتے ہی دوسرے لمحے میں یوں اٹھ جاتی تھی جیسے جلتے توے پر بیٹھنے جا رہی تھی۔ ادھر ادھر ٹہلتے وقت یوں لگتا تھا جیسے قدموں تلے کانٹے بچھے ہوئے ہوں۔ لیٹنے جاتی تو لوٹنے لگتی جیسے انگاروں کا بستر ہو۔ واجد اس سے دور جا کر ایک چیلنج بن گیا تھا کہ وہ ہزار جتن کے باوجود اسے حاصل نہیں کر سکے گی۔

وہ بار بار فشریز جا کر اس کی بوٹ کے ملاحوں سے پوچھتی تھی۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہاں سے جواب ملتا تھا کہ واجد صاحب صبح نہیں آئے ہیں تو شام کو آئیں گے۔ شام کو نہیں آئے ہیں تو صبح آئیں گے مگر ضرور آئیں گے۔

اس نے وکی کے نانا اور نانی کے گھر فون کیا۔ پہلے دن وہ بوڑھے بھی پریشان رہے۔ واجد نے انہیں بھی نہیں بتایا تھا کہ وکی کو کہاں لے گیا ہے۔ یہی خیال قائم کیا گیا کہ وہ بیٹے کے ساتھ اپنے دوست زبیر احمد کے گھر میں ہے۔ شیبا نے جھنجلا کر ایک ٹیبل لیمپ کو اٹھا کر آئینے پر دے مارا۔ آئینہ ترخ گیا۔ لیمپ ٹوٹ گیا۔ اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے

اپنے عکس سے پوچھا۔ "کون ہے یہ کتا زبیر احمد؟ کہاں رہتا ہے؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ جو بھی واجد کو مجھ سے دور کرے گا۔ میں اسے مار ڈالوں گی۔"

ملازموں نے کھانے کی میز پر کئی طرح کی ڈشیں لا کر رکھیں۔ پچھلی شام سے بیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب بھی واجد کی صورت دیکھے بغیر کھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ میز پر سے کھانے کی ڈشیں اٹھا کر پھینکنے لگی۔ ملازم سہم کر دور بھاگنے لگے۔ ایک نے سرفراز خان کو فون پر اطلاع دی۔ "بی بی جی بہت غصے میں ہیں۔ کھانے کی چیزیں اٹھا کر پھینک رہی ہیں۔ اپنے بیڈ روم میں چیزوں کو توڑ پھوڑ رہی ہیں۔ آپ جلدی سے آ جائیں۔"

سرفراز خان نے ڈاکٹر زیدی کو فون پر کہا۔ "شیبا پر پھر دورہ پڑا ہے۔ میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔ تم فوراً وہاں چلے آؤ۔"

وہ فون کرنے کے بعد اپنی کار میں بیٹھ کر شیبا کے پاس آیا۔ ڈرائنگ روم میں کچھ چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ڈائننگ روم میں ٹوٹے ہوئے برتن اور کھانے کی چیزیں فرش پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے بیڈ روم میں آ کر دیکھا۔ ایک بیڈ لیمپ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ سنگھار میز کا آئینہ ترخ گیا تھا اور میک اپ کا تمام سامان دور تک بکھرا پڑا تھا۔ وہ بستر پر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔

اس نے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! کیا ہوا؟ میری لاڈلی کو غصہ آ رہا ہے؟ میں نے کہا تھا' مجھے اپنی ہر بات بتایا کرو۔ میں غصہ آنے سے پہلے تمہاری ہر خواہش پوری کر دیا کروں گا۔"

"آپ کچھ نہیں کریں گے۔ میرے لئے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

"کول ڈاؤن مائی بے بی! تم واجد کو چاہتی تھیں' وہ تمہیں مل رہا ہے پھر مسئلہ کیا ہے۔"

"وہ نہیں ملے گا۔ وہ کتا ہے۔ کہتا ہے' میں نے اس کے بیٹے کو کڈنیپ کرایا تھا۔"

"وہ ایسا الزام کیوں دے رہا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔ پلیز آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

"نہیں۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ واجد سنجیدہ اور سمجھ دار ہے۔ اتنا بڑا الزام لگا رہا ہے تو

اس کے پیچھے ضرور کوئی بات ہوگی۔ تم جانتی ہو کہ میں اور تمہارے ڈاکٹر انکل تم پر بھروسا نہیں کرتے ہیں۔ پہلے تم حماقتیں کرتی ہو پھر ہمیں بتاتی ہو۔"

ڈاکٹر زیدی دروازے پر آکر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں حماقتیں نہیں کرتی ہوں۔ آپ لوگ میرے پیار کو میری چاہت کو کیوں نہیں سمجھتے ہیں؟ میں اس کے لئے اپنی ساری دنیا لٹا دینا چاہتی ہوں اور وہ مجھے اپنی چاہت نہیں دے رہا ہے پھر احمق کون ہے؟ وہ ہے یا میں ہوں؟ جو محبت کا جواب محبت سے نہ دے' اسے پاگل کہتے ہیں اور آپ لوگ مجھے ایب نارمل اور نیم پاگل سمجھتے ہیں۔"

"بیٹی! میری ایک بات کا جواب دو۔ وہ تمہیں الزام کیوں دے رہا ہے؟ اپنے باپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو' کیا تم نے اسے دو کروڑ کے بوجھ تلے دبانے' اپنی طرف جھکانے کے لئے اس کے بیٹے کو اغوا نہیں کیا تھا؟"

وہ بولی۔ "دو کروڑ کیا ہوتے ہیں؟ کچھ نہیں۔ میں اس سے زیادہ لٹا سکتی ہوں۔ میں واجد کو پانے کے لئے اغوا کرنا تو کیا' اس کے بیٹے کو جہنم میں بھی پہنچا سکتی ہوں۔"

وہ حیران پریشان ہو کر بولا۔ "او گاڈ! یو آر گوئنگ ٹو بی اے ڈینجرس کرمنل۔"

ڈاکٹر زیدی نے کمرے کے اندر آکر کہا۔ "سرفراز! ہماری بیٹی سے کچھ نہ کہو۔ یہ بہت پریشان ہے۔ ہمیں اس کے مسئلے کو حل کرنا چاہئے۔ اگر واجد ہماری بیٹی کو نظرانداز کر رہا ہے تو ہمیں اس سلسلے میں واجد سے مل کر معاملات طے کرنے چاہئیں۔ اس کا بڑے سے بڑا مطالبہ مان کر اپنی بیٹی کی خوشی پوری کرنی چاہئے۔"

وہ بولی۔ "تھینک یو انکل! آپ بہت اچھے ہیں۔ اس وقت آپ ہی میری ذہنی حالت کو سمجھ سکتے ہیں۔"

"میں جتنا سمجھتا ہوں۔ اس سے زیادہ سمجھنے کے لئے آیا ہوں۔ تم میرے ساتھ ابھی چلو گی۔"

وہ بولی۔ "کہاں؟ آپ کی کوٹھی میں؟ اسی ہال میں جہاں بڑا ٹی وی ہے۔ بڑی سی موم بتی روشن ہوتی ہے۔ میں لو رنگ ہو جاتی ہوں۔ بولتے بولتے سو جاتی ہوں۔ آپ کب تک ایسا سائیکو ڈراما کرتے رہیں گے؟"

"یہ ضروری ہے۔ میں جس قدر مینٹل اسٹڈی کر رہا ہوں' تمہارے صحیح علاج کے قریب پہنچتا جا رہا ہوں۔ تمہارا سائیکو اینالائسس ضروری ہے۔ تم مانتی ہو کہ میرے ٹریٹمنٹ

کے بعد تمہیں ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے اور تم نئی امنگوں اور نئے جذبوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا عزم کرتی ہو۔"

"اب میری زندگی میں کوئی نئی امنگ کوئی نیا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ میرے پاس جذبوں اور محبتوں کا جو سرمایہ ہے' وہ صرف واجد کے لئے ہے۔"

"میں واجد کے حوالے سے ہی سائیکو ٹریٹمنٹ دوں گا۔ اسے پانا چاہتی ہو تو میرے ساتھ چلو۔"

وہ راضی ہو گئی۔ ڈاکٹر انکل کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ سرفراز نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "یار زیدی! میری بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے۔ جاپان سے وفد آیا ہوا ہے۔ ایک بہت بڑی بزنس ڈیلنگ ہونے والی ہے۔"

"کوئی بات نہیں تم جاؤ۔ تمہاری موجودگی ضروری نہیں ہے۔ شیبا کا جو نفسیاتی تجزیہ کروں گا اور اس کے اندر کی جو باتیں اگلواؤں گا۔ اس کی ریکارڈنگ بعد میں تمہیں سنا دوں گا۔"

سرفراز اس کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ شیبا ڈاکٹر زیدی کے ساتھ اس کی کوٹھی میں آئی۔ ڈاکٹر نے اسے بڑے ہال میں اسی ایزی چیئر پر بٹھایا' جہاں وہ نیم دراز ہو کر سامنے ٹی وی اسکرین پر پہلے ڈاکٹر زیدی کو پھر موم بتی کی جلتی ہوئی لو کو دیکھ کر بے اختیار بہت کچھ بولنے لگتی تھی۔

زیدی اپنے ریکارڈنگ روم میں آگیا۔ اس نے ریکارڈنگ مشین میں ایک ٹیپ اسپول لگایا۔ آڈیو اور وڈیو ریکارڈنگ کو چیک کیا پھر ایک بٹن دبا کر بڑے ہال والے ٹی وی کو آن کیا۔ وہاں وہ اسکرین پر شیبا کو نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے مخصوص طریقہ کار سے ٹرانس میں لاتے ہوئے اس کی نظروں میں اور اس کے ذہن میں موم بتی کی لو کو پیوست کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آپ ہی آپ بولنے لگی۔

وہ بول رہی تھی۔ ٹیپ اسپول آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ اس کی ایک ایک بات ریکارڈ ہو رہی تھی۔ وہ اس بار ٹرانس میں آکر جو کہہ رہی تھی' اسے سن کر زیدی حیران اور پریشان ہو رہا تھا۔ وہ بے اختیار اعتراف کر رہی تھی کہ اس کے آفس کی ایک ملازمہ ثمینہ' واجد پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ اس نے ثمینہ کو زہریلی لپ اسٹک دے کر ہمیشہ کے لئے اپنے اور واجد کے درمیان سے ہٹا دیا۔

پھر اس نے روزی آنٹی کو رازدار بنالیا۔ اسے دو لاکھ روپے کا لالچ دے کر واجد کے بیٹے وکی کو اغوا کرایا۔ وکی کی واپسی کے لئے دو کروڑ کا مطالبہ کیا۔ اس کی پلاننگ کے مطابق واجد اتنی بڑی رقم شیبا سے لینے پر مجبور ہوگیا۔ اس کی محبت اور فراخ دلی کا قائل ہوگیا اور اس سے شادی کرنے کے لئے تقریباً راضی ہوگیا۔

شیبا سحرزدہ ہو کر یہ بھی کہہ رہی تھی کہ واجد نے روزی آنٹی کی کار اس کی کوٹھی میں دیکھ لی ہے اور اب شیبا کی محبت اور خلوص پر شبہ کر رہا ہے۔ اپنے بیٹے کو اس سے کہیں دور لے گیا ہے تاکہ وہ واجد پر آئندہ بیٹے کے حوالے سے دباؤ نہ ڈالے۔

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "کیا تمہیں کبھی احساس ہوتا ہے کہ تم یکے بعد دیگرے گھناؤنے جرائم کی مرتکب ہو رہی ہو۔ تم نے ارمان کی ماں کو ہلاک کیا پھر ثمینہ کو زہریلی موت دی۔ وکی کو اغوا کرایا لیکن اب واجد محتاط ہوگیا ہے۔ کسی حد تک سمجھ چکا ہے کہ تم ذہنی مریضہ ہو۔ آئندہ اس کے بیٹے کو نقصان پہنچا سکتی ہو۔"

"میں وکی کو ہلاک نہیں کروں گی لیکن اس کے بیٹے کو مصائب میں مبتلا کر کے باپ کو اپنی طرف جھکنے پر مجبور کرتی رہوں گی۔"

"وہ اپنے بیٹے کو تم سے دور رکھے گا۔ تم اسے ایک باپ کی کمزوری نہیں بنا سکو گی پھر اسے کس طرح اپنی طرف جھکاؤ گی۔"

"میں نے اس پر دو کروڑ کا بوجھ ڈالا ہے۔ اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ میں نے اس کے بیٹے کے اغوا کے سلسلے میں وہ رقم دی تھی۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اسے میں نے اغوا کرایا تھا۔ اس نے بہت بڑی رقم مجھ سے لی ہے۔ میں آئندہ بھی اتنا کچھ دیتی رہوں گی کہ وہ میرا مقروض اور احسان مند رہے گا اور مجھے اپنی محبت اور توجہ دیتا رہے گا۔"

"شیبا! میرا مشورہ ہے' یہ کھیل بند کرو۔ کسی ایسے شخص کو شریکِ حیات بناؤ' جو صرف تمہارا ہو کر رہے اور تمہاری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دے۔"

"واجد میری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دے گا۔ میں صرف ایک بات جانتی ہوں۔ وہ میرے لئے پیدا ہوا ہے اور میں اس کے لئے پیدا ہوئی ہوں۔ میں اس کے لئے جان پر کھیل سکتی ہوں۔ اس نے اگر مجھے پیار میں کچھ نہ دیا تو میں اپنی جان کا نذرانہ ضرور دوں گی۔"

ڈاکٹر زیدی ریکارڈنگ روم میں بیٹھا اس کی باتیں سن کر پریشان ہو رہا تھا۔ وہ ایسی باتیں کر رہی تھی' جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ عشق کی داستانوں میں ایسا ہوتا ہے۔ لیلیٰ نے مجنوں کے لئے' شیریں نے فرہاد کے لئے اور ہیر نے رانجھا کے لئے اپنی اپنی جان دی۔ شیبا بھی واجد کی خاطر جان پر کھیل جانے کا عزم کر چکی تھی اگر وہ ایسا کرتی تو اس کی موت واجد کو بڑی مہنگی پڑنے والی تھی۔

وہ جوش اور محبت کے جنون میں بول رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔ ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ اپنی آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔ تمہیں دو گھنٹے تک گہری نیند سونا چاہئے۔"

ڈاکٹر نے اپنے ٹی وی اسکرین پر اسے دیکھا۔ وہ چپ ہوگئی تھی۔ آرام سے نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر چکی تھی۔ ٹریٹ منٹ کے مطابق وہ آئندہ دو گھنٹے تک سوتی رہے گی۔

وہ آڈیو اور ویڈیو مشینوں کو بند کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "یہ باز نہیں آئے گی۔ عشق میں جنون کی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ سرفراز کی دوستی نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں شیبا کے جرائم پر پردہ ڈالتا رہوں اور اس کا علاج اتنی رازداری سے کرتا رہوں کہ دوسروں کو اس کے ذہنی مریضہ ہونے کا کبھی شبہ نہ ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا' کب تک پردہ ڈالتا رہوں۔ کب تک دوستی نباہتا رہوں؟"

وہ ریکارڈنگ روم کو لاک کر کے اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ وہ شیبا کے معاملے میں الجھا ہوا تھا کہ کیا کرے؟ یہ تسلیم کر چکا تھا کہ وہ ناقابل علاج رہے گی۔ دنیا کا کوئی ڈاکٹر اسے جنونی انداز میں واجد کا مطالبہ کرنے سے باز نہیں رکھ پائے گا۔ اس بار سرفراز خان کی عزت' شہرت اور بلند مرتبہ سب کچھ خاک میں ملنے والا ہے۔

وہ دو گھنٹے بعد نیند سے بیدار ہو کر ڈاکٹر انکل کے پاس آئی۔ ایک صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ "میں اپنے دماغ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ آپ تو جیسے جادو کرتے ہیں۔ میرے اندر سے غصہ نکال کر پُرسکون کر دیتے ہیں۔"

"تمہارے اندر غبار بھرا رہتا ہے۔ یہاں ٹرانس میں آ کر بے اختیار بولتی رہتی ہو تو اندر سے غبار نکلتا رہتا ہے پھر تم ہلکی پھلکی ہو جاتی ہو۔"

"انکل! آپ یہ کبھی نہیں بتاتے کہ میں کیا بولتی رہتی ہوں؟"

"غصے کی حالت میں تمہارے اندر جو کچھ ابلتا رہتا ہے' وہی تمہاری زبان سے چھلکتا

رہتا ہے۔ بیٹی! تم بہت اچھی ہو۔ اپنے سینے میں ایسا محبت بھرا دل رکھتی ہو' جو صرف کسی ایک کے لئے ہوتا ہے۔ پہلے وہ ایک ارمان تھا۔ اس کے بعد تم واجد کو اپنا ایک مطلوب اور محبوب کہہ رہی ہو۔ ایک بار سنجیدگی سے غور کرو۔ کیا واجد کی طلب سے باز نہیں آسکو گی؟"

"اس کی طلب نہ رہی تو پھر میری زندگی میں کیا رہے گا؟ جو دولت ہمارے پاس ہے' وہ واجد کے بغیر کس کام آئے گی؟ جب اس کی جگہ کوئی لے نہیں سکتا ہے تو میں اسے ہی طلب کرتی رہوں گی۔ میری آخری سانس تک وہی میرا مطلوب رہے گا۔"

موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے ہینڈ بیگ سے فون نکال کر اسے آن کیا پھر کان سے لگا کر بولی "ہیلو۔" پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ واجد کی آواز سن کر خوشی سے اچھل پڑی۔ "ہیلو واجد؟ تم ہو؟ تم بول رہے ہو؟ کہاں تھے تم؟ کیوں مجھ سے دور چلے گئے؟ اگر میں نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے ثابت کر دو پھر مجھے سزا دو۔ مجھے سزائے موت دو مگر ایک بار اپنی صورت تو دکھاؤ' یا مجھے اپنے پاس بلاؤ۔ میں ابھی اڑ کر چلی آؤں گی۔"

واجد کی آواز سنائی دی۔ "میں تمہاری بے چینی کو سمجھ رہا ہوں۔ تمہیں اڑ کر کہیں جانا نہیں ہوگا۔ میں تمہاری کوٹھی کے سامنے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"تم۔ تم میری کوٹھی میں ہو؟ مگر باہر کیوں ہو؟ میں ابھی ملازموں سے فون پر کہتی ہوں۔ وہ تمہیں کوٹھی کے اندر کہیں بھی جانے سے نہیں روکیں گے۔ میں ابھی آرہی ہوں۔"

اس نے فوراً ہی ملازموں کو فون پر حکم دیا کہ وہ ابھی کوٹھی سے نکل کر واجد کا استقبال کریں اور اس کی خاطر تواضع کرتے رہیں پھر وہ فون بند کر کے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر خوشی سے جھوم کر ڈاکٹر زیدی کو خدا حافظ کر کے وہاں سے دوڑتی چلی گئی۔

وہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔ "خدا رحم کرے۔ یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ کچھ کر گزرے گی لیکن کن حالات میں کیا کرنے والی ہے' یہ تو وہی جانتی ہے۔ ہمیں بڑی سختی سے اس کی نگرانی کرنی ہوگی۔"

وہ ریسیور اٹھا کر سرفراز خان کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ شیبا اپنی کوٹھی میں پہنچ گئی۔ واجد کو ڈرائنگ روم میں دیکھ کر خوشی سے دوڑتے ہوئے آئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر جذبوں کی شدت سے کانپتے ہوئے بولی۔ "واجد.........

واجد۔ تم آگئے؟ میرے پاس آگئے؟ میں تمہیں چھو رہی ہوں۔ تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "آپ نیچے کیوں بیٹھی ہیں۔ ملازم دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے؟ اوپر آجائیں۔"

"مجھے ملازموں کی اور دنیا والوں کی پروا نہیں ہے۔ میں سب کے سامنے تمہارے قدموں سے لپٹی رہوں گی۔ تم مجھ سے کیوں ناراض ہو؟ مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے تھے؟ میرا قصور بتاؤ پھر سزا دو۔ مجھے موت کی سزا دو........."

واجد اس کے پیار میں ڈوبے ہوئے لہجے سے اور آواز کی کپکپاہٹ سے سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے کس قدر دیوانہ وار چاہتی ہے۔ اس مغرور رئیس زادی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ واجد کے آگے مغرور نہیں تھی اسی لئے آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔ واجد نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر اٹھایا۔ اپنے پاس بٹھا کر اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "تم اتنی محبت سے آنسو پونچھتے رہو گے تو میں زندگی بھر تمہارے آگے روتی رہوں گی۔ اس طرح تمہاری محبت تو ملتی رہے گی۔"

وہ اس کی یہ حالت دیکھ کر الجھ رہا تھا۔ شیبا کی چاہت میں اتنی شدت اور اتنی زیادہ اپنائیت تھی کہ وہ کشمکش میں پڑ گیا تھا' اسے وکی کے اغوا کا الزام دے یا نہ دے؟ وہ ایک کار کے نمبروں کو غلط پڑھ سکتا تھا مگر شیبا کو غلط سمجھنے کے لئے دل و دماغ راضی نہیں ہو رہا تھا۔ یہی خیال حاوی ہو رہا تھا کہ اس طرح جھک کر اور ٹوٹ کر پیار کرنے والی کسی بناوٹ کے بغیر اپنے پیار کی شدت سے متاثر کر رہی ہے۔ یہ ایک بچے کو اغوا کرنے والی اوچھی حرکت نہیں کرے گی۔

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹ کر بولی۔ "وعدہ کرو۔ اب کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ جاؤ گے تو میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے۔"

☆------☆------☆

سات برس پہلے واجد کی بیوی نے وفات پائی تھی۔ اتنے طویل عرصے کے بعد ایک سلگتا ہوا بدن اس کے بدن سے آ لگا تھا۔ اس کی اپنی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔ اس نے اسے سہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری دیوانگی نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں تمہارے پیار کا جواب پیار سے کیسے دوں؟"

"میں تمہیں سمجھاؤں گی۔ تمہاری مشکل آسان کردوں گی۔ بیڈروم میں چلو۔"

"ہم یہاں ٹھیک ہیں۔ میں باتیں کرکے چلا جاؤں گا۔"

"تم نہیں جاؤ گے۔ جاؤ گے تو میں مرجاؤں گی۔ پلیز یہاں سے چلو۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے سے اٹھ گئی۔ ایسے وقت شدت سے دل چاہنے لگا کہ وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر بیڈروم میں لے جائے مگر ابھی وہ اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا اور نہ ہی بازوؤں میں اٹھا کر لے جانے والا رشتہ ابھی قائم ہوا تھا۔

وہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے چند گھنٹے پہلے غصے میں توڑ پھوڑ کی تھی۔ ڈرائنگ روم میں چیزیں بکھر گئی تھیں۔ ملازم وہاں کی صفائی کرچکے تھے۔ اس کے باوجود شیشے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا قالین پر پڑا تھا۔ اس نے واجد کے ساتھ چلتے چلتے اس ٹکڑے پر ایک پاؤں رکھا پھر تکلیف سے کراہتے ہوئے بیٹھ گئی۔ شیشہ چبھا نہیں تھا۔ اس نے جھک کر اس ٹکڑے کو پاؤں کے تلوے میں چبھو دیا۔ واجد نے جھک کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ پاؤں کے تلوے سے شیشے کا ٹکڑا نکال کر کراہ رہی تھی۔ وہاں سے خون بہنے لگا تھا۔ واجد نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ ایک قدم لنگڑا کر چلنے کے بعد رک گئی۔ کراہتے ہوئے بولی۔ "مجھ سے چلا نہیں جارہا ہے۔ مجھے اٹھا کرلے چلو۔ پلیز!"

وہ آنکھوں سے خون بہتا دیکھ رہا تھا۔ اس کی تکلیف کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے دونوں بازوؤں میں اسے اٹھالیا۔ وہ مسرتوں سے مالا مال ہوگئی۔ دو بازوؤں کی بلندی پر وہ دل تک پہنچ گئی تھی۔ دماغ تک پہنچنا رہ گیا تھا۔

☆------☆------☆

سرفراز خان میٹنگ سے فارغ ہوکر ڈاکٹر زیدی کے پاس آیا پھر بولا۔ "میں میٹنگ سے سیدھا یہاں آیا ہوں۔ ایسی کیا بات ہے کہ تم پریشان ہو گئے ہو؟"

"اب تمہیں بھی پریشان ہونا اور شیبا کے متعلق سنجیدگی سے سمجھنا چاہئے کہ وہ گھناؤنے جرائم کی مرتکب ہوتی جارہی ہے۔"

زیدی نے ریکارڈنگ روم میں آکر سرفراز کو اس کی بیٹی کی ریکارڈ کی ہوئی باتیں سنائیں۔ تمام باتیں سننے کے بعد سرفراز نے کہا۔ "مجھ جیسے دولت مند کو بہت خوش حال رہنا چاہئے تھا لیکن یہ بیٹی مجھے دن رات تشویش میں مبتلا رکھتی ہے۔ اب تو پانی سر سے گزرتا دکھائی دے رہا ہے۔"

زیدی نے کہا۔ "واجد واپس آگیا ہے۔ شیبا کی کوٹھی میں ہے۔ ذرا سوچو' وہ شیبا سے کتراتا رہا ہے اسی لئے اپنے بیٹے کو اس سے دور لے گیا تھا۔ اب وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے گا تو وہ کچھ بھی کر گزرے گی۔"

"ہمیں فوراً وہاں جانا چاہئے۔ اگر ان کے درمیان بات بگڑ رہی ہو تو ہم بنا سکتے ہیں۔ ان کی اُلجھن کو سلجھا سکتے ہیں۔"

وہ دونوں اسی وقت شیبا کی کوٹھی کی طرف جانے لگے۔ شیبا نے بات بگڑنے نہیں دی تھی۔ بڑی خوب صورتی سے' بڑے ہی جذباتی انداز میں اپنی بگڑی ہوئی بازی جیتنے کے تمام داؤ پیچ آزما رہی تھی۔ واجد ایک بار پھر اس سے متاثر ہوگیا تھا۔ اس کے پیار کی دیوانگی نے اسے قائل کردیا تھا۔ پھر بیڈروم کی تنہائی ہو تو بازی جیتنے میں دیر نہیں لگتی۔

شیبا نے کروٹ بدل کر واجد کے قریب ہو کر پوچھا۔ "اب تو کوئی اُلجھن نہیں رہی؟ تم نے مجھے اپنا لیا ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے دور نہیں کرسکے گی۔"

شیبا نے ابھی ابھی جذبوں اور محبتوں کی جو سوغات پیش کی تھی' وہ دو کروڑ کے قرض سے بھی زیادہ اہم تھی۔ وہ ساری زندگی اس سوغات کا قرض نہیں چکا سکتا تھا۔

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "تم نے میری اُلجھن دور نہیں کی ہے اور زیادہ اُلجھا دیا ہے میں اپنے بیٹے وکی کے بارے میں یہ فیصلہ کرچکا ہوں کہ وہ میرے ساتھ نہیں رہے گا۔"

"یہ اچھا فیصلہ ہے۔ ہم یورپ یا امریکا میں وکی کی رہائش اور تعلیم کا بندوبست کردیں گے۔"

"نہیں شیبا! وہ آمنہ کے پاس رہے گا۔"

"آمنہ.........؟" وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ابھی دعوے سے کہا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت واجد کو اس سے دور نہیں کرسکے گی لیکن واجد' اپنے بیٹے کے سلسلے میں آمنہ کو ترجیح دے رہا تھا۔ اس کے پیار کو اس سے چھیننے والی پیدا ہوگئی تھی۔

اس کے دماغ میں پھر سے آندھیاں چلنے لگیں پھر اس کی کھوپڑی گھومنے لگی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "آمنہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنے ننھیال میں ہے۔ میں نے وکی کو اس کے حوالے کردیا ہے۔ وہ وہیں رہے گا۔"

وہ یک بارگی پھٹ پڑی۔ چیخ کر بولی۔ "تم مجھے آمنہ سے کم تر بنا رہے ہو۔ وکی

میرے پاس کیوں نہیں رہے گا؟"

"شیبا! اس ایک بات پر جھگڑا نہ کرو۔ وکی کو وہاں رہنے دو۔ میں تمہارے ساتھ رہا کروں گا۔"

"تم وکی سے جا کر ملتے رہو گے تو آمنہ سے بھی ملتے رہو گے۔ میرے حصے کی محبت اسے دیتے رہو گے۔ میں کبھی یہ برداشت نہیں کروں گی کہ تم پر کسی عورت کا سایہ بھی پڑے۔ عورت ہو' مرد ہو' بوڑھا ہو یا بچہ ہو' میں کسی کو اجازت نہیں دوں گی کہ وہ ہماری محبت کو تقسیم کرے۔"

"تمہاری سوچ غلط ہے۔ محبت تقسیم کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ قدرت کا تقاضہ ہے۔ محبت کو جتنا تقسیم کرو' وہ اتنی ہی بڑھتی ہے۔ کبھی کم نہیں ہوتی۔"

"مجھے فلسفہ نہ پڑھاؤ۔ میری چاہت کو سمجھو۔ میں جنون کی حد تک چاہتی ہوں کہ تمہاری محبت اور تمام توجہ صرف میرے لئے ہو۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی تیسرا نہ ہو۔"

"مجھ پر بھروسا کرو۔ میں صرف تمہارا ہی رہوں گا۔"

وہ اس کے ہاتھ کو تھام کر بولی۔ "تم آمنہ کے پاس جاؤ گے۔ کسی پھول کے پاس جاؤ گے تو اسے سونگھنا ضروری نہیں ہوتا۔ اس کی خوشبو خود ہی سانسوں میں آکر سما جاتی ہے۔ تم وکی سے ملنے جاؤ گے۔ آمنہ تمہاری سانسوں میں آکر سماتی رہے گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ وکی وہاں نہیں رہے گا تو تم نہیں جاؤ گے۔ وکی کو لے آؤ۔ ہم شادی کرتے ہی لندن چلے جائیں گے۔ وہیں رہا کریں گے۔"

"تم تو مجھے تمام رشتے داروں اور عزیز و اقارب سے چھڑا دینا چاہتی ہو۔ عقل کی بات کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ میری چاہنے والی میری ایسی ہی دیوانی ہو مگر ایسی تو نہ ہو کہ مجھ سے دنیا ہی چھڑا دے۔"

وہ اٹھ کر باتھ روم میں جانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس کی حالت عجیب تھی۔ وہ کبھی غصہ دکھا رہی تھی۔ کبھی عاجزی سے جھک رہی تھی۔ وہ بولا "مجھے چھوڑو میں شاور لینے جا رہا ہوں۔"

"جاؤ۔ ٹھنڈے پانی سے نہاؤ۔ ٹھنڈے دماغ سے میری چاہت کو سمجھو۔ میں آخری بار کہتی ہوں کہ تم وکی کو یہاں لاؤ گے اور کبھی آمنہ کی طرف نہیں جاؤ گے ورنہ میں اپنی

جان پر کھیل جاؤں گی۔"

وہ باتھ روم کے دروازے پر آکر بولا۔ "جان دینے کی دھمکی نہ دو۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ وکی آمنہ کے پاس رہے گا اور میں کبھی کبھی بیٹے سے ملنے جاؤں گا۔ اگر یہ تمہیں منظور نہیں ہوگا تو پھر تمہارے ساتھ میرا گزارا نہیں ہوگا۔"

اس نے ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازے کو بند کر دیا۔ شیبا کو یوں لگا جیسے وہ دروازہ اس کے منہ پر آکر لگا ہو۔ جیسے منہ پر یہ طمانچہ پڑا ہو کہ۔ "تم جو کر سکتی ہو کر لو۔ میں تو وکی کے بہانے آمنہ سے ملتا رہوں گا۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے الماری کے پاس آئی۔ "تم میری چیز ہو' آمنہ کیسے ہاتھ لگائے گی۔ میں مر جاؤں گی مگر تمہیں اب آمنہ تک پہنچنے نہیں دوں گی۔"

اس نے الماری کو کھولا پھر اس کے اندر کے سیف کو کھولا۔ سیف کے اندر پہلے کی طرح بیش قیمت ہیرے تھے۔ ایک پستول تھا۔ ایک ایسا خنجر تھا جس کے دستے پر چھوٹے چھوٹے ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے۔ وہیں وہ زہر کی شیشی رکھی ہوئی تھی۔

اس نے الماری سے روئی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لیا۔ شیشی کو کھول کر روئی میں زہر کے دو قطرے ٹپکائے۔ روئی بھیگ گئی۔ اس نے شیشی کو بند کر کے ایک طرف رکھے ہوئے واجد کے سفری بیگ کو دیکھا پھر اس شیشی کو لے جا کر اس بیگ کے سامان کے اندر چھپا دیا۔

کمرے میں ایئر کنڈیشنر آن تھا۔ ٹھنڈک سے جلد ہی روئی سوکھ گئی۔ وہ روئی کو اٹھا کر اپنے گریبان کے اندر رکھ کر الماری کو بند کرتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ "محبت ایک سمجھ میں آنے والا جذبہ ہے مگر محبت کی انتہا کو دنیا والے نہیں سمجھتے اسی لئے جتنے نام ور محبت کرنے والے گزرے ہیں' سب نے خودکشی کی ہے۔ تعجب ہے ہم جیسے پیار کرنے والوں کو ایب نارمل کہا جاتا ہے۔"

واجد اپنا لباس وہاں اتار کر دوسرا لباس باتھ روم میں لے گیا تھا۔ وہ اس کے اتارے ہوئے لباس کو اٹھا کر اپنے سینے سے' اپنے چہرے سے لگانے لگی۔ رونے لگی۔

"آہ! محبت میں ایک مرتا ہے تو دوسرا بھی اس کے لئے جان دے دیتا ہے۔ میرے بعد تم بھی مرو گے۔ اپنی خوشی سے نہ سہی' قانون کے پھندے سے لٹک کر مرو گے۔ میں اس اطمینان سے جان دوں گی کہ میرے بعد کوئی عورت تمہاری میت کو بھی ہاتھ لگانے نہیں

آئے گی۔"

واجد نے باتھ روم سے آکر اسے دیکھا پھر کہا۔ "یہ کیا؟ میرے میلے کپڑوں سے لپٹ رہی ہو؟"

اس نے وہ کپڑے اس کے ہاتھوں سے چھین کر پھینکے پھر اسے سینے سے لگا کر کہا۔

"تم پاگل ہو۔ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں' میرے عشق میں پاگل ہو۔ میں تمام عمر تمہارے پیار کی قدر کرتا رہوں گا اور تمہیں اس بات پر راضی کرہی لوں گا کہ وکی آمنہ کے ہی پاس رہا کرے گی۔"

وہ اس سے الگ ہو کر دروازے پر آئی پھر ملازم کو آواز دے کر دو کپ چائے لانے کا حکم دیا۔ واجد نے کہا۔ "ہاں۔ نہانے کے بعد گرما گرم چائے پینا چاہئے۔ تم بھی غسل کرلو۔"

"چائے پینے کے بعد کروں گی۔" پھر دل میں کہا۔ "میرا تو آخری غسل ہوگا۔"

چائے آگئی۔ اسی کے ساتھ ملازم نے اطلاع دی کہ سرفراز اور ڈاکٹر زیدی آئے ہیں۔ واجد نے کہا۔ "ہمیں ڈرائنگ روم میں چلنا چاہئے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں یہاں آنے دو۔"

اس نے ملازم سے کہا۔ "صاحب کو یہاں بھیج دو۔"

ملازم چلا گیا۔ اس نے ایک پیالی اٹھا کر واجد کو دی پھر اپنے لئے پیالی اٹھاتے وقت اس کی نظریں بچا کر روئی کا ٹکڑا پیالی میں ڈال دیا۔ اسے ہونٹوں کے قریب لا کر بولی۔

"محبت کی انتہا شادی اور بچے ہیں۔ عشق کی انتہا فنا ہے۔ یہ زہر عشق کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔"

اس نے ایک گھونٹ پیا۔ سرفراز اور زیدی دروازے پر آگئے۔ باپ نے کہا "سوری شیبا! میں ایک میٹنگ میں مصروف تھا۔ پتا چلا یہاں واجد بھی ہے تو تم دونوں سے فیصلہ کن باتیں کرنے آیا ہوں۔"

شیبا نے دو چار گھونٹ پئے پھر اس کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ وہ چکراتے ہوئے صوفے سے لڑھک کر فرش پر گر پڑی۔ سرفراز زیدی اور واجد تینوں ہی پریشان ہو کر قریب آکر اس پر جھک گئے۔ باپ نے اسے اٹھانا چاہا مگر اسی وقت اس کا دم نکل گیا۔ ایک عذاب تھا۔ وہ گزر گیا۔

☆------☆------☆

زہر دینے کا الزام واجد پر آیا۔ اس کے سفری بیگ سے وہ شیشی برآمد ہوئی تھی۔ اسے گرفتار کرلیا گیا۔ حوالات میں پہنچا دیا گیا۔

سرفراز خان اپنی بیٹی کی تجہیز و تکفین کے بعد اپنے کمرے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر زیدی نے آکر اسے دیکھا پھر اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔ "پولیس کی کارروائی مکمل ہو چکی ہے۔ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ واجد نے تمہاری بیٹی کو زہر دے کر ہلاک کیا ہے۔"

سرفراز نے کہا۔ "ہاں اسی نے ہلاک کیا ہے۔"

"جبکہ ہم دونوں جانتے ہیں۔ شیبا نے خودکشی کی ہے۔"

"فضول بات نہ کہو۔ خودکشی کی وجہ بھی واجد ہے۔ اس نے میری بیٹی کو جنون میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ ایب نارمل رہتی تھی۔"

"کیا ارمان نے بھی اسے ایب نارمل بنا لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسپتال جا کر اس کی ماں کو ہلاک کردے۔"

"گڑے مردے نہ اکھاڑو۔"

"تم بیٹی کی خاطر کتنے مردے دفنا چکے ہو۔ اس نے پہلا قتل کیا۔ ارمان کی ماں کو مار ڈالا۔ تم نے کہا' پردہ ڈالو۔ اس کی آواز کا ٹیپ ضائع کردیا گیا پھر کیا تم اپنی بیٹی کو آئندہ جرم کرنے سے روک پائے تھے۔"

"پلیز زیدی! اب یہ باتیں کیوں اٹھا رہے ہو؟"

"ایک بے گناہ کو سزائے موت سے بچانا ہمارا فرض ہے۔"

وہ غصے سے بولا۔ "تم پولیس والوں کو اور دنیا والوں کو یہ بتانا چاہتے ہو کہ میری بیٹی' ارب پتی سرفراز خان کی بیٹی پاگل تھی۔ اس نے کئی قتل کئے پھر اس نے خود کو بھی مار ڈالا۔ تمہاری اس بکواس کو کون سنے گا؟ کون یقین کرے گا۔ اس کی آواز کے تمام ٹیپ ضائع کئے جا چکے ہیں۔"

"ہم دونوں سب سے بڑے گواہ ہیں۔ میں اس کا ڈاکٹر رہ چکا ہوں۔ تم باپ ہو۔ ہم دونوں کے بیانات کو سچ تسلیم کیا جائے گا۔"

"زیدی! تمام سچ میری بیٹی کے ساتھ دفن ہو چکا ہے۔ وہ واجد' وہ دو ٹکے کا آدمی خود کو کلفام سمجھتا تھا۔ میری بیٹی کو دیوانہ بنا کر اسے ٹھکراتا رہا۔ وہ عزت دار باپ کی بیٹی اپنی

توہین برداشت نہ کر سکی۔ اس نے اپنی جان دے دی۔ واجد میری بیٹی کا قاتل ہے۔ قاتل ہے۔ اس کے سوا میں کوئی دوسری بات نہیں جانتا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"آج تم مجھے گھر سے جانے کو کہہ رہے ہو۔ اب بیٹی نہیں رہی۔ اس جنونی مجرمہ کی حرکتوں پر پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی اس لئے میری بھی ضرورت نہیں رہی۔"

"ہاں۔ یہی سمجھو اور جاؤ یہاں سے۔ واجد کو پھانسی ہوگی تو میری بیٹی کی روح کو سکون حاصل ہوگا۔"

اچانک شیبا کی آواز سنائی دینے لگی۔ سرفراز نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں نے اس پر دو کروڑ کا بوجھ ڈالا ہے۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں نے اس کے بیٹے کو اغوا کرایا تھا۔ اس نے بہت بڑی رقم مجھ سے لی ہے۔ میں آئندہ بھی اتنا کچھ دیتی رہوں گی کہ وہ میرا مقروض اور احسان مند رہے گا۔"

پھر ڈاکٹر زیدی کی آواز سنائی دی۔ "شیبا! میرا مشورہ ہے' یہ کھیل بند کرو۔ کسی ایسے شخص کو شریکِ حیات بناؤ' جو صرف تمہارا ہو کر رہے............"

ایک پولیس افسر ایک ٹیپ ریکارڈر اٹھائے کمرے میں آیا۔ سرفراز خان نے پریشان ہو کر دیکھا۔ اس ریکارڈر سے شیبا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں واجد کو نہیں چھوڑوں گی۔ اس کے لئے جان دے دوں گی۔ اس طرح جان دوں گی کہ میری ہلاکت کا الزام واجد پر آئے گا۔ میں نے ثمینہ کو زہریلی لپ اسٹک سے ہلاک کیا تھا۔ وہی زہر میں پیوں گی۔ واجد کو سزائے موت ہوگی۔ میرے بعد اسے کوئی دوسری نہیں ملے گی۔ وہ مجھے نہ ملا تو کسی کو بھی نہیں ملے گا۔ ہم تو ڈوبیں گے صنم' تم کو بھی لے ڈوبیں گے............"

پولیس افسر نے ٹیپ ریکارڈر کو آف کر کے کہا۔ "یہ آپ کی بیٹی کا بیان ہے۔ ڈاکٹر زیدی نے بتایا ہے کہ آپ شروع سے یہ ٹیپ سن چکے ہیں۔ شیبا نے جتنے قتل کئے ہیں اور اغوا کی واردات کرائی ہے۔ ان سب کا اعتراف کیا ہے۔ اب آپ کیا فرمائیں گے؟"

سرفراز نے سر جھکا لیا۔ زیدی نے کہا۔ "سوری سرفراز! میں نے یہ ٹیپ بچا کر رکھا تھا۔ تمہاری بیٹی مر چکی ہے۔ اس کے پاگل پن کی وجہ سے ایک بے قصور کو پھانسی پر نہیں چڑھنا چاہئے۔"

سرفراز خان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ اسے بیٹی کے جرائم پر پردہ

ڈالنے کی سزا ملنے والی تھی۔ ڈاکٹر زیدی نے قانون کی مدد کی تھی لیکن پردہ وہ بھی ڈالتا رہا تھا۔ اسے سزا کم ملے گی مگر ضرور ملے گی۔

ایک دن واجد نے رہائی پا کر آمنہ سے کہا۔ "عشق سب ہی کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا زہریلا عشق کبھی کسی نے کیا ہو۔"

☆=======ختم شد=======☆

Rs.150/-

ISBN 969-517-061-7